بسم اللہ الرحمن الرحیم

معاشیات

از

حبیب الرحمن ایم اے۔ ایل ایل بی

مددگار پروفیسر معاشیات

کلیہ جامعہ عثمانیہ

۱۳۳۹ف م ۱۹۲۹ع

اعظم اسٹیم پریس [illegible] حیدرآباد دکن

قیمت ۴ روپے

قوموں کی سیاسی ترقی اور پسماندگی یوں تو ہر زمانے میں ان کے معاشی استحکام اور ضعف کے ساتھ وابستہ رہی ہے تاہم سیاسیات اور معاشیات میں جو قریبی تعلق آج کل پیدا ہو گیا ہے وہ شاید اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھا یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ملک کے سیاسی مسائل کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس کے معاشی حالات سے پورے طور پر واقف نہ ہو اور کسی ملک کی معاشی کیفیات اور ان کے رجحانات کا ٹھیک پتا نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ پہلے معاشی اصول و قوانین پر کافی عبور حاصل نہ ہو۔

ہندوستان میں ایسے پڑھے لکھے اور سمجھدار اشخاص بکثرت موجود ہیں جو محض انگریزی زبان سے واقف نہ ہونے کے باعث اصول معاشیات سے قطعاً نابلد ہیں اور اسی وجہ سے اپنے ملک کے معاشی حالات سمجھنے سے بالکل معذور ہیں۔ ایسے اشخاص کی دقت کو رفع کرنا اس کتاب کا [illegible]

مقصد ہے تاکہ وہ بھی اصول معاشیات کی روشنی میں اپنے ملک کی معاشی
پستی اور اس وجہ سے اس کی سیاسی پسماندگی کے اسباب پر غور کر سکیں۔

اگرچہ اس کتاب کی تالیف میں خاص کر جامعہ عثمانیہ کے طلبا کی ضروریات
پیش نظر رہی ہیں تاہم اسے عام اردو داں طبقات کے لیے بھی کارآمد
بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ معاشیات کے ابتدائی اصول آسان اور
عام فہم اردو میں بیان کیے گئے ہیں۔ مابہ الاختلاف مسائل کو ترک کرکے
صرف بنیادی اور مسلمہ مسائل اس طور پر پیش کیے گئے ہیں کہ ایک طرف
تو ان کی پوری پوری توضیح ہو جائے اور دوسری طرف ان کا بیان ضرورت سے
زیادہ طویل نہ ہونے پائے۔

آخر میں ان معاشی اصطلاحات اور ان کے ہم معنی انگریزی الفاظ کی
ایک مکمل فہرست دی گئی ہے جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں۔ دوسری
جامعات کے ایسے طلبہ جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن جنھیں معاشیات
کا مطالعہ انگریزی کتابوں سے کرنا پڑتا ہے اس فہرست کی مدد سے
معاشی مسائل اردو میں زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ طباعت میں چند معمولی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ امید ہے کہ
ناظرین بہ وقت مطالعہ ان کی تصحیح فرمالیں گے۔ فقط

کلیۂ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن

حبیب الرحمن

فہرست مضامین

پہلا باب

مقدمہ

دوسرا باب

صرف دولت

تیسرا باب

پیدائش دولت

چوتھا باب

تقسیم دولت

پانچواں باب

مبادلۂ دولت

چھٹا باب

مبادلۂ دولت کے انتظامات

زر، اعتبار، بنک

ساتواں باب

سرکاری مالیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

پہلا باب - مقدمہ

معاشیات کی توضیح - علوم عمرانی -

جب ہم پہلی مرتبہ کسی مضمون کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو قدرتاً طبیعت یہ چاہتی ہے کہ اولاً ہمیں اس کی نوعیت کا کچھ سرسری اندازہ ہو جائے تفصیلی اصول و قوانین تو ظاہر ہے کہ آگے چل کر بہ تدریج معلوم ہوتے جائیں گے لیکن اس سے قبل ذہن میں خود بخود یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ جس مضمون کا ہم مطالعہ کرنے والے ہیں وہ کن امور سے متعلق ہے اس میں کس قسم کے مباحث ہمارے سامنے پیش ہوں گے اور کائنات کی کس خاص چیز سے ان امور و مباحث کا تعلق ہوگا - جب تک ان ابتدائی سوالات کے متعلق پڑھنے والے کی [illegible] ہو جائے اسے

اپنے مضمون کے ساتھ پوری دلچسپی پیدا نہیں ہوسکتی۔ لھذا یہ مناسب ہے کہ اولاً خود معاشیات کا مفہوم اچھے طور پر واضح کر دیا جائے تاکہ طالب علم کو یہ اندازہ ہوسکے کہ اُسے معاشیات کے مطالعے میں کس قسم کے مباحث سے سابقہ پڑنے والا ہے، دوسرے علوم سے اس کا کیا تعلق ہے اور کن امور میں وہ ان سے مختلف ہے اس کے مطالعہ کی غرض و غایت کیا ہے اور اس سے کس قسم کے عملی فواید حاصل ہونیکا قرینہ ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں اب تک جتنے علوم مرتب ہوئے ہیں وہ دو شعبوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں: ایک شعبے میں وہ علوم داخل ہیں جنکا تعلق خود انسان کی ذات سے ہے مثلاً تاریخ، قانون، سیاسیات، نفسیات، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان نہ ہوتا تو یہ علوم بھی وجود میں نہ آسکتے کیونکہ وہ سراسر انسان ہی کی زندگی سے وابستہ اور اسی کی جد وجہد سے متعلق ہیں۔ دوسرے وہ علوم ہیں جو انسان سے اس طور پر متعلق نہیں ہیں بلکہ انسان کے علاوہ کائنات میں جو دوسری بے شمار چیزیں موجود ہیں ان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ اونکا تعلق ہے۔ مثلاً طبیعیات جسمیں روشنی آواز، حرارت اور برق کے اصول و قوانین بیان کیے جاتے ہیں، نباتیات جسمیں مختلف پودوں کے خصوصیات اور اُن کے نشو و نما کی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے، فلکیات جس کا تعلق مختلف اجسام فلکی کے حالات سے ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کے ان گوناگوں مظاہر کی مخصوص کیفیات انسان کے وجود کی محتاج نہیں۔ خواہ انسان موجود ہو یا نہ ہو

اُن کا عملدر آمد قدرت کے معیّن کردہ قوانین کے مطابق برابر جاری رہنے لگا۔[+] اب معاشیات کے متعلق سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ وہ اُن علوم میں سے ایک علم ہے جو خود انسان کی ذات، اُس کے اعمال اور اُس کی جد و جہد سے بحث کرتے ہیں۔ لیکن یہ آخری علوم بھی دو جداگانہ قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: ایک تو وہ علوم ہیں جو انسان سے بہ حیثیت ایک فردِ واحد کے بحث کرتے ہیں جیسے نفسیات اور عضویات۔ دوسرے وہ علوم ہیں جو کسی ایک شخص کے حالات و اعمال سے نہیں، بلکہ انسانی گروہوں یا جماعتوں کے طرزِ عمل اور ان کے رجحانات سے متعلق ہوتے ہیں جیسے کہ اخلاقیات وغیرہ۔ معاشیات بھی انھی آخری علوم میں سے ایک علم ہے گویا معاشیات ایک علم ہے جو انسانی گروہوں کے حالاتِ زندگی سے بحث کرتا ہے[+] لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی گروہوں کے حالاتِ زندگی سے بحث کرنے والے چند اور بھی علوم موجود ہیں مثلاً اخلاقیات، قانونیات اور سیاسیات لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ معاشیات اِن علوم سے کن امور میں مختلف ہے۔ مشابہت تو اُن میں یہ ہے کہ وہ سب انسانی جماعتوں کے حالات سے بحث کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر ان کو علومِ عمرانی کہا جاتا ہے اور وہ سب ایک ہی وسیع علم یعنی عمرانیات کے مختلف شعبے تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فرق کا تعلق ہے اُسے ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں

ہر شخص جانتا ہے کہ انسان دنیا میں تنہا نہیں رہتا بلکہ دوسرے

انسانوں کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی خاص اور کم و بیش منظم جماعت کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس جماعت کے ساتھ بہ حیثیت مجموعی اور اس کے مختلف افراد کے ساتھ انفرادی طور پر اس کے کچھ خاص تعلقات ہوتے ہیں چنانچہ انہی تعلقات کا جامع مطالعہ علم تمدن یا عمرانیات کا نفس مضمون ہے۔ لیکن یہ تعلقات ایسے گوناگوں اور ان کی نوعیت ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہوتی ہے کہ انھیں بہ غرض سہولت علٰحدہ علٰحدہ شعبوں میں تقسیم کرکے ہر شعبے کے تعلقات کا جداگانہ مطالعہ کیا جاتا اور اسے ایک خاص نام سے موسوم کردیا جاتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے ہر انسانی گروہ میں اُس کے تمدنی اور دماغی ارتقا کے مطابق نیک و بد کے خاص خاص معیار و اصول موجود ہوتے ہیں جو عملی زندگی میں اُس کے افراد کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جس شعبے میں ان معیاروں اور اصولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اُسے اصطلاح میں اخلاقیات کہتے ہیں۔ دوسرے ہر انسانی گروہ اپنے افراد کو خاص خاص قوانین و ضوابط کی پابندی پر مجبور کرتا ہے۔ بعض کاموں کا انھیں حکم دیتا اور بعض سے انہیں منع کرتا ہے۔ جس شعبے میں اس قسم کے قیود اور بندشوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہی قانونیات ہے تیسرے ہر انسانی گروہ کو ایک نہ ایک خاص تنظیم اور حکومت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ حکومت افراد پر اپنا اقتدار قائم رکھتی ہے اور افراد حکومت کی اطاعت کرتے ہیں۔ جس شعبے میں حکومت کے اصول اور

مملکت و رعایا کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ سیاسیات ہے،
چوتھے ہر انسانی گروہ کی جدوجہد کا اکثر و بیشتر حصہ احتیاجات انسانی کے
رفع کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ جس شعبے میں انسان کے ان افعال کا مطالعہ
کیا جاتا ہے جو آمدنی حاصل کرنے اور اس کو خرچ کرنے سے متعلق ہوتے
ہیں وہی معاشیات ہے۔

واضح رہے کہ معاشری تعلقات کے ان مختلف شعبوں کو بعض اوقات
ایک دوسرے سے کلیتاً علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا۔ مثلاً مملکت کی آمدنی و
خرچ کے مسائل بالعموم معاشیات کے عنوان میں شامل کیے جاتے ہیں لیکن
چونکہ محاصل عاید کرنا حکومت کا فرض ہے اس لیے انہیں سیاسیات سے
بھی تعلق ہے۔ لیکن باوجود اس قسم کی مثالوں کے اخلاق، قانون،
سیاست اور معاش انسانی معاشرت کے ان مختلف پہلوؤں کو ایک
دوسرے سے علیحدہ رکھنا نہ صرف ممکن بلکہ مفید اور ضروری ہے۔ ذیل کے
جدول سے مختلف علوم عمرانی کی وسعت کا ایک سرسری خاکہ پیش نظر
ہو جاتا ہے۔

عمرانیات
معاشرتی تعلقات کے عام اصول

معاشیات	سیاسیات	قانون	اخلاقیات
(انسان کی احتیاجات اور ان کی جدوجہد)	(انسان اور مملکت)	(انسان کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا)	(انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے)
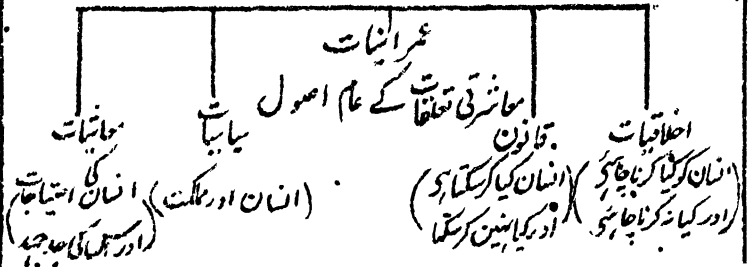
معاشیات کی تعریف

معاشیات کی تعریف۔ قدرت نے انسان کے ساتھ چند احتیاجات وابستہ کردی ہیں جنھیں پورا کیے بغیر وہ ایک منٹ کے لیے چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ بعض احتیاجات تو اسقدر اہم ہیں کہ ان کی طرف سے غافل ہوکر کوئی فرد بشر اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ تہذیب یافتہ اقوام کی احتیاجات سے قطع نظر غذا اور مکان بھی دو ایسی اہم اور اٹل ضروریات ہیں کہ وحشی سے وحشی اقوام بھی دن رات انھیں رفع کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ غرض افراد و اقوام سب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اپنی اپنی احتیاجات پورا کرنے کے وسائل مہیا کریں۔ معاشیات میں انہی احتیاجات اور ان کو پورا کرنے کے ذرائع سے بحث کی جاتی ہے۔

اب یہ بات بدیہی ہے کہ انسان کے لیے اپنی احتیاجات رفع کرنے کا سب سے بڑا اور بنیادی ذریعہ دولت ہے یہی وجہ ہے کہ انسان حصولِ دولت کے لیے اسقدر جانفشانی کرتے ہیں۔ دولت ہی کی بدولت وہ ان احتیاجات کو پورا کرسکتے ہیں جو قدرت نے ہر فرد بشر کے ساتھ لاحق کردی ہیں۔ ماہرانِ معیشت نے آسانی بیان کی غرض سے انسان کے ان تمام کاموں کو جو حصول و استعمال دولت سے متعلق ہوتے ہیں معاشی جدوجہد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ پس معاشیات کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ معاشیات وہ علم ہے جو انسان کی معاشی جدوجہد سے بحث کرتا ہے۔ معاشی جدوجہد سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو دولت سے متعلق

ہوں اور دولت اس لیے طلب کی جاتی ہے کہ وہی انسان کی احتیاجات کو رفع کرنے کا اساسی ذریعہ ہے۔

دولت کا مفہوم۔ معاشیات کی مذکورۂ بالا تعریف سے کسی قدر پتا چلتا ہے کہ اس علم میں دولت کی کس قدر اہمیت ہے۔ اگرچہ دولت خود معاشیات کا موضوع نہیں ہے تاہم موضوع سے اُس کا اس قدر قریبی تعلق ہے کہ اس کی وجہ سے زمانہ سابق میں بعض لوگ معاشیات کی طرف سے سخت بدگمان ہو گئے تھے اور یہ خیال کرنے لگے تھے کہ معاشیات دولت پرستی کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ بہت سے نیک بہت علما نے اس علم کو مخرب اخلاق ثابت کرنے کی کوشش اور لوگوں کو اس کے مطالعہ سے احتراز کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن یہ سب محض غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ جوں جوں ہم معاشیات کے مطالعہ میں ترقی کرتے جائیںگے ہم پر اس غلط فہمی کی حقیقت ظاہر ہوتی جائے گی۔ دولت کی اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم معاشیات کے مباحث کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے جب تک کہ دولت کا صحیح مفہوم ہمارے ذہن نشین نہ ہو جائے۔

مفہوم دولت کے مسئلے پر معاشیین کے درمیان بہت کچھ اختلاف رہا اور اب بھی ہے۔ بہت سی چیزیں جو بعض معاشیین کی رائے میں دولت شمار ہوتی ہیں دوسروں کے نزدیک دائرۂ دولت سے خارج ہیں۔ انہی اختلافات کی وجہ سے دولت کی متعدد تعریفیں ... لیکن ان سب میں جو تعریفیں ہمیں بہترین معلوم ہو ...

اُسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ کینس صاحب نے دولت کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے کہ (دولت میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں **افادہ** اور **استبدال** کی صفتیں موجود ہوں یعنے جو انسان کی کسی نہ کسی ضرورت کو پورا کرسکتی ہوں اور جنکا مبادلہ بھی ممکن ہو) اب ضرورت ہے کہ ہم ان اصطلاحات کی تشریح کی طرف متوجہ ہوں۔

افادہ۔ سب سے پہلے ہم لفظ افادہ کو لیتے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کارخانۂ قدرت میں کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے بلکہ دنیا کا ہر ایک ذرہ کسی نہ کسی کام کو انجام دینے کے لیے موجود ہے اس میں شک نہیں کہ ہمیں عالم ہستی میں سیکڑوں چیزیں بیکار نظر آتی ہیں اور اُن کے وجود کا کوئی مطلب یا فایدہ ہماری سمجھہ میں نہیں آتا لیکن اگر ہم کسی شیے کے فواید یا اس کے کارآمد ہونے سے ناواقف ہیں تو یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ وہ چیز درحقیقت بیکار ہے قدرت کے نزدیک اس کا کچھ نہ کچھ فایدہ ضرور ہے جو ہمارے علم سے مخفی ہے۔ ہماری ناواقفیت کا صرف یہ اثر ہے کہ ہم ایسی چیز کو دولت کے دائرے سے خارج کردیتے ہیں۔ اسی طرح وہ اشیا بھی دائرۂ دولت سے خارج سمجھی جاتی ہیں۔ جن کے افادے کا تو ہمیں علم ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ کیونکہ معاشی اصطلاح میں ان ہی چیزوں پر مشتمل ہے جن کے کارآمد ہونے یا

بالفاظ دیگر کوئی نہ کوئی انسانی ضرورت رفع کرنے کی قابلیت کا انسان کو علم ہو اور وہ اُن چیزوں سے اُن کے مختص کام لینے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ پس معلوم ہوا کہ دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن سے انسان کی احتیاجات پوری ہوتی ہیں اور کسی چیز کی یہ خاصیت کہ وہ کسی انسانی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے اصطلاح معیشت میں لفظ افادہ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ چیز تو خود دولت میں شامل ہوتی ہے اور اس میں جو رفع احتیاج کی قابلیت ہے وہ افادہ کہلاتی ہے مثلاً لباس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ بدن کو گرمی اور سردی کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یا کتاب میں یہ قابلیت ہے کہ وہ ہماری بعض دماغی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ لباس اور کتاب تو دولت میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی یہ قابلیت کہ وہ ایک خاص ضرورت کو رفع کر سکتی ہے" افادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شے بلا افادی کے دائرہ دولت میں شامل نہیں ہو سکتی اور اسی طرح دولت کا کوئی جزو افادے سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ۱/۲/۱

یہاں پر ایک اہم نکتہ قابل غور ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہوا کہ معیاشات میں افادی سے مراد "ضروریات یا خواہشات انسانی کو پورا کرنے کی قابلیت" ہے۔ اب ظاہر ہے کہ انسان کی خواہشات اچھی بھی ہیں اور بری بھی، شراب کی مثال لیجیے۔ کون نہیں جانتا کہ شراب انسان کی صحت کے لیے مضر ہے۔ اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر شراب کی

بہت سی مضرتوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے پیروؤں کو اس کے استعمال سے محترز رہنے کی ہدایت کی اور آج یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے طبیب اور مدبرین سیاست اس حکم امتناعی کی دانشمندی کو محسوس کرتے ہیں۔ اور لوگوں سے شراب کی عادت چھڑانے کے لیے کانفرنسوں کے ذریعے اور قوانین کی مدد سے باقاعدہ کوششیں کرتے ہیں۔ لیکن ایک طرف تو ساری دنیا میں شراب کے خلاف ایک عظیم الشان جنگ جاری ہے۔ اور دوسری طرف معاشیین ہیں کہ شراب جیسی بری شے میں افادہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں سوال یہ ہے کہ ان دو میں سے کون حق بجانب ہے۔ معاشیین؟ یا وہ لوگ جو شراب کو برا کہتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک طبقہ اپنے اپنے نقطۂ خیال سے حق بجانب ہے۔ بلاشبہ طبی تحقیقات و نیز اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے شراب کی مضرتیں پورے طور پر ثابت ہو چکی ہیں اور بہت بڑی حد تک تسلیم بھی کی جا چکی ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ شراب سے ایک ایسی احتیاج رفع ہوتی ہے جسے اکثر اشخاص محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا معاشی نقطۂ نظر سے اس میں افادہ موجود ہے اور اسی لیے دولت میں اس کو شامل کیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ افادے سے مراد کسی چیز کی یہ قابلیت ہے کہ وہ انسان کی کوئی نہ کوئی احتیاج رفع کرتی ہے عام ازیں کہ وہ احتیاج اخلاقی اور طبی نقطۂ نظر سے اچھی ہو یا بری۔

افادے کی قسمیں ۔ افادے کا مفہوم سمجھنے کے بعد ہم اقسام افادہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ افادے کی چار قسمیں ہیں : افادۂ ذاتی ۔ افادۂ شکلی ۔ افادۂ مقامی ۔ افادۂ وقتی ۔ اشیاء سے ضروریات رفع کرنے کی صرف چار صورتیں ہیں ۔ اکثر اشیاء تو ہماری ضروریات اس وجہ سے پورا کر سکتی ہیں کہ وہ چند خاص اجزاء سے مرکب ہیں مثلاً کوئلے میں قدرت نے کچھ ایسی خاصیت ودیعت کی ہے کہ وہ خاص خاص حالتوں میں گرمی پیدا کرتا ہے ۔ یہ افادہ جو کسی شیے میں اس کے اجزاء ترکیبی کی بدولت موجود ہوتا ہے افادۂ ذاتی کہلاتا ہے ۔ لیکن جب تک کوئلہ اپنی اصلی حالت میں کان کے اندر دبا رہے اُس وقت تک وہ ہماری کوئی ضرورت رفع نہیں کر سکتا ۔ ضرورت ہے کہ کان کن اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کریں تاکہ وہ آسانی کے ساتھ کام میں لایا جا سکے ۔ یہ افادہ جو کسی چیز میں اسکی شکل کی بدولت موجود ہوتا ہے، افادہ شکلی کہلاتا ہے ۔ صنعت و حرفت کا بالعموم یہی نتیجہ ہے کہ اُس سے شکلی افادے پیدا ہوتے ہیں ۔ محنت کی بدولت کوئلہ اب ایسی شکل میں آگیا ہے کہ ہم اس کو کام میں لا سکتے ہیں ۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ محض شکل بدل دینا کافی نہیں ہے ۔ ضرورت ہے کہ کوئلہ اُن لوگوں تک پہنچایا جائے جو اُسے استعمال کرنا چاہتے ہیں ۔ کان سے نکال کر کسی اور جگہ پر جہاں وہ مطلوب ہو منتقل کر دینے سے کوئلے میں نیا افادہ پیدا ہو جاتا

سے جو افادہ مقامی کہلاتا ہے۔ یہاں تک کوئلے کی اصلی حالت میں دو طرح کی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ہر تبدیلی کے ساتھ اس میں ایک نیا افادہ پیدا ہوتا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو خود کوئلے میں وہ اجزا موجود ہیں جنکی بدولت وہ ہماری ایک خاص احتیاج رفع کرنے کے قابل ہے۔ دوسرے کان کن نے اس کی قدرتی شکل بدل دی ہے تیسرے وہ اس مقام پر لایا گیا ہے جہاں اس کی طلب موجود ہے۔ لیکن ان تمام مرحلوں کے بعد بھی کوئلے کا افادہ مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ خاص وقتِ ضرورت پر موجود نہ ہو۔ اور یہ افادہ جو کسی چیز میں اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ استعمال کرنے والے کی خاص ضرورت کے وقت رفع احتیاج کے لیے موجود ہے اصطلاحاً افادۂ وقتی کہلاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان چار قسموں کے علاوہ افادے کی کوئی اور قسم ممکن ہی نہیں ہے۔ کائنات کی کسی چیز کو لیجیے ذاتی، شکلی، مقامی، وقتی۔ افادوں کے سوا کوئی پانچواں افادہ اس میں نظر نہیں آئیگا۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز صرف میں آنے کے لیے تیار رہتی ہے تو اس میں افادے کی یہ چاروں قسمیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن خاص خاص چیزوں میں افادے کی کوئی ایک قسم زیادہ اہم ہوتی ہے۔ مثلاً موسم گرما میں برف کا بدیہی افادہ افادۂ وقتی یا زمانی ہے۔ اسی طرح جب چاے جاپان یا سیلون سے امریکہ کے کسی شہر میں لائی جاتی ہے یا

ہندوستان کی خام روئی انگلستان کے شہروں میں پہنچائی جاتی ہے تو اُس میں بہت بڑا مقامی یا مکانی افادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

استبدال۔ کسی شئے میں صرف افادے کا وجود اُس کو دولت شمار کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اُس میں استبدال کی صفت بھی موجود ہونی چاہیے۔ لہٰذا ہم اس اصطلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مبادلے کی قابلیت کے لحاظ سے اشیاء تین قسموں میں منقسم ہوتی ہیں۔ (۱) پہلی قسم میں وہ چیزیں ہیں جنکا کسی دوسری چیز سے مبادلہ کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا۔ سمندر وغیرہ (۲) دوسری قسم اُن چیزوں کی ہے جنکا دوسری چیزوں سے مبادلہ اگرچہ ناممکن نہیں تاہم فضول اور غیر مفید ضرور ہے۔ مثلاً لب دریا پانی۔ (۳) تیسری قسم اُن لاتعداد اشیاء پر مشتمل ہے جنکا مبادلہ نہ صرف ممکن بلکہ ضروری اور مفید بھی ہے۔ مثلاً غلہ۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ۔ تیسری قسم کی چیزوں کی یہ صفت کہ انکا مبادلہ ممکن بھی ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے اصطلاح میں استبدال کہلاتی ہے۔

اشیاء کی مذکورۂ بالا تقسیم چند شرائط پر مبنی ہے جنکا وجود کسی شئے کے استبدال کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ کسی شئے کا ناقابل استبدال ہونا اس کے افادے پر کوئی اثر نہیں ڈالتا تاہم افادہ معدوم ہونے سے استبدال کی قابلیت پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ جب تک

کوئی شئے اغراضِ انسانی کے لیے کارآمد ہو وہ دوسری مفید چیزوں کے معاوضے میں قبول نہیں کی جاسکتی۔ پس معلوم ہوا کہ استبدال کی سب سے پہلی شرط افادہ ہے۔ لیکن محض افادے کا وجود استبدال کے لیے کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان اس افادے سے واقف بھی ہو۔ دنیا کی بے شمار چیزوں کا افادہ ہمارے علم سے مخفی ہے اور اسی لیے ہم انھیں بیکار سمجھکر دوسری مفید چیزوں سے مبادلہ نہیں کرتے۔ تاہم اگر سائینس کی ترقی کی بدولت ہم اس افادے سے واقف ہوجائیں جو قدرت کی طرف سے اُن میں ودیعت کیا گیا ہے تو یقین ہے کہ ہم فوراً اُن کے مبادلے پر آمادہ ہوجائینگے اور اُن میں استبدال کی صفت پیدا ہوجائے گی۔ یہاں تک تو ہم نے استبدال کی صرف دو شرطیں معلوم کی ہیں یعنی افادہ اور علم افادہ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کسی شئے میں استبدال کی صفت پیدا کرنے کے لیے صرف یہ دو شرطیں بھی کافی نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ چاندی سونا جو گہری کانوں میں دبا پڑا ہے ہماری بعض احتیاجات رفع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر اُس میں افادہ بھی ہے اور ہمیں اس افادے کا علم بھی ہے۔ لیکن باوجود اس کے استبدال کی صفت سے وہ محروم ہے کیونکہ وہ ابھی انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ افادہ اور علم افادہ کے علاوہ چیز پر دسترس ہونا بھی استبدال کے لیے ناگزیر ہے۔ استبدال کی

چوتھی اور آخری شرط تعین مقدار ہے۔ بلدہ حیدرآباد میں پانی اسقدر افراط سے موجود ہے کہ ہر شخص بلا معاوضہ جسقدر چاہے پانی لے سکتا ہے سرکار کی جانب سے جا بجا نل نصب کر دیے گیے ہیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی ضروریات رفع کرنے کے لیے دل کھول کر پانی استعمال کرے ظاہر ہے کہ پانی میں افادہ موجود ہے۔ ہم اس کے افادے سے واقف بھی ہیں اور وہ ہماری دسترس سے باہر بھی نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر استبدال کی تینوں شرطیں افادہ، علم افادہ، دسترس انسانی سب پانی میں موجود ہیں لیکن پھر بھی استبدال کی صفت اس میں مفقود ہے۔ کیونکہ حیدرآباد کے لوگ پانی حاصل کرنے کے لیے دوسری مفید چیزیں معاوضے میں نہیں دیتے بلکہ جسقدر پانی چاہتے ہیں سرکاری نلوں سے حاصل کر لیتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی شئے اسقدر کثیر مقدار میں موجود ہو کہ اسے حاصل کرنے کے لئے کسی معاوضے کی ضرورت نہ پڑے تو خواہ اس میں مبادلے کے اور سب شرائط موجود ہوں تاہم لوگ اس کا مبادلہ نہ کرینگے لہذا کسی شئے میں صفت استبدال پیدا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اس کی مقدار معین ہو تاکہ وہ کسی خاص شخص یا اشخاص کی ملک سمجھی جاسکے جنھیں اس کے بدلنے یا نہ بدلنے کا کامل اختیار حاصل رہے۔

دولت کی قسمیں
دولت کی قسمیں۔ مذکورۂ بالا بیان کے مطابق کسی شخص کی دولت میں اس کی وہ چیزیں شامل کی جائیں گی جن میں افادہ و استبدال کی صفتیں موجود ہوں یہی دولت کی معاشی تعریف ہے۔ اور جب کبھی لفظ دولت تنہا استعمال ہو تو اس سے مراد یہی شخصی دولت ہو گی۔ لیکن بعض اوقات دولت کا لفظ اس سے زیادہ وسیع معنی میں

استعمال ہوتا ہے اور اس حالت میں دائرہ دولت کے اندر بہت سی ناقابل انتقال چیزیں بھی شامل کر لی جاتی ہیں۔ اِن وسیع معنی کے لحاظ سے دولت تین قسموں میں منقسم ہے۔ ذاتی، قومی، بین الاقوامی۔ ذاتی دولت میں انسان کے ذاتی صفات وخصائل شامل ہیں جیسے شرافت، ہر دل عزیزی اور اعتبار جو کاروبار میں مدد دیتے ہیں۔ قومی دولت میں وہ چیزیں شامل ہیں جو کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی کل قوم کی ملک ہوتی ہیں۔ ملک کے جغرافیائی خصوصیات جو اس کی زرخیزی، سرسبزی۔ اور آب وہوا پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں جنگلوں کی لکڑی۔ خوشگوار موسم صحت افزا آب وہوا۔ دلکش مناظر عمدہ سوسائٹی۔ روشن خیال حکومت جو معاشی ترقیات کے واسطے لازمی ہیں یہ سب قومی دولت میں شامل ہیں۔ جب کسی ملک کی قومی دولت کا اندازہ کیا جاتا ہے تو علاوہ افراد قوم کی شخصی دولت کے اس قسم کی چیزوں کا بھی محاسبہ کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی دولت کی بہترین مثال وہ ساتوں سمندر ہیں جو بذریعہ بارش وجہازرانی دنیا کی مالی بہبودی کے بہترین معاون ہیں ؎

اصطلاحی معنی کے لحاظ سے بھی دولت کی دو قسمیں کی گئی ہیں مادی اور غیر مادی۔ مادی دولت مفید مادی اشیا اور ان کی ملکیت و استعمال کے حقوق پر مشتمل ہے مثلاً مکان، زمین، لباس، موٹر، مشین یا کسی کمپنی کے حصے۔ غیر مادی دولت میں وہ چیزیں شامل

ہیں جو خود تو غیر مادی ہیں لیکن جن کے ذریعہ سے مادی اشیا حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً کاروباری تعلقات یا کاروبار کی تنظیم۔

نوٹ ۔ واضح ہو کہ غیر مادی شخصی دولت، ذاتی دولت سے بالکل جداگانہ ہے۔ ذاتی دولت انسان کی ذات سے ایسی پیوست ہے کہ اس کا مبادلہ نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے غیر مادی شخصی دولت انسان کی ذات سے باہر ہے اور اس کی خرید و فروخت ممکن ہے۔

دولت کا بیان ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ جتانا ضروری ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ دولت صرف اشیاء کی شکل میں پائی جاتی ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ ذاتی خدمات یا ذاتی خدمات کرانے کے حقوق، یہ بھی دایرۂ دولت میں شامل ہیں۔ بلاشبہہ دنیا میں کثیر التعداد لوگ ایسے ہیں جو بنی نوع انسان کے ضروریات کی چیزیں بنا بنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ لیکن انہی کے ساتھ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو محنت تو ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی محنت کا نتیجہ کسی مادی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ بغیر کوئی مادی شے بنانے کے انسانی احتیاجات کو پورا کرتے ہیں۔ طبیب کو دیکھئے کہ انسان کی کیسی اہم احتیاج کو پورا کرتا ہے۔ لیکن اس کی محنت کا نتیجہ مادی شکل میں نمودار نہیں ہوتا۔ اسی طرح وکیل کی خدمت کا نتیجہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اسے اپنے حواس خمسہ سے محسوس کر سکیں۔ لیکن اہل مقدمات ہیں کہ وکیلوں کو دل کھول کر روپیہ دیتے ہیں۔ یہی حال مدرسین اور

پروفیسروں کا ہے جو ماہ بماہ تنخواہیں پاتے ہیں حالانکہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں بناتے جس کو فروخت کرکے نفع کمایا جاسکے۔ پولیس عدالت اور مالی کے عہدہ دار، سینما اور تھیٹروں کے ایکٹر، سرکس میں کرتب دکھانے والے اور پیشہ ور گانے اور ناچنے والے، یہ سب ہماری احتیاجات رفع کرنے میں شریک ہیں۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ انسانوں کی بیشمار ضرورتیں ایسی ہیں جو مادی اشیاء سے نہیں رفع ہوتیں بلکہ ان کو پورا کرنے کے لیے خدمات کی ضرورت ہے اور چونکہ خدمات میں افادہ اور استبدال دونوں صفتیں موجود ہیں۔ لہذا وہ بھی دولت میں شمار ہوتے ہیں۔

معاشیات کے مطالعے کی غرض و غایت۔ معاشیات کی تعریف اور دولت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اس علم کے مطالعہ کی غرض و غایت معلوم کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ دنیا میں جسقدر علوم موجود ہیں تمام ازیں کہ وہ انسان کی تمدنی زندگی سے متعلق ہوں یا کائنات کی دوسری بے شمار اشیا سے انکا تعلق ہو، ان میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ عملی فائدہ ضرور موجود ہے۔ بعض علوم مثلاً کیمیا، طبیعیات، ریاضی حیاتیات کے عملی فوائد تو بالکل بدیہی ہیں۔ مغربی طب کی موجودہ حیرتناک ترقی کا مدار بہت کچھ کیمیا اور حیاتیات ہی پر ہے۔ انجنیری کے فن میں دنیا نے جو عجیب و غریب ترقی کی ہے، وہ علم ریاضی کے بغیر محال تھی۔ ٹیلیفون، بے تار کی پیام رسانی اور برقی قوت کی

گوناگوں کرشمہ سامانیاں ہمیں علم طبیعیات ہی کی بدولت نظر آتی ہیں غرض صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، ذرائع نقل وحمل ان تمام شعبوں میں آج کل بمقابل سابقہ زمانوں کے جو غیر معمولی چہل پہل نظر آتی ہے وہ سب انسانی معلومات کے اس غیر محدود اور روز افزوں ذخیرے کا نتیجہ ہے جو مختلف علوم کی شکل میں قلمبند کرلیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بعض دوسرے علوم مثلاً تاریخ، قانون، سیاسیات، اخلاقیات یا معاشیات کے فوائد اسقدر بدیہی نہیں ہیں۔ لیکن وہ بھی بلحاظ اپنی اہمیت کے اول الذکر علوم کے فوائد سے کسی طرح کم نہیں ہیں گزشتہ نسلوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا، انسانی جماعتوں کی زندگی کو پرامن بنانا، حفاظت حقوق کا انتظام کرنا، بہتر سے بہتر اخلاقی معیار قائم کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب انہی علوم عمرانی کی بدولت ممکن ہوسکتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ انسان دنیا میں کسی قسم کی مادی یا غیر مادی ترقی کرسکیں ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے وسایل معاش کا کوئی معقول انتظام کرلیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک کھانے کے لیے غذا، پہننے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان نصیب نہ ہو انسان کو کسی قسم کی ترقی کا موقعہ نہیں ملسکتا۔ لھذا انسان کے تمام مشاغل سے مقدم اُس کی وہ جدوجہد ہے جو وہ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی خاطر کرتا ہے۔ معاشیات کو انسانی جماعتوں کی زندگی کے اسی اہم پہلو سے سروکار ہے۔ معاشیات کے نزدیک ہر شخص گویا اسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ اپنی کثیر التعداد

کثیر احتیاجات کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پورا کرنے کے ذرایع مہیا کرے،
پس انسانی جماعتوں کی مادی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال
بنانا معاشیات کے مطالعہ کی اصلی غرض و غایت ہے۔

معاشیات کے مباحث کی تقسیم

معاشیات کے مباحث کی تقسیم۔ معاشیات کے اس مقصد
کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے دولت کی ضرورت ہے کیونکہ دولت
ہی سے انسان کی ہر احتیاج پوری ہوتی ہے۔ کسی قوم میں
دولت کی جسقدر افراط ہوگی اُسی قدر افراد قوم آرام کی زندگی بسر
کرسکیں گے اور اسی مناسبت سے ملک میں دوسری ترقیوں کا امکان
پیدا ہوتا جائیگا۔ اس کے برعکس جس قوم کو افلاس میں زندگی بسر
کرنا پڑتی ہے اس کے افراد کے لیے ترقی کی تمام راہیں بند رہتی ہیں
اور ان کی ساری عمر ایک ادنی درجہ کی زندگی کے ذرایع مہیا کرنے
میں گزر جاتی ہے۔ لھذا ہر قوم کی ترقی کے لیے سب سے پہلے اس بات
کی ضرورت ہے کہ ملک میں کثیر سے کثیر دولت پیدا کرنے کی کوشش
کی جائے تاکہ کثیر سے کثیر باشندگان ملک کی احتیاجات بدرجہ اتم
پوری ہوں اور انھیں خوشحال زندگی بسر کرنیکا موقعہ ملسکے یہی وجہ
ہے کہ معاشیات کے مباحث کا ایک نہایت اہم شعبہ دولت فراہم
کرنے سے متعلق ہے جس کو اصطلاحاً پیدایش دولت کہتے ہیں اس
شعبے کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ کن کن چیزوں کی مدد سے
اور کیونکر انسان دولت پیدا کرتے ہیں اور اس میں ترقی کی کیا کیا

صورتیں ہیں۔

جب مختلف افراد کی متفقہ کوشش سے دولت پیدا ہوجائے تو ضرورت ہے کہ وہ پیدا کرنے والوں کے درمیان تقسیم کردی جائے تاکہ ہر شخص اُس سے اپنی اپنی احتیاج رفع کرسکے۔ اب اگر اس تقسیم میں ہر حصہ دار کی واجبی ضروریات کا خیال نہ رکھا جائے بلکہ کچھ لوگ تو ضرورت سے زیادہ حصہ حاصل کرلیں اور بقیہ شرکاء کو معمولی ضروریات کے لایق بھی حصہ نہ ملے تو ایسی صورت میں پیدائش دولت سے جسقدر معاشی فایدہ حاصل ہونا چاہئے تھا نہ ہوگا۔ پس معاشیات کا دوسرا اہم شعبہ تقسیم دولت سے متعلق ہے۔ جس طرح پیدائش دولت میں یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کن کن لوگوں کی مدد سے دولت پیدا ہوتی ہے اُسی طرح تقسیم دولت میں یہ پتا لگایا جاتا ہے کہ کن اصول کے مطابق پیدا کی ہوئی دولت اِن لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے اور اس سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کے لیے کس طرح اس کی تقسیم ہونی چاہئے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت کے ممالک میں بھی آجکل جو دولت پیدا کی جاتی ہے وہ پیدا کرنے والوں کے مابین براہ راست تقسیم نہیں ہوتی۔ ہندوستانی کاشتکار جو دور افتادہ دیہات میں شب و روز محنت کرکے گیہوں یا روئی یا کوئی اور پیداوار اُگاتے ہیں اُسے خود استعمال نہیں کرتے۔ لنکا شائر کے

کارخانے قسم قسم کے کپڑے بڑی بڑی مقداروں میں اس لیے تیار نہیں کرتے کہ وہ کام کرنے والوں کے مابین تقسیم کر دیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص گو اپنے ہی لیے محنت کرتا ہے تاہم اپنی پیدا کی ہوئی اشیاء سے براہِ راست مستفید نہیں ہوتا۔ کاشتکار یہ چاہتا ہے کہ اُسے اپنے گیہوں یا اپنی روئی کے بدلے میں کچھ جوار یا باجرا، کچھ کھدر، کچھ کمبل، کچھ تمباکو اور اسی طرح کی دوسری ضروریات ملجائیں۔ لنکا شائر کے کارخانہ دار اس بات کے خواہشمند رہتے ہیں کہ انھیں اپنے تیار کردہ کپڑوں کے معاوضہ میں زیادہ سے زیادہ منافعہ حاصل ہو تاکہ وہ اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھا سکیں، بہتر سے بہتر لباس پہن سکیں، بڑی بڑی کوٹھیوں میں آرام سے رہ سکیں، آنے جانے کے لیے متعدد موٹر کار ہوں، سیر و سیاحت کے لیے افراط سے روپیہ ہو، غرض ہر طرح کی راحت و آسایش کے ساتھ زندگی بسر کرنیکا موقعہ مل سکے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر شخص جو کوئی نہ کوئی چیز پیدا کرتا ہے وہ عام طور پر اپنے ذاتی استعمال کے لیے نہیں بلکہ اس لیے پیدا کرتا ہے کہ اس کے عوض اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کرے۔ بالفاظ دیگر اپنی تیار کردہ شے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرے اور جو قیمت وصول ہو اس سے اپنی مطلوبہ اشیا خرید لے۔ معاشیات کے وہ مباحث جو چیزوں کی خرید و فروخت اور ان کی قیمتوں سے متعلق ہیں ایک تیسرے شعبے کے تحت میں بیان کیے جاتے ہیں جو اصطلاح میں مبادلہ دولت کے

نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

پیدائش، تقسیم و مبادلہ جب یہ تینوں مرحلے طے ہو جاتے ہیں تب کہیں دولت سے احتیاج رفع کرنے کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی نجار کو لیجیئے جو کسی کارخانے میں کام کرکے روزی کماتا ہے۔ نجار روزانہ میز، کرسی، پلنگ، الماریاں اور قسم قسم کا چوبی سامان تیار کرتا ہے، بالفاظ دیگر وہ دولت پیدا کرتا ہے۔ اُس کی محنت کے معاوضے میں کارخانہ دار اُسے روزانہ کوئی معینہ اُجرت ادا کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر نجار تقسیم دولت کے اصول کے مطابق اپنی پیدا کردہ دولت کا بالواسطہ طور پر ایک حصہ حاصل کرتا ہے۔ نجار کو اس طور پر جو اجرت ملتی ہے اُس سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق غلہ، کپڑا، تمباکو خریدتا ہے۔ مکان کا کرایہ ادا کرتا ہے اور اسی طرح دوسری ضروریات حاصل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنی اجرت کا ان چیزوں سے مبادلہ کرتا ہے، جب یہ تینوں مدارج گذر جاتے ہیں تو اُس کی احتیاجات رفع ہونے کی نوبت آتی ہے۔ معاشیات کے ان مباحث کے لیے جو رفع احتیاجات کے مسئلے سے متعلق ہیں ایک جداگانہ شعبہ مخصوص کر دیا گیا ہے جسکا اصطلاحی نام صرف دولت ہے۔ اس شعبہ کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کس کس قسم کی احتیاجات لاحق ہوتی ہیں، ان احتیاجات کی کیا کیا خصوصیات ہیں اور ان کی تکمیل کا سلسلہ غیر محسوس طریقہ پر کن کن قوانین کی پیروی کرتا ہے۔

واضح رہے کہ معاشیات میں رفع احتیاجات کی بحث بھی کوئی معمولی بحث نہیں ہے۔ زمانہ حال کے مستند معاشیین تو صرف دولت کو بقیہ تینوں شعبوں سے زیادہ اہم مانتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ دولت خواہ کتنی ہی افراط سے پیدا ہو اور اس کی تقسیم خواہ کیسے ہی اچھے اصول پر ہو اگر وہ ٹھیک طور پر استعمال نہ ہو تو معاشیات کا اصلی مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جو لوگ اپنی آمدنی فضول اور مضر چیزوں پر صرف کرتے اور اپنی زندگی عیش پرستی میں گذارتے ہیں وہ نہ صرف ذاتی طور پر نقصان اٹھاتے اور تباہ ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنی قوم کی ہلاکت و ادبار کا باعث ہوتے ہیں۔ لهذا ضرورت ہے کہ لوگ صرف دولت کے صحیح اصولوں سے بھی اچھی طرح واقفیت حاصل کریں تاکہ قومی زندگی کو خوشحال بنانے کا اہم مقصد کما حقہ پورا ہو سکے۔ اب ہم ان چاروں شعبوں میں سے ہر ایک کی تفصیلی کیفیت بیان کریں گے۔

"دوسرا باب"

Consumption

صرف دولت

Consumption

(ختم)

صرفِ دولت کا مفہوم

صرفِ دولت کا مفہوم۔ دولت سے انسان کی احتیاجات دو طرح پر پوری ہوتی ہیں ایک براہِ راست دوسرے بالواسطہ ان میں سے ہر ایک کی بیسیوں مثالیں روزانہ ہماری نظروں سے گذرتی رہتی ہیں۔ غذا اور مکان ہماری دو نہایت اہم حاجتوں کو براہ راست پورا کرتے ہیں۔ لیکن آٹے کی چکی اور جر ثقیل کی مشین ہماری ان ہی حاجتوں کو بالواسطہ پورا کرتے ہیں۔ اسی طرح کپڑوں سے بدن ڈھانکنے کی ضرورت براہِ راست رفع ہوتی ہے۔ لیکن کپڑا بننے کی مشین اسی ضرورت کو بالواسطہ پورا کرتی ہے۔ غرض جن چیزوں سے انسان فوراً اپنی کوئی احتیاج رفع کرسکتا ہے وہ براہ راست اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اور جن چیزوں سے ان کی موجودہ حالت میں رفع احتیاج کا کام نہیں لیا جاسکتا وہ بالواسطہ ہمارے کام آتی ہیں۔ معاشیات میں جب صرف دولت سے بحث کی جاتی ہے تو اس سے

مراد وہ صرف ہے جس سے انسان کی احتیاجات فوراً براہِ راست پوری ہوتی ہیں۔ جس صرف سے ہماری کوئی احتیاج براہِ راست رفع نہیں ہوتی، البتہ براہِ راست احتیاجات رفع کرنے والی اشیا کے بنانے میں اُس سے مدد ملتی ہے اُسے اصطلاح میں صرفِ دولت نہیں کہتے بلکہ وہ پیدائش دولت کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ پس صرفِ دولت سے مراد ایسی اشیا کا استعمال ہے جن سے ہماری احتیاجات بلاواسطہ رفع ہوتی ہیں۔

احتیاجات کی قسمیں

احتیاجات کی قسمیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر معمولی انسان کی زندگی احتیاجات اور رفع احتیاجات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس پر انسانی جماعتوں کی اکثر و بیشتر جد و جہد کا مدار ہے۔ لیکن یہ احتیاجات بلحاظ اپنی نوعیت کے ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ لہذا ہم ذیل میں اُن کی مختلف قسموں کی کیفیت درج کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ہم اپنی احتیاجات کی طرف سے غافل رہتے ہیں اور اُن کو وقت پر پورا نہیں کرتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس لاپروائی کی حالت میں ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ مختلف احتیاجات سے غفلت کرنے کا نتیجہ بھی مختلف ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ غذا انسان کی سب سے پہلی اور اہم ضرورت ہے۔ جب تک اُسے غذا میسر نہ ہو وہ دنیا کا کوئی اور کام نہیں کرسکتا۔ بلکہ اگر زیادہ مدت تک اس احتیاج کو رفع نہ کیا جائے تو نتیجہ یقینی موت ہے۔ اس سے کم درجے پر لیکن اور

ضروریات سے پہلے بدن کو موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے کی احتیاج
ہے۔ اس سے غفلت کرنے کا نتیجہ بھی بسا اوقات ہلاکت ہی ہوتا ہے
بعض سرد ممالک میں آگ کی احتیاج بھی ایسی ہی اٹل ہے جیسی کہ لباس
اور غذا کی لیکن جوں جوں ہم ان ناگزیر ضروریات سے دور ہٹتے
جاتے ہیں ہمیں ایک نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ وہ یہ کہ ان دوسری
ضروریات کو پورا نہ کرنے کے نتائج ویسے ہی سخت نہیں ہوتے جیسے کہ
غذا و لباس کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک کہ انسان کو
بقدر حیات غذا اور لباس میسر رہیں اس کی زندگی معرض خطر میں نہیں
پڑتی خواہ اس کی دوسری بے شمار احتیاجات کتنی ہی تشنہ رہیں۔
ممکن ہے کہ اچھی قسم کی غذا کافی مقدار میں دستیاب نہ ہونے سے
وہ کمزور رہے اور معاشی جدوجہد میں چستی اور تندہی سے مشغول
نہ ہو سکے تاہم فوری ہلاکت کا اسے کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ جب ہم
ناگزیر ضروریات سے بہت زیادہ دور ہٹ جاتے ہیں تو ہمیں ایسی
احتیاجات نظر آنے لگتی ہیں جن کے پورا نہ ہونے سے انسان کی حیات
یا تندرستی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ بعض احتیاجات ایسی ہوتی
ہیں جنکا پورا کرنا انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مضر اور ترک
کردینا مفید ثابت ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہماری احتیاجات کے یہ چند مدارج ہیں جو مبنی ہیں
ان نتائج پر جو مختلف احتیاجات کو پورا نہ کرنے سے نمودار ہوتے ہیں

انہی مدارج کے لحاظ سے احتیاجات کی اولاً دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک ضروریات، دوسرے تعیشات۔ پھر ضروریات کی تین قسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک ضروریات زندگی، دوسرے ضروریات کارکردگی، تیسرے ضروریات رسمی۔ ضروریات زندگی سے مراد وہ احتیاجات ہیں جن کا پورا کرنا انسان کی بقائے حیات کے لیے لازمی ہے۔ ضروریات کارکردگی میں ایسی احتیاجات شامل ہیں کہ اگر وہ پوری نہ کی جائیں تو کوئی شخص اپنے پیشے کی مہارت اور کارگزاری کو برقرار نہیں رکھ سکتا اور نہ اُس میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے۔ ضروریات رسمی وہ احتیاجات ہیں جو نہ بقائے حیات کے لیے ضروری ہیں اور نہ قیام کارکردگی کے لیے بلکہ جو محض رسم و رواج، عادات و اطوار یا فیشن کی خاطر پوری کی جاتی ہیں۔ تمباکو کا استعمال، خاص قسم کا لباس، شادی بیاہ کے مصارف، ضروریات رسمی کی چند مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان احتیاجات کو پورا نہ کرنے سے انسان کی مہارت یا کارکردگی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ باوجود اس کے یہ چیزیں ضروریات میں اس لیے شمار کی جاتی ہیں کہ لوگ عام طور پر ضروریات کارکردگی کی اس قدر پروا نہیں کرتے جس قدر کہ رسمی احتیاجات کی کرتے ہیں۔ اور اگر ان کی آمدنی دونوں کے لیے ناکافی ہو تو وہ ضروریات کارکردگی کو تو ترک کر دیتے ہیں اور رسمی احتیاجات کو پورا کر لیتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تجزیہ کسی ایک ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص

نہیں ہے بلکہ بڑی سے بڑی ترقی یافتہ اقوام میں بھی ایسی ضروریات کی جکڑ نہایت مضبوط ہوتی ہے۔ ایک معمولی مزدور جب دن بھر محنت کرکے آٹھ دس آنے اجرت کماتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنے تمباکو کی فکر ہوتی ہے۔ اگر وہ تمباکو کے دام بھی غذا پر صرف کرے تو ممکن ہے کہ اس کو غذا زیادہ مقدار میں ملے یا زیادہ قوت بخش غذا میسر ہوسکے لیکن تمباکو کے مقابلہ میں اُسے ان چیزوں کی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ اسی طرح لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنی حیثیت سے زیادہ روپیہ خرچ کردیتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ آیندہ کئی سال تک اپنی ضروریات کارکردگی کو پورا نہیں کرسکینگے۔

احتیاجات کے خصوصیات

احتیاجات کے خصوصیات۔ صرف دولت کا مفہوم اور احتیاجات کی قسمیں معلوم کرنے کے بعد ضروری ہے کہ ہم اپنی احتیاجات کے چند خصوصیات سے بھی واقف ہوجائیں جن پر بعض اہم معاشی قوانین کی بنیاد ہے۔

(۱) پہلی قابل لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ بہ لحاظ شدت انسان کی احتیاجات کے مختلف مدارج ہیں۔ اگر ہم اپنی گوناگوں احتیاجات کو ان کی شدت کے مطابق ترتیب دیں تو اس خصوصیت کو بآسانی محسوس کرسکتے ہیں۔ احتیاجات کی مختلف قسمیں جن کا حال ہم ابھی معلوم کرچکے ہیں اسی خصوصیت پر مبنی ہیں۔

(ب) دوسرے یہ کہ انسان کی احتیاجات غیر منتہی ہیں۔ جوں جوں ہماری موجودہ خواہشات پوری ہوتی جاتی ہیں نئی نئی ضروریات رونما ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ بسا اوقات لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ان کی موجودہ ضروریات کی تکمیل کا انتظام ہو جائے تو پھر انھیں کسی چیز کی حاجت باقی نہیں رہے گی اور وہ نہایت چین و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرینگے لیکن عام تجربہ یہ ہے کہ کوئی معمولی انسان خواہ وہ کتنا ہی دولتمند ہو اب تک کبھی اس حالت پر نہیں پہنچا جبکہ اس کی تمام ضروریات مکمل طور پر پوری ہو گئی ہوں۔ اور اس کو کسی اور شے کی حاجت باقی نہ رہی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ ضروریات رفع ہوتے ہی دوسری نئی نئی خواہشیں پیدا ہو جاتی ہیں، جنھیں پورا کرنے کی فکر فوراً لاحق ہو جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ ہر معمولی انسان کے لیے اس کی زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

(ج) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر منفرد احتیاج بجائے خود مکمل طور پر پوری ہو سکتی ہے۔ جب ہم اپنی کوئی احتیاج رفع کرنے کے لیے کسی چیز کا استعمال شروع کرتے ہیں تو جوں جوں وہ چیز ہمارے استعمال میں آتی ہے، ہماری احتیاج بھی رفتہ رفتہ گھٹتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک حد ایسی آتی ہے۔ جہاں پہنچکر ہماری احتیاج پورے طور پر رفع ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں اُس چیز کی اسی

احتیاج کے لیے ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ مثلاً پانی سے انسان کی متعدد احتیاجات پوری ہوتی ہیں ۔ اولاً پانی پیاس بجھانے کے لیے درکار ہے، پھر کھانا پکانے کے لیے، پھر موںھ ہاتھ صاف کرنے، کپڑے دھونے، نہانے اور چھڑکاؤ کرنے کے لیے مطلوب ہوتا ہے ۔ اگر کسی شخص کو اتنا پانی ملجائے جس سے اس کی تمام متعلقہ احتیاجات تمام و کمال پوری ہوسکیں تو پھر اُسے مزید پانی کی سروست کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی باوجود اس کے اگر اس کو مزید پانی لینے پر مجبور کیا جائے تو اُسے مزید پانی رکھنے کے لیے جو خاص اہتمام کرنا پڑیگا اس کی وجہ سے پانی میں بجائے افادے کے اعدام افادہ کی خاصیت پیدا ہوجائیگی معاشیات کا مشہور قانون جسے اصطلاح میں قانون تقلیل افادہ کہتے ہیں اور جس کی مفصل کیفیت ہم اسی باب میں پیش کرینگے احتیاجات انسانی کی اسی خصوصیت پر مبنی ہے۔

(۵) بمقابل احتیاجات مستقبل کے احتیاجات موجودہ کا اثر زیادہ قوی ہوتا ہے ہر معمولی انسان کو ہمیشہ یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ کسی طرح اپنی فوری احتیاجات کو رفع کرلے ۔ احتیاجات حاضرہ کی خاطر وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے اور سخت سے سخت محنت کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے ۔ لیکن آیندہ احتیاجات کی وجہ سے وہ چنداں متفکر نہیں رہتا ۔ ان احتیاجات کے متعلق وہ بالعموم اسی خیال میں رہتا ہے کہ جب وقت آئیگا دیکھا جائیگا ۔ ابھی سے دردسری کی کوئی ضرورت نہیں ۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی طبیعت کا یہ عام رجحان چند خاص اسباب پر مبنی ہے جو ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔

(ا) پہلا سبب تو یہ ہے کہ احتیاجات حاضرہ کا رفع کرنا بقائے حیات کے لئے ایک ناگزیر شرط ہے کیا کوئی ملاح جس کا جہاز تباہی میں آگیا ہو اور جس کے پاس صرف آٹھ روز کے لائق سامانِ خوراک رہ گیا ہو یہ سوچ سکتا ہے کہ اُسے یہ سامانِ خوراک اس ہفتے میں کھا لینا چاہیے یا ماہ آئندہ کے لیے رکھ چھوڑنا چاہیئے ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ غذا کی موجودہ احتیاج کا پورا کرنا جان بچانے کے لیے ضروری ہے۔ پس کسی آئندہ احتیاج کے مقابلے میں موجودہ احتیاج کا زیادہ اہم نظر آنا کوئی بعید از عقل بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کا وہ حصہ جو فوری ضروریات رفع کرنے کے لیے درکار ہوں پس انداز نہیں کرسکتے۔

(اا) دوسرا سبب یہ ہے کہ مستقبل غیر یقینی ہے۔ جو شخص آئندہ احتیاجات کا اہتمام کرتا ہے وہ نہیں جانتا کہ آیا ان احتیاجات کے لاحق ہونے تک وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ اس غیر یقینی حالت کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو آئندہ کے لئے پس انداز کرسکتے ہیں نہیں کرتے بلکہ اپنی ساری کمائی ضروری اور غیر ضروری احتیاجات حاضرہ کے پیچھے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا طرزِ عمل اجتماع دولت کے لیے سخت مضر ہے :-

(iii) تیسرا سبب یہ ہے کہ انسان کی قوت تخیل ناقص ہے۔ ضروریات حاضرہ تو عملی طور پر محسوس ہوتی ہیں لیکن ضروریات آیندہ کا محض تصور کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک اوسط درجے کی قابلیت کا آدمی نہ آیندہ ضروریات کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور نہ اُن کی خاطر اُس مسرت سے محروم ہونا چاہتا ہے جو موجودہ احتیاجات رفع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

(iv) چوتھا سبب یہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی کمزور ہے اکثر لوگوں میں قوت تخیل اچھی خاصی موجود ہوتی ہے۔ وہ آیندہ پیش آنے والی احتیاجات کو صاف طور پر دیکھتے اور اُن کی اہمیت کو محسوس بھی کرتے ہیں لیکن باوجود اس کے اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ حالیہ ترغیبات کا مقابلہ کریں اور آیندہ احتیاجات کے لیے قبل از قبل انتظام کر رکھیں۔ غرض یہی وہ اسباب ہیں جو متفقہ طور پر ایک اوسط درجے کی قابلیت والے آدمی کو اپنی آمدنی فوراً خرچ کر دینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

احتیاجات کی اس چوتھی خصوصیت کی بنا پر ایک قانون مرتب کیا گیا ہے جو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:۔ "ایک معمولی مُصرف کے نزدیک اشیائے آیندہ کا افادہ اسی قسم کی اشیائے موجودہ کے افادے سے کم ہوتا ہے اور یہ کمی مستقبل کے قرب و بعد کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی ہے" اس بیان میں اشیائے

موجودہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو زمانۂ موجودہ میں صرف ہونے کے لیے میسر ہوں اور اشیائے آیندہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو زمانۂ آیندہ میں استعمال یا صَرف ہونے کے لیے دستیاب ہوں۔

قانون تقلیل افادہ

قانون تقلیل افادہ۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی ضرورتیں بے شمار ہیں اور وہ کبھی مکمل طور پر پوری نہیں ہوسکتیں۔ جوں جوں موجودہ احتیاجات رفع ہوتی ہیں دوسری نئی نئی احتیاجات پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا انواع و اقسام کی اشیائے مطلوبہ کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی ایک چیز کو علٰحدہ کر لیا جائے تو پھر ہم بدیہی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اس کے لیے ہماری خواہش بالکل محدود ہے۔ روزمرہ زندگی میں بیسیوں واقعات ہماری نظر سے گذرتے ہیں جن سے اس واقعے کا ثبوت ملتا ہے۔ جب ہم اپنی کوئی احتیاج رفع کرنے کے لیے کسی چیز کا استعمال شروع کرتے ہیں تو جوں جوں وہ چیز ہمارے استعمال میں آتی ہے، ہماری احتیاج بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہے حتّٰی کہ ایک حد ایسی آتی ہے جہاں پہنچکر ہماری احتیاج بالکل رفع ہو جاتی ہے اور ہمیں اس چیز کی کم از کم اس خاص احتیاج کے لیے ضرورت باقی نہیں رہتی۔ فرض کرو کہ کوئی مسافر ایک بے آب وگیاہ جنگل میں پاپیادہ سفر کر رہا ہے۔ پانی جو اس نے ساتھ رکھا تھا وہ راستے میں ختم ہو جاتا ہے۔ بہت دیر تک سخت پیاس کی حالت میں راستہ چلنے کے بعد وہ ایک چشمے پر پہنچتا ہے اور فوراً پانی

پینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر کوئی بات مانع نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اتنا پانی پی لیگا جس سے اُس کی پیاس بجھ جائے۔ پانی کے پہلے پیالے کا افادہ اسقدر کثیر ہے کہ اُس سے مسافر کی جان بچ گئی۔ لہذا کسی اور پیالے کا افادہ اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پانی کا دوسرا پیالہ بھی گو پہلے پیالے کے برابر نہیں تاہم بہت کچھ افادہ رکھتا ہے۔ اسطرح اگر متعدد پیالوں کے افادوں کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مزید پیالے سے جو اطمینان اسے حاصل ہوگا وہ گھٹتا چلا جائیگا حتی کہ ایک حد ایسی پہنچ جائیگی جہاں پانی کا مزید استعمال بجائے مسرت بخش ہونے کے تکلیف دہ ثابت ہوگا اور پانی میں بجائے افادے کے اعدام افادہ کی خاصیت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی بھوکے آدمی کو کھانے کے لیے بہت سی روٹیاں دیدی جائیں تو وہ پہلی تین چار روٹیاں تو نہایت شوق سے کھالے گا لیکن بعد ازاں روٹیوں کی طرف اُس کی رغبت کم ہوتی جائے گی حتی کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اُسے مزید روٹیوں کی کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی۔ یہی حال لباس کا ہے۔ ہر شخص خواہ وہ امیر ہو یا غریب ایک جوڑ کپڑوں کی ضرورت نہایت شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ گو دوسرے جوڑ کی ضرورت پہلے کے مقابلے میں کم شدید ہو تاہم اس کے پورا ہونے سے بہت کچھ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح کپڑوں کا تیسرا جوڑا بھی کافی مسرت کا باعث ہوگا۔ لیکن جوں جوں اضافہ ہوتا جائیگا مزید جوڑ کا افادہ بہ نسبت

کم ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ ایک حد ایسی آئے گی جہاں پہنچکر مزید جوڑوں کا افادہ بالکل مفقود ہو جائے گا اور انھیں بہ حفاظت رکھنے کے لیے جو اہتمام کرنا پڑے گا وہ اس آرام سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوگا جو اُن کپڑوں کے پہننے سے حاصل ہوگا۔

واضح رہے کہ یہ خاصیت صرف مادی احتیاجات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اکثر غیر مادی احتیاجات میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ خوبصورت تصویریں اور خوشنما مناظر دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ شیریں سے شیریں نغموں سے بھی ایک نہ ایک وقت کان اکتا جاتے ہیں۔ غرض انسان کی ہر منفرد احتیاج اگر برابر پوری ہوتی رہے تو بہ تدریج اُس کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک نہ ایک وقت مکمل طور پر پوری ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن کوئی سمجھ دار آدمی صرف کسی ایک احتیاج لیکر اُسے انتہائی نقطے تک نہیں پہنچاتا بلکہ جب اِس ایک احتیاج کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے تو وہ دوسری زیادہ شدید احتیاجات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے فطرتِ انسانی کی جس کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اسی پر قانون تقلیل افادہ کی بنیاد ہے۔ اِس قانون سے مراد در اصل اس واقعے کا اظہار ہے کہ جب ہم کوئی چیز استعمال کرتے ہیں تو ایک ... کے بعد اُس کی مزید مقداروں سے ہم وہ لذت نہیں حاصل ہوتی ... ہوئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر کسی چیز کی ایک خاص مقدار استعمال کرنیکے بعد

ہر مزید مقدار کا افادہ نسبتاً کم ہوتا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہاں استعمال سے مراد ہمیشہ ایسا استعمال ہے جو ایک میعاد مقررہ کے اندر کیا جائے کیونکہ جب تک کوئی میعاد مقرر نہ ہو تقلیل افادہ کا عمل نہیں ہوسکتا۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب کوئی چیز استعمال میں لائی جاتی ہے تو اس کی کل مقدار اکٹھی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ وہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں صرف کی جاتی ہے۔ ہم بہ غرض سہولت ان تمام مقداروں کو ایک دوسرے کے مساوی تصور کرتے ہیں۔ اب کسی شخص کو سب سے پہلی مقدار کے استعمال سے جو افادہ حاصل ہوتا ہے اُسے افادہ ابتدائی کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں پانی کے پہلے پیالے کا افادہ جس سے مسافر کی جان بچ گئی افادہ ابتدائی ہے۔ اس کے برعکس کسی چیز کی آخری مقدار کے استعمال سے جو افادہ حاصل ہو اُسے افادہ مختتم کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص روزانہ پانچ روٹیاں کھانے کا عادی ہو تو جو مزید تسلی اُسے پانچویں روٹی کھانے سے حاصل ہوتی ہے وہی اس کے حق میں ان روٹیوں کا افادہ مختتم ہے۔ لیکن پانچوں روٹیوں سے بہ حیثیت مجموعی جو افادہ حاصل ہوتا ہے اُسے افادہ کلی کہتے ہیں۔

ذیل کی شکل پر غور کرنے سے قانون تقلیل افادہ کا مفہوم اور زیادہ واضح ہوجائے گا۔
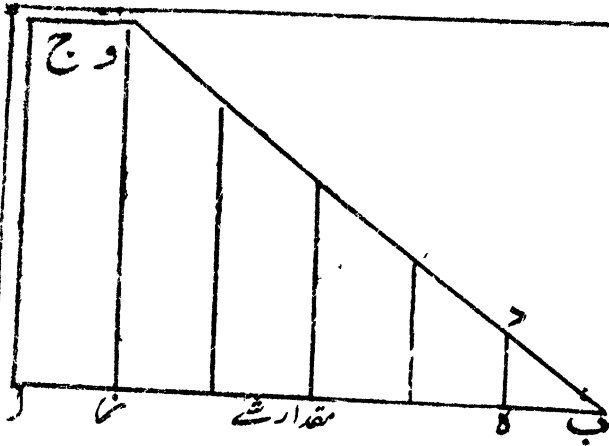
مذکورۂ بالا شکل میں خط اب کو چھ مساوی حصوں میں تقسیم
کرکے یہ فرض کیا ہے کہ ہر حصہ شے مطلوبہ کی ایک مقدار کا قائم مقام ہے
اب جوں جوں شے مطلوبہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اُس کا افادۂ
مختتم (یعنی اس کی ہر مزید مقدار کا افادہ) گھٹتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چھٹے
نمبر پر افادۂ مختتم اپنی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی اگر اُس کے بعد شے
مطلوبہ کی مقدار میں مزید اضافہ کیا جائے تو اس سے کوئی افادہ حاصل
نہ ہوگا۔ اس شکل میں افادہ ابتدائی اج وز کے مساوی ہے۔
افادۂ مختتم ب د ہ کے اور افادہ کل اب وج کے مساوی ہے
(**نوٹ**)۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ صرف دولت میں قانون
تقلیل افادہ کی بالکل وہی حیثیت ہے جو پیدائش دولت میں قانون
تقلیل حاصل کی ہے۔ قانون تقلیل حاصل میں جب ایک معیّنہ قطعہ زمین پر
محنت و اصل کے جرعے لگائے جاتے ہیں تو ایک حد معیّنہ کے بعد

ہر مزید جرعے کی پیداوار ماسبق جرعے کی پیداوار سے گھٹ جاتی ہے یہی حال تقلیل افادہ کا ہے۔ جب کسی معینہ احتیاج کے لیے کسی شئے کی مقدار یں استعمال کی جاتی ہیں تو ایک خاص حد پر پہنچکر ہر مزید مقدار کا افادہ ماسبق مقدار کے افادے سے گھٹ جاتا ہے۔ ان دونوں قوانین میں جو اور ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں انھیں ہم بہ غرض سہولت ایک جگہہ پر درج کر دیتے ہیں۔

قانون تقلیل حاصل (پیدائش دولت)	قانون تقلیل افادہ (صرف دولت)
معیّنہ قطعہ زمین	معیّنہ احتیاج
محنت و اصل کے جرعے	شیٔ مطلوبہ کی مقداریں
پیداوار	افادہ
پیداوار مختتم ۔ پیداوار کلی	افادۂ مختتم ۔ افادہ کلی

قانون تقلیل حاصل کے متعلق ہم آگے چلکر یہ معلوم ہوگا کہ جب کسی زمین پر اس کی زرخیزی کے مطابق کافی مقدار میں اصل و محنت کے جرعے نہیں لگائے جاتے تو جب تک کہ وہ مقدار نہ پہنچ جائے ہر مزید جرعے کی پیداوار ماسبق جرعے کی پیداوار سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی ایسی زمین پر قانون تکثیر حاصل کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔ یہی صورت تقلیل افادہ میں بھی موجود ہے۔ کوئی چیز کسی احتیاج متعلقہ کو پورا نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کی ایک خاص مقدار استعمال نہ کی جائے بالشت برابر کپڑے سے کوئی لباس تیار نہیں ہوسکتا۔ دس بندرہ

اینٹوں سے کوئی کمرہ تعمیر نہیں ہوسکتا۔ دو چار تولے دودھ سے کوئی مٹھائی نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی شے مطلوبہ کی بہت ہی تھوڑی مقدار موجود ہو اور اس میں بہ تدریج اضافہ ہوتا جائے تو ایک خاص حد تک ہر مزید مقدار کا افادہ سابقہ مقدار کے افادے سے زیادہ ہوگا یعنی بجائے تقلیل افادہ کے تکثیر افادہ کا عمل ظاہر ہوگا۔

قانون طلب

قانون طلب۔ قانون طلب کی تشریح کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ احتیاج اور طلب ان دونوں کا فرق اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے۔ واضح رہے کہ **احتیاج شے** اور **طلب شے** میں بہت فرق ہے جسے ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ کون نہیں چاہتا کہ اسے سواری کے لیے ایک عمدہ موٹر کار ملجائے۔ ہر شخص کو موٹر کی احتیاج محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہم اس احتیاج کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ موٹروں کی طلب بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم ایسا نہیں کہہ سکتے جب تک کہ ہر وہ شخص جو موٹر کار رکھنے کا خواہشمند ہے، اس کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھے موٹروں کی طلب پیدا نہیں ہوسکتی طلب کے لیے محض خواہش کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ خواہش کے ساتھ ادائی قیمت کی نہ صرف قابلیت بلکہ اس کے لیے آمادگی بھی ہو اگر خواہش تو موجود ہو لیکن استطاعت نہ ہو تو طلب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اسی طرح اگر خواہش اور استطاعت دونوں موجود ہوں لیکن قیمت ادا کرنے پر آمادگی نہ ہو تب بھی طلب غیر متاثر

رہتی ہے۔ لھذا معاشیات میں طلب سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی نہ صرف احتیاج ہو بلکہ اُس کو خرید کر احتیاج رفع کرنے پر قدرت بھی ہو۔ اسی طرح کسی چیز کی رسد سے اُس کی کل موجودہ مقدار مراد نہیں ہوتی بلکہ صرف وہی مقدار مراد ہوتی ہے جسے اُس کے مالک فروخت کرنے پر آمادہ ہوں۔

اب ہم قانون طلب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قانون طلب دراصل وہ قانون ہے جس سے طلب شے کے کم یا زیادہ ہونے کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی شے کی مقدار مطلوبہ کن حالات میں بڑھتی اور کن حالات میں گھٹ جاتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں تین مختلف امور کی تبدیلیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے ایک شے متعلقہ کے افادہ مختتم کی کمی بیشی۔ دوسرے شخص متعلق کی قوت خرید کی کمی بیشی۔ تیسرے شے متعلقہ کی قیمت کی کمی بیشی انہی تغیرات کی بدولت کسی چیز کی مقدار طلب میں بھی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مقدار مطلوبہ میں تغیر پیدا کرنے کے لیے یہ تینوں تغیرات ساتھ ساتھ واقع ہوں بلکہ کوئی ایک تغیر بذات خود مقدار طلب میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً اگر قوت خرید اور قیمت بدستور قائم رہیں اور افادہ مختتم میں اضافہ ہو تو مقدار مطلوبہ میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور اگر افادہ مختتم میں تخفیف ہو تو مقدار مطلوبہ میں بھی تخفیف واقع ہوگی۔ اسی طرح اگر افادہ مختتم اور قیمت جے ہے۔

اور قوت خرید میں اضافہ ہو تو مقدار مطلوبہ بڑھے گی اور اگر قوت خرید گھٹ جائے تو مقدار مطلوبہ بھی گھٹ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر افادہ مختتم اور قوتِ خرید تو اپنی حالت پر قائم رہیں اور قیمت میں اضافہ ہو جائے تو مقدارِ مطلوبہ میں تخفیف ہوگی اور اگر قیمت میں تخفیف ہو جائے تو مقدار مطلوبہ میں اضافہ ہوگا۔

واضح رہے کہ قانونِ طلب انسانی فطرت کے ایک خاص رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس ایک رجحان کو بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں جن میں سے ہر طریقہ صرف کسی ایک پہلو کو پیش نظر رکھ کر اسے نسبتاً زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ جس طرز پر ہم نے اس قانون کو پیش کیا ہے اگر وہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو پھر اس کے کسی پہلو کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی تاہم بہ نظر سہولت قانون طلب بیان کرنے کے مختلف طریقے ذیل میں درج کر دیے جاتے ہیں۔

ا۔ کسی چیز کی مقدار رسد جسقدر بڑھے گی اس کی قیمت گھٹے گی۔
کسی چیز کی مقدار رسد جسقدر گھٹے گی اس کی قیمت بڑھے گی۔

ب۔ کسی چیز کی طلب بڑھنے سے قیمت بھی بڑھے گی۔
کسی چیز کی طلب گھٹنے سے قیمت بھی گھٹے گی۔

ج۔ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے طلب بڑھے گی۔
کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے طلب گھٹے گی۔

واضح رہے کہ ا میں طلب کی حالت اور ب اور ج میں رسد کی حالت معین فرض کر لیجاتی ہے۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے طلب اور رسد دونوں میں مختلف قسم کے تغیرات ہمیشہ واقع ہوتے رہتے ہیں جن کے مطابق قانون طلب کے عمل میں بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن ان تغیرات کا بیان آئندہ نظریۂ قیمت کے عنوان میں زیادہ برمحل ہوگا۔

اضافہ طلب اور بعض دوسری اصطلاحات کا مفہوم

اضافہ طلب اور بعض دوسری اصطلاحات کا مفہوم۔

واضح رہے کہ ہم کسی شخص کی طلب کا اظہار بلا حوالۂ قیمت نہیں کرسکتے۔ محض مقدار خرید یا شدتِ خواہش سے طلب کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔ طلب کی ٹھیک حالت اُسی وقت معلوم ہوسکتی ہے جبکہ ہمیں علم ہو کہ کس کس قیمت پر کتنی کتنی مقدار خریدی جائے گی۔ لہذا ہم بھی قیمت کے حوالے سے اضافہ طلب کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرینگے جب کبھی یہ کہا جائے کہ کسی چیز کے لیے کسی شخص کی طلب میں اضافہ ہوگیا ہے تو اس سے دو حالتوں میں سے کوئی ایک حالت مراد ہوسکتی ہے ایک تو یہ کہ اُسی قیمت پر شخص مذکور پہلے سے زیادہ مقدار خریدتا ہے دوسرے یہ کہ وہ قیمت بڑھ جانے پر بھی حسب سابق اُس چیز کی وہی مقدار خریدتا ہے۔ ایک صورت میں تو قیمت اپنی حالت پر قایم رہتی ہے اور مقدار خرید میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں مقدار خرید حسب سابق بحال رہتی ہے اور قیمت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

تخفیف طلب کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے - یا تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ اس قیمت پر پہلے سے کم تر مقدار خریدی جاتی ہے یا یہ کہ قیمت گھٹ جانے پر بھی پہلے کے برابر ہی مقدار خریدی جاتی ہے

ہم ابھی یہ معلوم کر چکے ہیں کہ قیمت گھٹنے سے طلب بڑھتی اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹتی ہے - طلب کے اسطرح بڑھنے اور گھٹنے کو اضافہ اور تخفیف طلب نہیں کہتے بلکہ کشائش اور بست طلب کہتے ہیں یعنی طلب میں جو زیادتی اور کمی قیمت کے تغیرات کی وجہ سے پیدا ہو وہ اصطلاح میں علی الترتیب **کشائش طلب اور بست طلب** کہلاتی ہے - لیکن اگر وہ تغیرات قیمت کے علاوہ دوسرے اسباب کا نتیجہ ہو تو اُسے اضافہ اور تخفیف طلب کہتے ہیں اور ان کا معاشی مفہوم ہم ابھی واضح کر چکے ہیں -

یہی حال رسد کا ہے - اگر قیمت کی بیشی یا کمی سے کسی چیز کی رسد بڑھے یا گھٹے تو یہ صورت علی الترتیب **کشائش رسد و بست رسد** کی ہوگی - لیکن اگر وہ تغیرات قیمت کا نہیں بلکہ دوسرے اسباب کا نتیجہ ہو تو اسے علی الترتیب **اضافہ رسد اور تخفیف رسد** کہیں گے -

تغیر پذیری طلب

تغیر پذیری طلب - قانون طلب کی تشریح میں ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے اُس کی طلب گھٹتی اور قیمت گھٹنے سے طلب بڑھ جاتی ہے - بہ الفاظ دیگر قیمت کی تبدیلیوں سے طلب میں معکوس تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں - جہاں تک اس

قانون کا تعلق ہے کوئی چیز اس کے اثر سے مستثنیٰ نہیں۔ متاثر ہونے میں تو تمام اشیا شریک ہیں لیکن بہ لحاظ اثر پذیری کے اُن میں زبردست اختلافات نظر آتے ہیں اور انہی اختلافات کی بنا پر طلب کو تغیر پذیر اور غیر تغیر پذیر، ان دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

تغیر پذیری طلب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے:-

(ا) اگر قیمت کی تھوڑی تبدیلی سے طلب میں کوئی بڑا فرق پیدا ہو تو۔ } طلب تغیر پذیر

اگر قیمت کی بڑی تبدیلی سے بھی طلب میں نہایت معمولی فرق پیدا ہو تو۔ } طلب غیر تغیر پذیر

(ب) قیمت تھوڑی گھٹنے سے طلب بہت بڑھے یا قیمت تھوڑی بڑھنے سے طلب بہت گھٹے تو } طلب تغیر پذیر

قیمت بہت گھٹنے سے طلب کم بڑھے یا قیمت بہت بڑھنے سے طلب کم گھٹے تو } طلب غیر تغیر پذیر

(ج) قیمت میں کچھ تخفیف ہونے سے اگر طلب زیادہ بڑھے تو — تغیر پذیر

اور اگر کم تو — غیر تغیر پذیر

قیمت میں کچھ اضافہ ہونے سے اگر طلب میں بہت تخفیف ہو تو — تغیر پذیر

اور اگر کم تو — غیر تغیر پذیر

نوٹ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ حقیقی طور پر غیر تغیر پذیر درحقیقت کوئی طلب نہیں ہے۔ قیمت کی کمی بیشی کا ہر چیز کی طلب پر اثر پڑتا

لازمی ہے۔ البتہ یہ اثر بعض چیزوں کی طلب پر زیادہ پڑتا ہے اور بعض پر کم۔ جن اشیا کی طلب قیمت کے تغیرات سے نسبتاً کم متاثر ہوتی ہے اُسے صرف آسانی بیان کی خاطر غیر تغیر پذیر کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہر چیز کی طلب کم و بیش تغیر پذیر ضرور ہوتی ہے۔

تغیر پذیری طلب پر تین چیزوں کا خاص طور پر اثر پڑتا ہے۔ ایک قیمت کی کمی بیشی۔ دوسرے چیزوں کی نوعیت۔ تیسرے طریق۔ قیمت کی کمی بیشی اور تغیر پذیری طلب کا تعلق معلوم کرنے کے لیے ہم پہلے قیمت کے تین مدارج قایم کریں گے: ایک اعلیٰ۔ دوسرے متوسط۔ تیسرے ادنیٰ۔ "اعلیٰ قیمت سے مراد ایسی قیمت ہے جو خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو۔ لوگ اُس قیمت پر چیزیں نہ خرید سکتے ہوں۔ متوسط قیمت وہ ہے جو لوگوں کو گراں نہ گذرے اور ادنیٰ قیمت سے چیزوں کی بے حد ارزانی مراد ہے کہ ہر کوئی دل بھر کر خرید سکے۔ واضح رہے کہ قیمت کے یہ مدارج مستقل نہیں بلکہ محض اضافی ہیں۔ اُن کا دار و مدار سراسر خریداروں کی مالی حالت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی قیمت خریداروں کی مالی حیثیت کے مطابق اعلیٰ۔ اوسط اور ادنیٰ محسوس ہوتی ہے"۔ (علم المعیشت)

اب غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اعلیٰ قیمتوں میں کچھ کمی بیشی واقع ہو تو اُس کا طلب پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑیگا۔ ایسی چیزوں کے خریدار پہلے ہی سے اتنے کم ہوتے ہیں کہ ان کی قیمتوں

میں کچھ اور اضافہ ہوجانے سے نہ طلب میں کوئی قابل لحاظ تخفیف ہوتی ہے اور نہ قیمتوں میں کچھ تخفیف ہوجانے سے طلب میں کوئی قابل لحاظ اضافہ ہوتا ہے۔ یہی حال ادنی قیمتوں کا ہے۔ ادنی قیمت والی چیزوں کو پہلے ہی سے ہر شخص دل بھر کر خریدتا ہے۔ لھذا اگر اُن کی قیمتوں میں کچھ مزید تخفیف ہوجائے تو طلب میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا اور نہ قیمتوں میں کچھ اضافہ ہونے سے طلب میں کوئی نمایاں تخفیف ہوتی ہے۔ متوسط قیمتوں کی حالت البتہ اس سے مختلف ہوتی ہے۔ ایسی چیزیں نہ تو اتنی گراں ہوتی ہیں کہ بہت کم لوگ انہیں خرید سکیں اور نہ اتنی ارزاں کہ ہر شخص سیر ہو کر استعمال کرسکے۔ لہذا اُن کی قیمتوں میں تھوڑا سا بھی تغیر ہوتا ہے تو اُس سے طلب بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ انہی واقعات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اعلی اور ادنی قیمت والی چیزوں کی طلب عموماً غیر تغیر پذیر ہوتی ہے اور متوسط قیمت والی چیزوں کی تغیر پذیر۔

مدارج قیمت کے علاوہ خود چیزوں کی نوعیت کا بھی تغیر پذیری طلب پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ احتیاجات کی قسموں کے عنوان میں ہم یہ معلوم کرچکے ہیں کہ بعض احتیاجات ایسی شدید ہوتی ہیں کہ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو انسان ہلاک ہوجائیگا جیسے کھانا پینا۔ لیکن اکثر احتیاجات ایسی شدید نہیں ہوتیں اور نہ

اُن کے پورا نہ ہونے سے کوئی خاص نقصان پہنچتا ہے۔ پہلی قسم کی احتیاجات کو اصطلاح میں ضروریات کہتے ہیں اور دوسری قسم کی احتیاجات کو تعیشات۔ احتیاجات کی ان دو قسموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ضروریات اگرچہ نہایت شدید ہوتی ہیں تاہم وہ بہت جلد مکمل طور پر رفع ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں احتیاجات سیری پذیر بھی کہا جاتا ہے۔ تعیشات اگرچہ اسقدر شدید نہیں ہوتیں تاہم ان کی بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہونے پاتیں۔ اور اسوجہ سے انھیں غیر سیری پذیر کہا جاتا ہے۔ اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ضروریات کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے اور تعیشات کی طلب بہت زیادہ تغیر پذیر۔ انسان کی ناگزیر احتیاجات بہت تھوڑی مقدار سے مکمل طور پر رفع ہو جاتی ہیں۔ ایسی چیزیں خواہ کتنی ہی ارزاں ہو جائیں لوگ انھیں ایک خاص مقدار سے زیادہ نہیں خریدینگے۔ ساتھ ہی چونکہ وہ ناگزیر ہوتی ہیں اس لیے بہت زیادہ گراں ہونے پر بھی لوگ اپنی مقدار خرید میں زیادہ تخفیف نہیں کرسکتے۔ گویا قیمت کی کمی بیشی کا ضروریات کی طلب پر بہت کم اثر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس تعیشات کی یہ حالت ہے کہ وہ کبھی مکمل طور پر رفع نہیں ہونے پاتیں۔ جسقدر اُن کا اہتمام کیجئے وہ اور زیادہ اہتمام طلب بنتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسی چیزیں ذرا بھی ارزان ہوتی ہیں تو لوگ بہ کثرت انھیں خریدتے

لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ناگزیر نہیں ہیں اس لیے جب وہ ذرا بھی گراں ہوتی ہیں تو بہت سے لوگ انھیں خریدنا ترک کر دیتے ہیں گویا قیمت کی ذرا سی کمی بیشی کا بھی تعیشات کی طلب پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔

مدارج قیمت اور نوعیت اشیا کا طلب کی تغیر پذیری پر جدا جدا جو اثر پڑتا ہے اُس کی کیفیت تو ہم معلوم کر چکے۔ اب ان دونوں اسباب کو ملا دینے سے جو نتایج حاصل ہوتے ہیں انھیں ذیل میں درج کرتے ہیں:-

(ا) "اعلیٰ قیمت کی حالت میں ضروریات کی طلب تو بہت کچھ تغیر پذیر ہو سکتی ہے لیکن تعیشات کی بے حد کم" وجہ صاف ظاہر ہے۔ ضروریات چونکہ ناگزیر ہوتی ہیں اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکے لوگ ان کے خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تعیشات اس طرح ناگزیر نہیں ہوتیں۔ اُن کا خریدنا نہ خریدنا سراسر اختیاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بہ مقابل تعیشات کے ضروریات کی گرانی کے بہت زیادہ متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مقابلۃً ضروریات کی طلب تعیشات کی طلب سے بہ حالت قیمت اعلیٰ زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔"

(ب) "قیمت متوسط کی حالت میں تعیشات کی طلب مقابلۃً زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے اور ضروریات کی طلب اسقدر تغیر پذیر نہیں ہو سکتی۔" وجہ وہی سیری پذیری اور عدم سیری پذیری کا فرق ہے۔

(ج) قیمت ادنیٰ میں ہر قسم کی چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے لیکن پھر بھی ضروریات کی طلب مقابلۃً بیشتر غیر تغیر پذیر ہوگی۔ (علم المعیشت)

قیمت کی کمی بیشی اور اشیاء کی نوعیت کے بعد اب ہم طریق بدل کا اثر معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی واقعہ ہے کہ ایک ایک احتیاج متعدد اشیاء سے رفع ہو سکتی ہے۔ خاصکر زمانۂ موجودہ میں سائنس کی ترقی اور ایجادات کی بدولت انسان کی ذرا ذرا سی احتیاج کے لیے بیسیوں ارزاں اور آرام دہ اشیا نظر آتی ہیں۔ لہذا ہر شخص اپنی اپنی پسند اور استطاعت کے مطابق ان میں سے کوئی نہ کوئی چیز خرید کر اپنی احتیاج رفع کر لیتا ہے۔ مزید براں وہ ہر احتیاج کے لیے ہمیشہ ایک ہی قسم کی چیز استعمال نہیں کرتا بلکہ متعدد اسباب کے زیر اثر ان میں ہمیشہ ردّ و بدل کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ "ایک ہی احتیاج رفع کرنے کے لیے ایک چیز کے بجائے دوسری چیز استعمال کرنا یہی طریق بدل ہے۔" تغیر پذیری طلب سے اس کا یہ تعلق ہے کہ وہ اشیاء متعلقہ کی طلب کو بہت زیادہ تغیر پذیر بنا دیتا ہے۔ مثلاً یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے اُس کی طلب گھٹتی ہے لیکن اگر طریق بدل کی بدولت لوگ اس کے عوض دوسری ارزاں چیزیں استعمال کر کے اپنی احتیاج رفع کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اُس کی طلب اور زیادہ گھٹ جائے گی۔ اسی طرح یہ بھی عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ چیز ارزاں

ہونے کی وجہ سے دوسری چیزوں کے عوض استعمال ہونے لگے تو اُس کی طلب کا اور زیادہ بڑھجانا یقینی ہے۔

نوٹ۔ جس طرح ایک ہی احتیاج متعدد اشیا سے رفع ہوسکتی ہے، اُسی طرح ایک ہی شئے متعدد احتیاجات رفع کرنے میں کام آسکتی ہے۔ اب اگر ان احتیاجات میں بعض ضروریات ہوں اور بعض تعیشات تو ظاہر ہے کہ ایسی چیز کی مجموعی طلب ضرور تغیر پذیر ہوگی۔ لیکن جس چیز سے صرف کوئی ایک احتیاج پوری ہوتی ہو جیسے دودھ یا گھی کہ صرف کھانے میں کام آتا ہے، یا ہارمونیم کہ صرف تفریح کے لیے استعمال ہوتا ہے تو ایسی صورت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ چیز ضروریات میں شامل ہے یا تعیشات میں۔ پہلی حالت میں اس کی طلب غیر تغیر پذیر ہوگی اور دوسری حالت میں تغیر پذیر۔

تقسیم آمدنی

تقسیم آمدنی۔ یہ سوال کہ لوگ کس اصول کے مطابق اپنی آمدنی مختلف اشیائے مطلوبہ کے خریدنے میں خرچ کرتے ہیں، صرف دولت کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہر سمجھدار شخص کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی آمدنی سے جسقدر زیادہ ممکن ہوسکے اطمینان حاصل کرے۔ اس نیت سے وہ اپنی آمدنی مختلف ضروریات میں اس طور پر تقسیم کرتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اسے بیشترین افادہ حاصل ہو اور ہمیشہ اپنے اخراجات میں ایسا ردو بدل کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے جس کی بدولت اس کے افادۂ کلی میں اضافہ ہو۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ کچھ روپیہ کپڑوں کی مد سے نکال کر

غذا پر صرف کرنے سے اُسے زیادہ افادہ ملے گا تو وہ ضرور ایسی تبدیلی عمل میں لائے گا اور ایسا ردوبدل وہ اس وقت تک کرتا رہے گا جب تک کہ ہر شیے کا افادہ مختتم اس کے نزدیک برابر برابر نہ ہو جائے کیونکہ یہی وہ حالت ہے جس پر پہنچنے کے بعد جو کثیر سے کثیر افادہ اُسے مل سکتا ہے وہ ملنے لگے گا اور افادہ کُلّی میں مزید اضافے کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی۔ مگر عملی طور پر کوئی شخص ایسی حالتِ کمال پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسے اپنے اخراجات میں ردوبدل کرنے کی ہمیشہ کم وبیش ضرورت باقی رہتی ہے تاکہ وہ مختلف اشیا کے افادۂ مختتم کی مساوات قایم رکھ سکے اور اگرچہ وہ مساوات کی حالتِ کمال پر نہیں پہنچ سکتا تاہم مدامی کوشش اور دیکھ بھال کی بدولت وہ اس حالت سے بہت زیادہ دور بھی نہیں جاسکتا۔ وہ اپنی آمدنی سے بیشترین افادہ حاصل کرنے کے لیے اُسے مختلف اشیائے مطلوبہ میں اس طور پر تقسیم کرتا کہ ہر ہر چیز پر جو آخری روپیہ صرف کیا جائے اس کا افادہ ایک دوسرے کے قریب قریب مساوی ہو جائے، اس عام رجحان کو معاشیات کی اصطلاح میں **قانون مساوات افادۂ مختتم** کہتے ہیں۔

مساواتِ افادہ مختتم کی حالت پر پہنچنے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی ایک چیز کی قیمت بڑھ جائے اور دوسری اشیا کی قیمتیں بدستور قایم رہیں تو جو آخری روپیہ اس گران چیز کے خریدنے میں صرف کیا جاتا تھا اس سے اب مقابلتہً کمتر

افادہ حاصل ہوگا۔ لھذا اس تبدیلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے شخص متعلقہ کو اپنے مصارف میں بھی ردو بدل کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ چونکہ اشیا کی قیمتوں میں ہمیشہ ردوبدل ہوتا ہی رہتا ہے اس لیے لوگوں کو اپنے مصارف میں بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ ردوبدل کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ مساوات افادہ مختتم کی حالت سے زیادہ دور نہ ہٹنے پائیں۔

اس کے علاوہ ہر ایک احتیاج کو پورا کرنے کے لیے نئی نئی قسم کی چیزیں بن بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں لھذا اُن کا تجربہ کرنا بھی ضرور ہے تاکہ ہم اپنی آمدنی سے بیشتر بیش افادہ حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی قسم کی چیز استعمال کرتے کرتے اکثر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اس لیے لوگ اپنی اسی احتیاج کو کبھی کسی چیز سے پورا کرتے ہیں تو کبھی کسی اور چیز سے اس قسم کے ردوبدل سے انھیں جو لطف و مسرت یا افادہ حاصل ہوتا ہے اس کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

مزید براں جب ہم آئندہ احتیاجات کا خیال کرتے ہیں تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ ہمیں اپنی محدود آمدنی صرف کرتے وقت ایک تو موجودہ احتیاجات ہی میں انتخاب کرنا پڑتا ہے، جس کی بنا پر ہم بعض احتیاجات کو پورا کرلیتے اور بقیہ کو ترک کر دیتے ہیں دوسرے ہمیں اپنی آئندہ احتیاجات کو بھی ہمیشہ نگاہ کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ اور ان کی تکمیل کے خیال سے اپنی موجودہ آمدنی کا کچھ حصہ پس انداز کرنا پڑتا ہے۔ ہم کسی سابقہ عنوان میں یہ پڑھ چکے ہیں کہ ایک معمولی

مصرف کے نزدیک اشیائے آیندہ کا افادہ اُسی قسم کے اشیائے موجودہ
کے افادے سے کم ہوتا ہے اور یہ کمی مستقبل کے قرب و بُعد کے مطابق
گھٹتی بڑھتی ہے۔" لہذا ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق یہ کوشش
کرتا ہے کہ اس کی آمدنی موجودہ اور آیندہ احتیاجات میں اس طور پر تقسیم
ہو کہ آیندہ صرف ہونے والے روپیوں کے افادۂ مختتم کا موجودہ تخمینہ
فی الوقت صرف ہونے والے روپیوں کے افادۂ مختتم کے برابر ہو۔

مختصر یہ کہ مساوات افادۂ مختتم کی حالت پر پہنچنے میں جو دقتیں
پیش آتی ہیں وہ یا تو قیمت کی تبدیلیوں سے متعلق ہوتی ہیں، یا اسی قسم
کی اشیاء کے پیدا ہونے سے، یا آیندہ احتیاجات کا لحاظ کرنے سے۔

توفیر صرف

توفیر صرف۔ ہماری ضروریات کی بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ
اگر اُن کی قیمتیں معیار موجودہ سے بہت بڑھ جائیں تب بھی ہم اُن کے
استعمال سے دست کش نہ ہوں گے۔ مثال کے طور پر آدھ آنے والے
پوسٹ کارڈ کو لیجئے۔ اگر حکومتِ ہند اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر پوسٹ
کارڈ کی قیمت نصف آنے سے بڑھا کر ڈیڑھ آنہ یا دو آنے کر دے تب بھی
لوگوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہو گی جو اُن کا استعمال ترک نہیں کرے گی
یہی حال اخبارات کا ہے۔ اگر ان کی قیمتیں موجودہ معیار سے دگنی ہو جائیں تو
یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اخبارات کی نکاسی بالکل بند ہو جائے گی۔ گو اتنی
کثیر تعداد میں نہیں تاہم اخبارات کے خریدار بہت سے موجود ہوں گے
جو اس بڑھی ہوئی قیمت پر بھی اخبار خریدیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ

اخبار کا افادہ اُن کے نزدیک اس کی مضاعف شدہ قیمت سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ تب ہی تو یہ لوگ اسقدر زیادہ قیمت دیکر اخبار خریدنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایک اور عمدہ مثال دیا سلائی کی ہے۔ اگر دیا سلائی کی ایک ڈبیہ کی قیمت دو پیسوں سے بڑھتے بڑھتے دو آنے ہو جائے تو تب بھی ایک کثیر تعداد اُس کو خریدنے کے لیے مستعد ہوگی مگر جب دیا سلائی کی ڈبیہ درحقیقت صرف دو پیسوں میں ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ دو آنے کیوں دینے چلے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خریدار کو دو پیسے ادا کرنے پر جو افادہ حاصل ہوتا ہے وہ اُس کی نظر میں دراصل دو آنے کے برابر ہے۔ کیونکہ اگر ڈبیہ دو پیسوں میں دستیاب نہ ہوتی تو وہ اس کی خاطر بارہ پیسے تک ادا کرنے میں پس و پیش نہ کرتا۔ پس خریدار زیر بحث کو دیا سلائی کی ایک ڈبیہ خریدنے سے (۱۲-۲) دس پیسے بطور حاصل زاید کے مل گئے۔ معاشیات میں اسی حاصل زاید کو توفیر مصرف کہتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں پیدائش دولت کے گوناگوں تغیرات اور صنعت و حرفت اور تجارت کی عجیب و غریب ترقیوں کی بدولت جن کی مفصل کیفیت ہم آگے چلکر بیان کریں گے، ہماری ضرورت کی لاتعداد چیزیں معمولی معمولی قیمتوں پر ہمیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر یہی چیزیں ہمیں سستے داموں پر میسر نہ ہوں تو ہم ان کے لیے معمول سے کہیں زیادہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان چیزوں سے جو افادہ ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ اُس قیمت کے افادے سے کہیں زیادہ

ہوتا ہے جو ہم معمولاً ان کے لیے ادا کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم اپنے آپ کو اس قسم کی چیزوں کے افادے سے کلیتاً محروم کرنے کے بجائے اعلیٰ قیمتیں دیکر انھیں حاصل کریں تو ہمارا یہ طرزِ عمل بعید از عقل نہیں کہا جاسکتا۔ غرض یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ ہمیں اکثر و بیشتر اشیا کی خریداری میں کچھہ ماحصل زاید دستیاب ہوتا ہے جسے اصطلاح میں توفیرِ مصرف کہا جاتا ہے۔

ایک مثال کے ذریعہ ہم اس معاشی اصطلاح کی مزید تشریح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص قحط سالی کے زمانے میں ایک سیر گیہوں حاصل کرنے کے لیے ایک روپیہ تک قیمت دینے کو تیار ہوگا۔ اگر سیر بھر گیہوں اس قیمت پر بھی میسر نہ ہوں تو وہ گیہوں کا استعمال ترک کرکے اس کے عوض کوئی اور سستی چیز استعمال کرنے لگے گا۔ اب فرض کرو کہ گیہوں کی قیمت درحقیقت ایک روپیہ فی سیر سے زیادہ نہیں بڑھتی ایسی صورت میں وہ ایک سیر گیہوں خریدنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے بعد جب قیمت گھٹ کر آٹھ آنے فی سیر ہوجاتی ہے تو وہ دو سیر گیہوں خریدتا ہے لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے وہ پہلے سیر کے لیے ایک روپیہ تک قیمت دینے کو تیار تھا لہذا جبکہ وہ دونوں سیروں کی قیمت آٹھ آٹھ آنے ہی ادا کرتا ہے تو اس کو آٹھ آنے کے بقدر ماحصل زاید ملے گا اگر قیمت چھ آنے فی سیر ہوجائیگی تو وہ تین سیر گیہوں خریدیگا اور اس صورت میں اس کا ماحصل زاید بارہ آنے ہوگا۔ ذیل کے جدول پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ کیونکر کسی شخص کے توفیرِ مصرف کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔

قیمت	طلب	کہاں تک قیمت ادا کرتا	درحقیقت کیا قیمت ادا کرتا ہے	توفیر مصرف
آنے	سیر	آنے	آنے	آنے
۱۶	۱	۱۶	۱۶	٠
۸	۲	۱۶ + ۸	۱۶	۸
۶	۳	۱۶ + ۸ + ۶	۱۸	۱۲
۴	۴	۱۶ + ۸ + ۶ + ۴	۱۶	۱۸
۳	۵	۱۶ + ۸ + ۶ + ۴ + ۳	۱۵	۲۲
۲	۶	۱۶ + ۸ + ۶ + ۴ + ۳ + ۲	۱۲	۲۷

مندرجہ بالا جدول سے صاف ظاہر ہے کہ شئے مطلوبہ کو ترک کردینے کے بجائے جو زاید قیمت اس کے حاصل کرنے کی غرض سے کوئی شخص ادا کرتا ہے، وہی اس کے توفیر مصرف کا معاشی پیمانہ ہے۔

تیسرا باب

پیدائش دولت

پیدائش دولت کا مفہوم۔ آغازِ آفرینش سے اب تک اور خاصکر گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر انسان نے بلا شبہ نہایت زبردست ترقی کی ہے۔ زمین سمندر، ہوا اور قدرت کے دوسرے مظاہر پر اُس کا تصرف روز بروز بڑھ رہا ہے بجلی کی طاقت سے آج جو جو کام لیے جا رہے ہیں وہ یقیناً قابل فخر و مباہات ہیں غرض اپنی آسایش کے اسباب مہیا کرنے میں انسان نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس پر وہ بجا طور پر ناز کرسکتا ہے لیکن باوجود ان تمام محیر العقول کارناموں کے اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے اس عظیم الشان تماشہ گاہ میں انسان کی حیثیت ایک معمولی تماشائی سے زیادہ نہیں ہے۔ انسان کی کارگذاری صرف اس بات تک محدود ہے کہ وہ قدرت کی عطا کی ہوی چیزوں میں طرح طرح سے تغیر کرتا اور انہیں اپنے منشا کے مطابق بنا لیتا ہے تاکہ اُن سے اپنی قسم قسم کی احتیاجات پوری کرے۔ انسان دنیا میں جتنی چیزیں پیدا کرتا ہے اگر اُن میں سے ہر ایک کی ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وہ کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا بلکہ جو اشیا پہلے سے موجود ہیں اُن کی شکل یا اُن کا مقام بدلکر اُن میں رفع احتیاجات کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ زراعت، صنعت، تجارت، ہر ایک جد وجہد کا نتیجہ

بس اسی قدر ہے کہ قدرت کے عملیات میں نئے نئے افادے پیدا کیے جاتے ہیں ۔ جن سے انسان کی مختلف احتیاجات کا حقہ پوری ہو سکیں کسی چیز کو عدم سے ہست کرنا یا بالفاظ دیگر کوئی نیا مادہ پیدا کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پیدائش دولت سے مراد تخلیق مادہ نہیں بلکہ تخلیق افادہ ہے ۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت، ہر ایک میں شب و روز سینکڑوں مثالیں ہماری نظروں سے گذرتی ہیں جن سے اس مقولے کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے ۔

عاملین پیدائش ۔ پیدائش دولت کا صحیح مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انسان کیونکر یہ افادے پیدا کرتا ہے بالفاظ دیگر وہ کن ذرایع کی مدد سے قدرت کے عطا کردہ مادے میں رفع احتیاجات کی صلاحیت پیدا کرتا ہے ۔ انہی ذرایع کو اصطلاح معیشت میں عاملین پیدائش کہتے ہیں اب ہم ان عاملین کی تفصیلی کیفیت، اور پیدائش دولت میں ہر ایک کی کارگزاری کا حال معلوم کریں گے ۔

بنی نوع انسان دنیا میں اپنے ذرایع معاش حاصل کرنے کے لیے طرح طرح سے کوشاں نظر آتے ہیں ہر ملک کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد تو زراعت کو اپنی پرورش کا وسیلہ بنائے ہوئے ہے ۔ بہت سے لوگ قسم قسم کی مصنوعات بنا بنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں کثیر التعداد اشخاص تجارتی اشغال اور نقل و حمل کے کاروبار میں مصروف نظر آتے ہیں کچھ لوگ ہیں جو دوسروں کی کوئی نہ کوئی خدمت انجام دیتے اور اس ذریعہ سے روزی کماتے ہیں غرض ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کے قدرتی حالات اور باشندوں کی خصوصیات کے لحاظ سے پیدائش دولت کا کاروبار بہت سے پیشوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور ہر شخص ان پیشوں میں سے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر کے انفرادی حیثیت سے اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنا لیتا ہے ۔

امریکہ کے مشہور معاشی یعنی پروفیسر کارور نے پیشوں کی ایک نہایت مفصل تقسیم کی ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں اسکا حوالہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر انہی پیشوں پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالی جائے تو یہی پیدایش دولت کے مختلف شعبے معلوم ہوں گے۔ اسی لیے پروفیسر کارور نے معاشی دولت حاصل کرنے کے مختلف طریقوں کی حسب ذیل تقسیم کی ہے۔

- معاشی دولت حاصل کرنے کے ذرایع
  - ابتدائی کاروبار
    - استخراجی
      - ۱۔ شکار
      - ۲۔ ماہی گیری
      - ۳۔ بنچرائی
      - ۴۔ جنگل کاٹنا
      - ۵۔ کان کنی
    - پیدائشی
      - ۱۔ زراعت
      - ۲۔ جنگل لگانا
      - ۳۔ ماہی پروری
  - ثانوی کاروبار
    - ۱۔ صنعت و حرفت
    - ۲۔ نقل و حمل
    - ۳۔ تجارت
  - ذاتی خدمات اور پیشے۔
    - ۱۔ طبابت
    - ۲۔ درس تدریس
    - ۳۔ نظم ونسق
    - ۴۔ تفریح وغیرہ

پیدائش دولت کے کاروبار کی مذکورۂ بالا تقسیم اسقدر مفصل اور جامع ہے کہ آجکل بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں جو دولت پیدا ہورہی ہے وہ انہی چند شعبوں میں سے کسی نہ کسی شعبے کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہوگی۔

اب ہمیں اُن عاملین کی تحقیق کرنی ہے جو پیدائش دولت کے ان تمام شعبوں کا کام انجام دینے کے لیے درکار ہوتے ہیں اور جن کے بغیر دنیا میں کسی قسم کی دولت پیدا نہیں ہوسکتی۔

زمین

زمین۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مندرجۂ بالا ہر ایک کاروبار میں ہمیں قدرت کی طرف سے کچھ ناگزیر مدد مل رہی ہے۔ مثال کے طور پر زراعت کو لیجئے۔ اگر انسان کے لیے قدرت کی طرف سے زمین مہیا نہ کی جاتی تو وہ کیونکر قسم قسم کے اجناس اور خام پیداواروں کی کاشت کرسکتا تھا۔ زراعت کے لیے صرف سطح زمین کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے کہ اس زمین میں وہ کیمیائی قوتیں بھی موجود ہوں جو عام طور پر پودوں کی نشو ونما کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ خاص خاص فصلوں کی کاشت کے لیے جن کیمیائی اجزا کی ضرورت ہوتی ہے اُن کا موجود ہونا بھی لازمی ہے۔ اِس کے علاوہ بارش، آب وہوا، اور موسمی اثرات کی زراعت میں جیسی کچھ اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں اور ان تمام امور کی سربراہی کا مدار کلیتاً قدرت پر ہے۔ یہی حال صنعت وحرفت کا ہے۔ جب تک کہ قدرت کی مدد کافی طور پر شامل

حاصل نہ ہو، انسان کسی قسم کا صنعتی کاروبار انجام نہیں دے سکتا۔ پارچہ بافی، آہنگری، نجاری، معماری، جس جس دستکاری پر نظر ڈالیے ہر ایک میں انسان قدرت کا ضرور کم و بیش محتاج نظر آتا ہے۔ مختصر یہ قدرت نے انسان کے لیے طرح طرح کے سامان فراہم کر دیے ہیں۔ ہوا، پانی، دریا، سمندر، پہاڑ، آبشار، گرمی، سردی، قسم قسم کے جانور، طرح طرح کے معدنیات، زرخیز زمین، اور بیش بہا جنگلات، یہ سب پیدایش دولت کے لیے ناگزیر ہیں اور ان کی بہم رسانی سراسر قدرت کے اختیار میں ہے۔ اسی بنا پر معاشیین نے قدرت کو پیدایش دولت کا پہلا عامل قرار دیا ہے۔ لیکن قدرت کا لفظ اب اس معنی میں متروک الاستعمال ہے اور اس کے بجاے زمین آجکل کی مسلمہ اصطلاح ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زمین پیدایش دولت کا پہلا اور ناگزیر عامل ہے اور زمین سے معاشیات میں صرف سطح زمین مراد نہیں ہے بلکہ اس کے مفہوم میں وہ تمام قدرتی وسائل شامل ہیں جن سے انسان کو دولت پیدا کرنے میں ناگزیر مدد ملتی ہے۔

محنت

محنت۔ انسان کی زندگی کے لیے ہر طرح کا ضروری سامان مہیا کر دینا یہ تو قدرت کا کام ہے۔ لیکن ان وسائل کو کام میں لانا اور ان سے احتیاجات رفع کرنے والی اشیا تیار کرنا یہ خود انسان کا فرض ہے۔ کسی ملک میں قدرتی وسائل کی موجودگی اس وقت تک بیکار رہے جب تک کہ باشندوں میں ان وسائل سے استفادہ کرنے کی صلاحیت

پیدا نہ ہو۔ قدرتی عطیات کی فراوانی فی نفسہ انسانی احتیاجات کی تکمیل کے لیے ناکافی ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان اپنے ماحول اور اپنی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر حتی الوسع خود بھی جد و جہد کرے تاکہ وسائل قدرت کی مدد اور اپنی محنت و جانفشانی سے وہ ایسی چیزیں تیار کر سکے جن سے اُس کی احتیاجات پوری ہوتی ہوں۔ زراعت صنعت، تجارت، جس شعبہ پیدائش پر نظر ڈالیئے عطیات قدرت کے ساتھ انسان کی جسمانی یا دماغی محنت بھی ناگزیر معلوم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کو پیدائش دولت کا دوسرا اہم عامل قرار دیا گیا ہے اور اس کے مفہوم میں وہ تمام جسمانی اور دماغی کام شامل ہیں جو انسان کچھ نہ کچھ معاوضہ حاصل کرنے کی غرض سے انجام دیتا ہے۔

زمین اور محنت تو پیدائش دولت کے لیے قطعی طور پر ناگزیر ہیں۔ ان کے علاوہ دو عامل اور ہیں جنکو اصطلاح میں اصل اور تنظیم کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ان آخری عاملین کے بغیر دولت کا پیدا ہونا ممکن ہے تاہم زمانہ موجودہ کے پست سے پست ممالک میں بھی جو طریق کار رد بار میں نظر آتا ہے اس کے لیے تھوڑا بہت اصل اور کچھ نہ کچھ تنظیم درکار ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی قوم مہذب و متمدن زندگی بسر کرنا چاہے اور اپنے ملک کی دولت میں حسب دلخواہ اضافہ کرنا چاہے تو زمین اور محنت کی طرح اصل اور تنظیم بھی قطعی طور پر ناگزیر نظر آئینگے۔

اصل

اصل۔۔ ادنی سے ادنی حیثیت کے کاروبار پر بھی نظر ڈالیے تو

قدرتی وسائل اور انسانی جد و جہد کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہما
اس کاروبار میں مشغول نظر آئینگی۔ زراعت میں نہ صرف زرخیزی،
موافق آب و ہوا، کافی بارش اور کاشتکار کی محنت و جانفشانی درکار
ہے بلکہ تخم، کھاد، ہل، بیل، بھی نہایت ضروری ہیں۔ اور اگر جدید طریقوں سے
کام لیا جائے تو بہت سے زرعی آلات اور مشینیں بھی درکار ہوں گی
کسی معمولی حیثیت کے موچی پر نظر ڈالیے، اس کو نہ صرف ایک دکان کی
ضرورت ہے جہاں بیٹھکر وہ محنت کر سکے اور اپنا کاروبار چلا سکے بلکہ
چمڑا، دھاگا، اور کیل جیسی خام پیداوار ہیں اور سوئی، آری، اور
ہتوڑی جیسے آلات و اوزار بھی اس کے لیے بیحد ضروری ہیں۔ اسی طرح
پارچہ بافی کے کسی جدید کارخانے کے لیے زمین و محنت کے علاوہ بہت سی
خام پیداوار اور طرح طرح کے آلات و اوزار اور قسم قسم کی مشینوں
کی ازبس ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ پیدائش دولت کے کاروبار کے لیے
عام ازینکہ وہ قدیم طرز پر چلایا جائے یا اس میں جدید طریقوں سے کام
لیا جائے، بہت سی چیزیں درکار ہوتی ہیں جنکی مدد سے انسان عجلت
اور آسانی کے ساتھ قدرت کے عطیات کو دولت کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے
درزی جتنے کپڑے مشین کے ذریعہ سے سی سکتا ہے ہاتھ سے نہیں سی سکتا مشین
جس عجلت اور صفائی کے ساتھ کپڑا بُن سکتی ہے جولاہا محض ہاتھ سے اس کو انجام
نہیں دے سکتا۔ پس معاشی نقطہ نظر سے ایسی تمام اشیا جو انسان کو دولت
پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں انتہا درجہ اہم ہیں اور انکا اصطلاحی نام اصل

مختصراً ہر ایسی دولت جس سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام لیا جائے اصل کہلاتی ہے۔

تنظیم

تنظیم - اب ہم چوتھے عامل پیدائش یعنی تنظیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تنظیم کا مفہوم واضح کرنے کے لیے ہم پہلے ایک مثال پیش کریں گے۔ فرض کرو کہ ایک بڑھئی کسی موزوں مقام پر ایک چھوٹی سی دکان کرایہ پر لیتا ہے۔ ضروری آلات واوزار اور کچھ لکڑی آبنیں اور لوہے کی پنیاں خریدنے کے لیے وہ محلے کے کسی ساہوکار سے کچھ روپیہ بطور قرض حاصل کرتا ہے۔ زمین اور اصل اس طور پر فراہم کرنے کے بعد وہ اپنی ذاتی محنت سے جو کچھ سامان تیار کرتا ہے اس کو خریداروں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ بڑھئی چونکہ محنتی، دیانت دار اور حوصلہ مند واقع ہوا ہے اس کا کاروبار بتدریج فروغ پانے لگتا ہے سامان کی طلب روز بروز بڑھنے لگتی ہے اور وہ تنہا کام کرکے اس طلب کو پورا نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ دو ایک ہوشیار کاریگروں کو اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے روزانہ اجرت پر نوکر رکھ لیتا ہے۔ ان نئے کاریگروں کے لیے جو کچھ آلات واوزار اور مزید خام پیداوار درکار ہوتی ہے وہ بہم پہنچا لیتا ہے اور اس طرح پر وہ بمقابل پہلے کے زیادہ مقدار میں کاروبار کرنے لگتا ہے۔ اس عرصے میں بڑھئی نے کچھ روپیہ پس انداز کر لیا ہے۔ اور اپنے مال کی روز افزوں طلب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کاروبار میں مزید وسعت کی بہت گنجائش

محسوس کرتا ہے۔ اب وہ اپنی قدیم دکان کے قریب ایک مکان کرایہ
لے لیتا ہے، کچھ جدید طرز کے آلات و اوزار بھی خرید لیتا ہے، چوبینہ
اور دوسری خام پیداوار زیادہ مقدار میں مہیا کرتا ہے اور دس
پندرہ مستعد اور کارگزار بڑھیوں کو نوکر رکھ کر اپنے زیر نگرانی ان سے
کام لینا شروع کرتا ہے اور تیار شدہ مال اپنی قدیم دکان میں ایک قرینے
سے ترتیب دیتا ہے تاکہ لوگ بآسانی اس کے مال کا معاینہ کر سکیں اور
پسند کر کے خرید سکیں کاروبار اس طور پر وسیع ہو جانے سے اب یہ ممکن
نہیں ہے کہ یہ بڑھئی دوسرے کاریگروں کے ساتھ خود بھی میز، کرسی،
یا دوسرا چوبی سامان بنانے میں اپنا وقت صرف کرے اب تو اس کے
وقت کا بہت بڑا حصہ کاریگروں کی نگرانی اور دوسرے انتظامی امور
کی نذر ہو جاتا ہے۔ قسم قسم کی لکڑی اور دوسری خام پیداوار حتی الوسع
ارزاں قیمتوں پر خریدنا، نئے نئے قسم کے آلات و اوزار جو کاروبار چلانے
کے لیے درکار ہوں حسب ضرورت بہم پہنچانا، ہوشیار، محنتی اور دیانتدار
کاریگروں کو منتخب کر کے نوکر رکھنا اور ان سے بہتر سے بہتر طریقہ پر کام
لینا، جو مال تیار ہو اس کے لیے ایسے بازار تلاش کرنا جہاں اچھی سے
اچھی قیمت وصول ہو سکے، مختصر یہ کہ کمترین مصارف سے حتی الوسع بہترین
نتائج حاصل کرنا، یہ ہیں وہ فرائض جن کی طرف اب اس حوصلہ مند
بڑھئی کو ہمہ تن متوجہ ہونے کی ضرورت ہوگی۔ اس کی ساری جد و جہد کا
لب لباب یہ ہے کہ وہ زمین، محنت، اصل ان تینوں عاملین کو ایک

جگہ جمع کرکے میز، کرسی، پلنگ، الماری اور اسی طرح کا دوسرا چوبی
سامان تیار کرتا اور اُسے بازار میں فروخت کے لیے پیش کرتا ہے۔
اگر اس بڑھئی میں اس طور پر کارخانہ چلانے کی قابلیت نہ ہوتی تو یہ
تینوں عاملین نہ اس طرح ایک جگہ جمع ہوسکتے اور نہ اُن سے دو
لت پیدا ہوتی جو اب پیدا ہو رہی ہے۔ جب ایک معمولی کارخانہ چلانے
کے لیے اسقدر اہتمام کی ضرورت ہے تو جن کارخانوں میں سیکڑوں
بلکہ ہزاروں مزدور ساتھ ایک جگہ کام کرتے ہوں، جہاں
لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیوں کا قیمتی اصل مشغول رہتا ہو اور جہاں
ہر روز بڑی بڑی مقداروں میں مال بن بنکر نکلتا ہو وہاں اعلی درجے
کی انتظامی قابلیت کے بغیر کیونکر کام چلسکتا ہے۔ موجودہ زمانے
میں جبکہ پیدائش دولت کے کام بالعموم بڑے پیمانے پر چلتے ہیں اور
دولت پیدا کرنے والوں کے درمیان نہایت زبردست مسابقت جاری
ہے، اس طرح کی کاروباری قابلیت کی اہمیت نسبتاً بہت زیادہ
ہوگئی ہے۔ معاشیین نے اسی اہمیت کو پیش نظر رکھکر پیدائش دولت
کے چار عامل قرار دیے ہیں اور اس چوتھے عامل کو تنظیم کے نام سے
موسوم کیا ہے۔ فی الحقیقت تنظیم ایک قسم کی دماغی محنت ہے لیکن
اس کی غیر معمولی اہمیت اور روز افزوں ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے معاشیین نے
اسے ایک مستقل جداگانہ عامل پیدائش قرار دیا ہے۔ جس طرح آجکل
[illegible]ل کے بغیر پیدائش دولت کا کوئی کام نہیں چلسکتا۔ اسی طرح کاروباری

قابلیت یا تنظیم کے بغیر کوئی ملک اعلیٰ پیمانے پر دولت نہیں پیدا کرسکتا۔

زمین

زمین کے خصوصیات

زمین کے خصوصیات:۔ معاشیات میں زمین سے کیا مراد ہے اور اس کے مفہوم میں کون کون سی اور کس نوعیت کی اشیا شامل ہیں اس کا تفصیلی حال ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ اب ہم زمین کے متعلق چند اور مسائل پیش کریں گے جن سے معاشیات کے ہر طالب علم کو واقف ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم زمین کے خصوصیات اور ان کے نتائج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

زمین کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے لیے قطعی طور پر ناگزیر ہے۔ بڑے پیمانے پر دولت پیدا کرنا یا اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کرنا تو بڑی بات ہے، خود انسان کی بقائے حیات کا مدار زمین پر ہے۔ ہم انسانی ہستی کا تصور ہی نہیں کرسکتے جب تک کہ زمین کا وجود اولاً تسلیم نہ کریں۔

دوسرے یہ کہ قدرت نے زمین کی جو مقدار پیدا کردی ہے اُس میں اضافہ کرنا انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب بہت زیادہ اشخاص کسی چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں اور اس چیز کی مقدار اتنی نہیں ہوتی کہ سب کی خواہش پوری کی جاسکے تو لوگ نفع کما

کی خاطر دریا اس کی مقدار بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن زمین کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آجکل ترقی یافتہ ممالک اور ہندوستان کے بڑے شہروں میں زمین کی کس قدر تنگی ہے لیکن باوجود اس کے انسان کی یہ مجال نہیں کہ اس میں حسب مراد اضافہ کر سکے۔ بعض اوقات سمندر یا تالاب یا جنگل کاٹ کر کچھ سطح زمین نکال لی جاتی ہے یا بعض زمینیں جو وحشی جانوروں یا مہلک امراض کی کثرت کے باعث انسانی آبادی کے لیے غیر موزوں ہوتی ہیں۔ بودوباش کے قابل بنالی جاتی ہیں۔ لیکن زمین کی جو تعریف اوپر بیان ہو چکی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان مثالوں سے کوئی حقیقی اضافہ ثابت نہیں ہوتا۔

کسی چیز کی مقدار میں اضافہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ از سر نو پیدا کی جائے بلکہ اس کو دوسرے مقامات سے جہاں وہ ہو منتقل کر کے بھی مطلب براری کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے انسان اس سہولت سے بھی محروم ہے جس طرح وہ نئی زمین پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ ایک مقام کی زمین دوسرے مقام کو نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آج مفتوحہ اقوام کے ممالک کی زمینیں کھینچ کھینچ کر مغرب کے دولتمند ممالک میں پہنچ جاتیں۔

قلت زمین کا مسئلہ نہایت اندیشہ ناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک کے باشندے اپنے وطنوں کو خیرباد کہکر دور دراز نوآبادیات میں جا جا کر بس رہے ہیں وہ زیادہ تر زمین کی اسی غیر نقل پذیری کا نتیجہ ہے۔

زمین کی ایک اور خصوصیت اس کی قوت پیداآوری کا محدود ہوتا ہے۔ قدرت کی طرف سے زمین میں کچھ ایسے کیمیائی اجزا ودیعت کر دیے گئے ہیں جو پودوں کی پرورش اور نشو ونما کے لیے بیحد ضروری ہیں۔ جب کسی زمین سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے تو ان اجزا میں تخفیف واقع ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ زمین کو کچھ مدت کے لیے بلا کاشت کیے چھوڑ دیا جائے یا اس میں کوئی مناسب حال کھاد ڈالا جائے تاکہ اس کی صرف شدہ قوتیں پھر عود کر آئیں۔ اگر کوئی کسان ان ضروریات کا خیال نہ کرکے کسی قطعہ زمین سے متواتر کام لیتا چلا جائے اور اس میں کسی قسم کا کھاد نہ ڈالے تو آیندہ اس زمین سے حسب سابق پیداوار حاصل نہ ہوگی۔ جس طرح جانوروں کے لیے وقتاً فوقتاً آرام اور چارے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اسی طرح کو بھی حسب ضرورت آرام دینا اور اس میں موزوں کھاد ڈالنا ری اور مفید ہے۔ ورنہ جس طرح جانوروں کا جلد از ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداآوری زمی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کھیت سے جو پیداوار حاصل ہے اس کی مقدار بھی محدود ہے۔ اور اس مقدار سے زاید حاصل ئی کوشش بے سود۔ اگر زمین کی قوت پیدائش محدود نہ ہوتی تو اج ہر ملک میں اس قدر وسیع زمین زیر کاشت نظر نہ آتی۔ بلکہ ہر شخص اپنے حسب منشا کوئی چھوٹا سا قطعۂ زمین لیکر اس پر خوب اصل و محنت

صرف کرتا اور اس سے جسقدر پیداوار چاہتا حاصل کر لیتا۔ مگر فی الحقیقت صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ جیسے جیسے کسی ملک کی آبادی بڑھتی جاتی ہے نئی نئی زمینوں پر کاشت ہونے لگتی ہے۔

قوت پیدا آوری محدود ہونے کے علاوہ زمین پر وقت کی پابندی بھی لازم کر دی گئی ہے۔ مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے مختلف موسم معین ہیں جنکی پابندی ہر کاشتکار پر لازمی ہے۔ اگر کوئی کاشتکار اس خصوصیت کا لحاظ نہ کرے بلکہ خریف کی فصلیں ربیع یا ربیع کی فصلیں خریف میں اگانے کی کوشش کرے تو اُسے حسب دلخواہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ مزید براں ہر ایک فصل کی کاشت کے لیے جو جو وقت درکار ہوتا ہے اُس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔

زمین کی پہلی خصوصیت سے اُس کی شدید ترین ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس سے زیادہ کیا شدید ہو سکتی ہے کہ خود انسان کی بقائے حیات کا اُس پر سراسر انحصار ہے۔ بقیہ جسقدر خصوصیات بیان کی گئیں ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے زمین جیسے اہم عامل پر جس کی ضرورت روز افزوں ہے، طرح طرح کی بندشیں عاید کر کے اُس کی رسد کو بالکل محدود کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر ممالک میں زمین کی قدر و قیمت نہایت سرعت کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے اور جو خوش نصیب اشخاص کسی نہ کسی وجہ سے زمین کے مالک بن گئے ہیں وہ اُس سے خوب منافع کمانے اور اُس کی منہ

الگ قیمتیں پائے ہیں۔ زمین کی قدر و قیمت کے عنوان میں ہم اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

نوٹ۔ زمین سے دنیا میں طرح طرح کے کام لیے جاتے ہیں۔ سکونت اور نقل و حمل، تجارت اور صنعت، کان کنی اور جنگلات ہر ایک کے لیے زمین کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ لیکن اس کی جو اہمیت زراعت میں محسوس ہوتی ہے وہ کسی اور کاروبار میں نظر نہیں آتی۔ پس ہم زمین کے متعلق چند حالات جو خاصکر زرعی نقطۂ نظر سے اہم ہیں کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرینگے۔

کاشت کے طریقے۔ کسی ملک میں کاشتکاری کے کاروبار پر نظر ڈالیے تو دو حالتوں میں سے ایک حالت لازمی طور پر نظر آئے گی۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کاشتکار ایک چھوٹے سے قطعۂ زمین پر خوب اصل و محنت صرف کرکے کثیر سے کثیر پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایک وسیع قطعہ زمین پر تھوڑا سا اصل اور کچھ محنت صرف کرکے کم سے کم مصارف کے ساتھ ضرورت کے لائق پیداوار حاصل کرلے۔ پہلی صورت کو اصطلاح میں کاشتِ عمیق اور دوسری کو کاشتِ وسیع کہا جاتا ہے۔ ان دو طریقوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ کاشتِ عمیق میں کسان بہترین مقدارِ پیداوار نظر رکھتا ہے۔ مصارفِ پیدائش کی اس کو چنداں پروا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کاشتِ وسیع میں، جو چیز خاص طور پر پیش نظر رہتی ہے

کاشت کے طریقے

وہ کمترین مصارف پیدائش ہیں اور مقدار پیداوار کا کچھ زیادہ خیال نہیں کیا جاتا۔ ذیل میں ہر طریقے کی ایک ایک مثال دیجاتی ہے۔

زمین	مصارف پیدائش	مقدار پیداوار	
۱۲ بیگھہ	۴ روپے فی من	۸۰ من	= کاشت عمیق
۱۸ بیگھہ	۳ روپے فی من	۵۰ من	= کاشت وسیع

اب سوال یہ ہے کہ کاشتکار کن حالات میں کون سا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ کاشت عمیق یا وسیع کا اختیار کرنا کاشتکار کی مرضی یا خواہش پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ خاص خاص حالات و اسباب سے متعلق ہے۔ بعض حالات کاشت عمیق کے موافق اور وسیع کے مخالف ہوتے ہیں اور بعض ان کے برعکس۔ کاشتکار کے لیے لازم ہے کہ ان حالات کا لحاظ کرتے ہوے جو طریقہ نفع بخش معلوم ہو اسے اختیار کرے ورنہ اُس کا نقصان اٹھانا یقینی ہے۔

کاشت کے طریقوں پر دو چیزوں کا خاص طور پر اثر پڑتا ہے۔ ایک پیداوار کی قیمت، دوسرے لگان ادا کرنے کا طریقہ۔ ہم ان میں سے ایک ایک سبب کو لیکر طریق کاشت پر اسکا اثر تفصیل کے ساتھ معلوم کرینگے۔

فرض کرو کہ مذکورہ بالا مثال میں پیداوار کی قیمت چھ روپے فی من ہے۔ ایسی حالت میں کاشتکار کو کاشت عمیق سے فی من دو روپے

اور کل ایک سو ساٹھ روپے منافع حاصل ہوگا۔ اور کاشت وسیع سے اگرچہ فی من منافع تین روپیہ ہے، لیکن مجموعی منافع صرف ایکسو پچاس روپے ملیگا۔ ظاہر ہے کہ پیداوار کی اس قیمت پر کاشت عمیق کا طریقہ نسبتاً زیادہ نفع بخش ہوگا۔ فرض کرو کہ قیمت گھٹکر پانچ روپیہ من ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کاشت عمیق سے صرف اسی روپیہ اور کاشت وسیع سے سو روپیہ منافع ملنے لگیگا لہذا کاشتکار بھی اس کے مطابق اپنا طریقہ بدل دیگا یعنی کاشت عمیق کو چھوڑ کر وسیع کا طریقہ اختیار کریگا۔ فرض کرو کہ قیمت بڑھکر سات روپے من ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں کاشت عمیق کا منافع دوسو چالیس اور وسیع کا صرف دوسو روپے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کاشتکار پھر کاشت عمیق کے طریقے پر کاربند ہو جائیگا۔ اسی طرح اگر ہم قیمتوں میں مزید کمی بیشی کر کے تجربہ کرتے جائیں تو معلوم ہوگا کہ جیسے جیسے پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے کاشت عمیق کا فائدہ بھی نسبتاً زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قیمت کی ہر تخفیف سے کاشت وسیع بہ مقابل پہلے کے اور زیادہ نفع بخش ہوتی جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اضافہ قیمت کا اثر کاشت عمیق کے موافق اور کاشت وسیع کے مخالف ہوتا ہے اور تخفیف قیمت کا اثر کاشت وسیع کے موافق اور کاشت عمیق کے مخالف ہوتا ہے۔

قیمت پیداوار کے علاوہ ایک اور سبب جو طریق کاشت پر اپنا

اثر ڈالتا ہے، وہ لگان ادا کرنے کا طریقہ ہے۔ واضح رہے کہ لگان تین طرح پر ادا کیا جا سکتا ہے:۔ ایک بہ حساب منافعہ، دوسرے بہ حساب پیداوار، تیسرے بہ حساب وسعت زمین۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کا طریق کاشت پر کیا اثر پڑتا ہے معلوم کریں گے۔

فرض کرو کہ کاشتکار کو منافع کا پچاس فیصدی حصہ بہ طور لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ مذکرہ بالا مثال میں چھ روپے فی من قیمت کے لحاظ سے کاشت عمیق میں لگان ادا کرنے کے بعد کاشتکار کو جملہ اسی روپے بچ رہتے ہیں اور کاشت وسیع میں صرف پچھتر روپے۔ گویا وہی کاشت عمیق کا طریقہ جو اس طور پر لگان ادا کرنے سے پیشتر مفید تھا اب بھی مفید ہے۔ اگر قیمت گھٹکر پانچ روپے ہو جائے تو کاشت عمیق میں لگان ادا کرنے کے بعد جملہ چالیس روپے ہاتھ آتے ہیں اور کاشت وسیع کا طریقہ جو اس قیمت پر پہلے مفید تھا اب بھی مفید ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بہ حساب منافعہ لگان ادا کرنے سے طریق کاشت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ جو طریقہ قیمت کے زیر اثر نفع بخش ثابت ہوتا ہے وہی لگان ادا کرنے پر بھی مفید رہتا ہے۔

اب ہم اُن کاشتکاروں کی حالت پر غور کریں گے جنھیں مجموعی پیداوار کے حساب سے لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ فرض کرو کہ کاشتکار کو از روئے معاہدہ زمین کی کل پیداوار کا ایک ربع حصہ بطور لگان ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاشتکار کی محنت و جانفشانی کی بدولت

جسقدر مقدار پیداوار میں اضافہ ہوگا اسی قدر لگان کی مقدار بھی بڑھتی جائے گی۔ گویا جو اضافۂ پیداوار محض کسان کی کوششوں کا نتیجہ ہے اس میں زمیندار بھی حصہ بانٹ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کاشتکار کو کاشت عمیق کی طرف ترغیب نہیں ہوگی اور وہ پیداوار کی مقدار میں اضافہ کرنے کا خیال نہ کریگا۔ پس معلوم ہوا کہ بہ حساب پیداوار لگان ادا کرنے کا طریقہ کاشت عمیق کے مخالف ہوتا ہے۔ البتہ اگر پیداوار کی قیمت بہت زیادہ ملنے کی توقع ہو تو ممکن ہے کہ اضافۂ قیمت کا موافق اثر ادائی لگان بہ حساب پیداوار کے مخالف اثر پر غالب آجائے اور کاشتکار کاشت عمیق ہی کا طریق اختیار کرے۔

اب رہے وہ کاشتکار جو وسعت زمین کے لحاظ سے لگان ادا کرتے ہیں مثلاً دو روپیہ فی بیگھہ یا دس روپیہ فی ایکڑ۔ اس حالت میں جسقدر زیادہ زمین کاشت کے لیے حاصل کی جائے گی اُسی قدر لگان کی مقدار بھی بڑھے گی۔ لہٰذا کاشتکار حتی الوسع یہ کوشش کریں گے کہ زمین کی مقدار زیادہ نہ بڑھنے پائے تاکہ ان کا خرچ بہ شکل لگان کم سے کم رہے۔ ایک محدود قطعۂ زمین پر زیادہ سے زیادہ اصل و محنت صرف کرکے جسقدر پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے، اُسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ گویا بہ حساب وسعتِ زمین لگان ادا کرنے کا طریقہ فی نفسہ کاشت عمیق کے موافق اور کاشت وسیع کے منافی ہے۔ لیکن قیمت پیداوار کے اثر کو یہاں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ قیمت اسقدر

گھٹ جائے کہ باوجود لگان بہ لحاظ وسعت زمین ادا کرنے کے کاشت وسیع کا طریقہ ہی نفع بخش ثابت ہو۔

زرخیزی کا مفہوم۔ زرخیزی کے متعلق یہ ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ ہم جس زمین کو زرخیز سمجھتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے زرخیز ہو۔ اسی طرح آج جو زمین غیر زرخیز نظر آتی ہے ممکن ہے کہ آیندہ وہ بہت زرخیز بن جائے۔ بالفاظ دیگر زرخیزی زمین کی کوئی مقررہ صفت نہیں ہے بلکہ وہ مختلف حالات کے ساتھ وابستہ ہے۔

بعض زمینیں کاشت کی بہت زیادہ متحمل ہوسکتی ہیں یعنی اُن پر کافی اصل ومحنت صرف کرکے کثیر مقدار میں پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے دوسری زمینوں پر یہ ممکن نہیں ہوتا۔ یعنی اُن سے ایک محدود مقدار میں پیداوار حاصل ہوتی ہے اور اصل ومحنت کے اضافے سے مقدار پیداوار میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ پس کاشت عمیق کے نقطۂ نظر سے پہلی قسم کی زمینیں زرخیز اور دوسری قسم کی غیر زرخیز کہلائینگی۔

بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن پر تھوڑا سا اصل اور معمولی محنت صرف کرنے سے تھوڑی بہت پیداوار حاصل ہو جاتی ہے دوسری زمینوں پر یہ ممکن نہیں ہوتا۔ یعنی جب تک کہ اُن پر کافی مقدار میں اصل اور محنت خرچ نہ کی جائے اُن سے کوئی پیداوار نہیں ملتی۔ پس کاشت وسیع کے نقطہ نظر سے پہلی زمین زرخیز اور دوسری غیر

زرخیز یا کم زرخیز کہلائے گی۔

اس کے علاوہ زمین کی زرخیزی کا انحصار بہت کچھ فصل کی نوعیت پر بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مختلف مقامات کی زمینیں مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ برار کی روئی، پنجاب کے گیہوں، اور بنگال کا جوٹ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جو زمین خاص کر روئی کی کاشت کے لیے موزوں ہے، اگر اُس پر گیہوں بوئے جائینگے تو حسب دلخواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر ایکھ والی زمین پر روئی اگائی جائے یا گیہوں والی زمین پر چاول پیدا کیے جائیں تو جسقدر بہتر نتائج حاصل ہونے چاہئیں، نہ ہوں گے۔ مختصر یہ کہ زرخیزی کا تعلق بہت بڑی حد تک فصلوں کی نوعیت سے بھی ہے۔ اور جو زمین ایک فصل کے لحاظ سے زرخیز ہوتی ہے، وہی دوسری فصل کے لحاظ سے غیر زرخیز ثابت ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات پیداوار کی قیمت میں کمی بیشی ہونے سے بھی زمین کی زرخیزی متاثر ہوتی ہے۔ پیداوار کی قیمت بڑھ جانے سے بعض غیر زرخیز زمینیں زرخیز شمار ہونے لگتی ہیں۔ اسی طرح قیمت گھٹ جانے سے بعض زرخیز زمینیں غیر زرخیز نظر آنے لگتی ہیں۔

پس یاد رکھنا چاہیے کہ زرخیزی زمین کی کوئی مقررہ صفت نہیں ہے بلکہ وہ ایک اضافی کیفیت ہے جو خاصکر تین حالتوں سے متعلق ہوتی ہے: ایک طریق کاشت، دوسرے نوعیت فصل یا تیسرے اضافہ قیمت۔

نوٹ:۔ واضح رہے کہ انسان اپنے معلومات کی مدد سے غیر زرخیز زمینوں کو زیادہ زرخیز بنا سکتا ہے۔ زمین کی ذاتی زرخیزی کا مدار خاصکر دو چیزوں پر ہوتا ہے:۔ ایک زمین کی ساخت، دوسرے ان اجزا کی کمی بیشی جو پودوں کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ ساخت کے لحاظ سے وہی زمین اچھی سمجھی جاتی ہے جو نہ ضرورت سے زیادہ سخت ہو اور نہ بجد نرم۔ چنانچہ کھیت جوتنے کا منشا ہی یہ ہوتا ہے کہ زمین میں بہ لحاظ ساخت کے جو کچھ نقائص ہوں انھیں دور کیا جائے اسی طرح جن زمینوں میں پودوں کی غذا کے اجزا ناقص حالت میں ہوں وہ اچھی نہیں خیال کی جاتیں۔ اور اس نقص کو دور کرنے کی جو صورت عام طور پر اختیار کی جاتی ہے وہ کھادوں کا استعمال ہے۔ چنانچہ آجکل یورپ میں کھاد سازی کا فن نہایت ترقی یافتہ حالت میں نظر آتا ہے۔ کھاد سازی کے بڑے بڑے کارخانے قایم ہیں، جہاں مختلف پودوں اور مختلف زمینوں کے لیے ان کے مناسب حال کھاد تیار کیے جاتے ہیں۔

قانون تقلیل حاصل

قانون تقلیل حاصل:۔ زمین کے خواص کے تحت میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ قدرت نے زمین کی قوت پیدا آوری محدود کر دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی زمین سے جو زرعی پیداوار حاصل کر سکتے ہیں، اس کا مدار نیٹروجن، پوٹاسیم وغیرہ جیسی اشیا کی مقدار پر ہوتا ہے جو پودوں کی غذا کا کام دیتے اور ان کی نشو و نما کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔

جن زمینوں میں یہ اجزا افراط سے پائے جاتے ہیں وہ زرخیز سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اُن سے مقابلتہً زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جن زمینوں میں اِن اشیاء کی کمی ہوتی ہے وہ زیادہ کاشت کی متحمل نہیں ہوسکتیں اور نہ ہم اُن سے کثیر مقدار میں پیداوار حاصل کرسکتے ہیں غرض یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر زمین میں پیداآوری کی قوت محدود ہے۔ اور اسی قوت کی مناسبت سے بعض زمینیں زیادہ کاشت کی متحمل ہوتی ہیں اور بعض کم کی۔ بالفاظ دیگر بعض زمینوں پر ہم زیادہ اصل ومحنت صرف کرکے مقدار پیداوار میں بہت کچھ اضافہ کرسکتے ہیں اور بعض زمینوں پر نہیں کرسکتے۔ لیکن باوجود اس فرق کے کوئی زمین قانون تقلیل حاصل کے عمل سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کوئی قطعہ زمین خواہ کتنا ہی زرخیز ہو اگر اسپر اصل ومحنت کی مقدار میں متواتر اضافہ کیا جائے تو بہت جلد ایک ایسی حد آپہنچتی ہے۔ جس کے بعد ہر مزید اصل ومحنت کے معاوضے میں بہ مقابل سابق کے تخفیف ہونے لگتی ہے جس زمین کی پیداوار میں اس طرح کی تخفیف نمودار ہو سمجھ لینا چاہئے کہ اسپر قانون تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوگیا ہے۔

اب ہم ایک مثال کے ذریعے سے اِس قانون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرینگے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کاشتکاری متعدد کاموں کا مجموعہ ہے۔ کھیت جوتنا، بونا، نرانا، اور پانی لگانا یہ سب کاشتکاری میں شامل ہیں۔ آسانی کی غرض سے ہم ان میں سے

ہر ایک کام کو ایک جداگانہ جرعہ اور ہر جرعے کی لاگت مساوی تصور
کریں گے۔ فرض کرو کہ کاشتکار کسی مناسب ترکیب سے اپنے کھیت پر
سات جرعے صرف کرتا ہے اور اس کو کل پینتیس من یا فی جرعہ پانچ من
پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اصل محنت کے اضافے کے ساتھ ساتھ
مقدار پیداوار میں جو جو اضافہ ہوتا ہے اس کو ہم ایک تختے کی شکل
میں پیش کرتے ہیں:-

٧ جرعے	٣٥ من پیداوار	فی جرعہ ۵ من
١٠ 〃	٥٣ 〃	〃 مزید ٦ من
١٢ 〃	٦٦ 〃	〃 〃 ٧ 〃
١٣ 〃	٧٣ 〃	〃 〃 ٦ 〃
١٤ 〃	٧٨ 〃	〃 〃 ۵ 〃
١۵ 〃	٨٢ 〃	〃 〃 ۴ 〃
١٦ 〃	٨۵ 〃	〃 〃 ٣ 〃
١٧ 〃	٨٧ 〃	〃 〃 ٢ 〃
١٨ 〃	٨٨ 〃	〃 〃 ١ 〃
١٩ 〃	$٨٨\frac{١}{٢}$ 〃	〃 〃 $\frac{١}{٢}$ 〃
٢٠ 〃	$٨٨\frac{٣}{۴}$ 〃	〃 〃 $\frac{١}{۴}$ 〃

مندرجۂ بالا تختے پر نظر ڈالنے سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ
بارہویں جرعہ تک ہر نئے جرعہ کی پیداوار سابقہ جرعوں کی پیداوار

کے مقابلے میں بڑھتی جاتی ہے گویا بارہویں جرعہ تک تو تکثیر حاصل جاری رہتا ہے اور اس کے بعد تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ زراعت عام طور پر تقلیل حاصل کے تابع رہتی ہے اور تکثیر حاصل کا اُس میں بہت کم ظہور ہوتا ہے۔ جب کسی زمین کی قوت پیداآوری زیادہ ہو اور جو اصل و محنت اُس پر صرف ہو رہی ہے وہ بہ لحاظ اس کی قوت پیداآوری کے ناکافی ہو تو ایسی زمین پر مزید اصل و محنت صرف کرنے سے کچھ دیر کے لیے تکثیر حاصل کا عمل ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ عمل محض عارضی ہوتا ہے اور چند ہی جرعوں کے بعد زمین کی قوت پیداآوری حد کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اصل و محنت کے جو جرعے صرف ہوتے ہیں اُن کی بدولت مقدار پیداوار میں اُسی رفتار سے اضافہ نہیں ہوتا جس رفتار سے کہ اب تک ہو رہا تھا بلکہ ہر مزید جرعہ کی پیداوار سابقہ جرعوں کی پیداوار سے کم رہتی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا مثال سے ظاہر ہے۔ زرعی کاروبار کے اس واقعے کو اصطلاحِ معیشت میں قانون تقلیل حاصل کہتے ہیں۔

بعض اوقات جدید طرز کے آلات و اوزار استعمال کرنے سے یا اسی طرح کی دوسری زرعی اصلاحات و ترقیات کی بدولت تقلیل حاصل کا عمل موقوف ہو کر پیداوار تکثیر حاصل کے مطابق ملنے لگتی ہے بالفاظ دیگر جو زمینیں قدیم طریقوں کے مطابق زیادہ کاشت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں اُن پر نئے طریقوں کی مدد سے مقابلۃً بہت

زیادہ اصل و محنت صرف کرکے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتے ہیں لیکن اگر انہی جدید طریقوں کے مطابق کام لیکر ہم جزوں کی تعداد میں برابر اضافہ کرتے جائیں تو پھر ایک حد ایسی آئے گی جس کے بعد دوبارہ تقلیل حاصل کا عمل شروع ہو جائیگا۔ گویا تقلیل حاصل کا عمل جو قدیم طریقوں سے کام کرنے کی حالت میں جلد شروع ہو جاتا تھا جدید طریقوں کو کام میں لانے کی وجہ سے کسی قدر دیر سے شروع ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ زرعی ترقیات کی وجہ سے کوئی زمین تقلیل حاصل کے اثر سے ہمیشہ کے واسطے مستثنیٰ نہیں ہو جاتی بلکہ صرف عارضی طور پر وہاں تقلیل حاصل کا عمل ملتوی ہو جاتا ہے اور اگر مزید ترقیات ظہور پذیر نہ ہوں تو اصل و محنت کی اضافے سے پھر تقلیل حاصل کا عمل شروع ہو جانا یقینی ہے۔

قانون تقلیل حاصل کے متعلق ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاشتکار کے طرز عمل پر اس قانون کا کیا اثر پڑتا ہے۔ کیا تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوتے ہی کاشتکار اپنا کاروبار ختم کر دیتا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ بالفاظ دیگر قانون تقلیل حاصل اور اختتام کاشت میں کیا تعلق ہے؟

ظاہر ہے کہ لوگ قسم قسم کے کاروبار میں جو سرمایہ لگاتے اور اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں تو اُن کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اس سے کچھ منافع حاصل کریں۔ ہر شخص کو یہ توقع ہوتی ہے کہ بازار میں اُس کی تیار کردہ اشیا کی اتنی قیمت وصول ہو جائے گی کہ جملہ مصارف نکلنے کے بعد اُس کے لیے کچھ رقم بطور منافع بچ رہے گی ورنہ کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ کاروبار کے جنجال میں خواہ مخواہ اپنی جان کھپائے۔ کسان بھی جو سخت محنت برداشت کرکے کاشتکاری کا کاروبار چلاتا ہے

یہ جانتا ہے کہ بازار میں اُسے اپنی پیداوار کی اتنی قیمت وصول ہو جائیگی
جس سے جملہ مصارفِ پیدائش بہ آسانی نکل آئیں گے۔ اگر اسقدر
قیمت ملنے کی توقع نہ رہے تو وہ یقیناً اپنے مصارف پیدائش میں
تخفیف کرنے اور پیداوار کی مقدار گھٹانے کی کوشش کریگا تاکہ اُسے
کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے
پیداوار کی قیمت بہت بڑھ جائے تو اُسے اپنے کاروبار میں خوب
اصل و محنت لگا کر زیادہ پیداوار اگانے کی ترغیب ہوگی تاکہ اعلیٰ قیمتوں سے
خوب منافع کمائے۔ پس معلوم ہوا کہ کاشت ختم کرنے یا نہ کرنے کا انحصار
سراسر پیداوار کی قیمتوں پر ہوتا ہے۔ قانون تقلیل حاصل سے اس کو کوئی
تعلق نہیں۔ اگر بازار میں قیمتیں اعلیٰ مل رہی ہوں تو باوجود تقلیل حاصل کا
عمل ہونے کے کاشتکار کاروبار جاری رکھے گا اور مزید اصل و محنت صرف
کرنے میں پس و پیش نہ کریگا۔ اس کے برعکس پیداوار کی قیمت کافی
نہ ملنے کی وجہ سے بہت ممکن ہے کہ کسان باوجود تکثیر حاصل کے کاشت
ختم کردے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں اگر لاگت فی جریب دس روپے
اور قیمت پیداوار فی من پانچ روپیہ فرض کریں تو سترھویں جریب پر پہنچکر
جریب کی لاگت اور پیداوار کی قیمت دونوں ایک دوسرے کے مساوی
ہو جاتے ہیں لہذا یہی اختتام کاشت کی حد ہوگی (۱) کیونکہ اگر اس کے بعد

(۱) کاشت کرنے میں زمین پر اصل و محنت کی جو مقدار صرف کی جاتی ہے اُس کے
(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

کسان اٹھارواں جرعہ بھی لگائے تو اس کو دس روپے تو خرچ کرنے پڑیں گے، لیکن پیداوار کی قیمت سے صرف پانچ روپے وصول ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس طرح نقصان اٹھا کر کاروبار جاری نہیں رکھیگا۔ توجہ طلب یہ امر ہے کہ قانون تقلیل حاصل کا عمل تو تیرہویں جرعے ہی سے شروع ہو گیا تھا، لیکن کسان نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور سترہویں جرعے تک برابر اصل و محنت میں اضافہ کرتا رہا۔ اور اس کا یہ طرز عمل کسی طرح خلاف عقل نہیں کہا جاسکتا اسی طرح اگر پیداوار کی قیمت میں اسقدر تخفیف ہو جائے کہ کسان کو اپنے جرعوں کی لاگت بھی وصول نہ ہو سکے تو وہ یقیناً کاشت ختم کر دیگا خواہ اُس کی زمین پر تکثیر حاصل ہی کا عمل جاری رہے۔

مختصر یہ کہ اختتام کاشت کو تقلیل حاصل سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار کلیتاً پیداوار کی بازاری قیمت پر ہے۔ اگر قیمت میں اضافہ ہو تو کاشتکار اپنی زمین پر اصل و محنت کے مزید جرعے لگانے کی کوشش کریگا اور اس طرح اختتام کاشت کی حد اور آگے بڑھ جائیگی

مجموعے کو ہم آسانی بیان کی خاطر چند مساوی لاگت والے جرعوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اب جس جرعے سے کاشتکار کو اتنی پیداوار حاصل ہو کہ اس سے صرف جرعے کی لاگت نکل آئے اور بس اُسے اصطلاح میں جرعہ مختتم کہتے ہیں۔ جرعہ مختتم کی بدولت جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اسے پیداوار مختتم کہتے ہیں اور کاشت کی اس حالت کو **اختتام کاشت** کہا جاتا ہے۔

اس کے برعکس اگر قیمت میں تخفیف ہو تو موجودہ چراگاہوں کی تعدادیں بھی کمی کر دی جائے گی اور اس طرح اختتام کاشت کی حد مقابلتہً جلد پہنچ جائے گی۔

زمین کی قدر و قیمت

زمین کی قدر و قیمت ۔ زمین کے خصوصیات کے عنوان میں ہم اضافۂ قیمتِ زمین کی طرف مختصراً اشارہ کر چکے ہیں۔ اب کسی قدر تفصیل کے ساتھ اُن اسباب کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں جو خاصکر زمانۂ موجودہ میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ زمین کی قیمت بڑھا رہے ہیں۔

اضافۂ قیمتِ زمین کے اسباب کو ہم دو شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک شعبے میں وہ اسباب شامل ہیں جن کا تعلق زمین کی اُن خصوصیات سے ہے جو قدرت کی طرف سے اُس پر عاید کر دی گئی ہیں۔ یعنی مقدار، غیر نقل پذیری، محدود قوت پیدا آوری اور پابندی وقت، ایک طرف تو یہ مختلف رکاوٹیں زمین کی رسد کو انتہا درجے معین و محدود کر دیتی ہیں اور دوسری طرف جیسے جیسے دنیا کی آبادی میں اضافہ اور انسان کے معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے، زمین کی طلب روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جب کسی چیز کی رسد محدود، اور طلب ناگزیر و روز افزوں ہو۔ بالفاظ دیگر جب کسی چیز کی مقدار تو معین ہو لیکن اس کے خواہشمندوں کی تعداد لا محدود، تو ایسی چیز کی جسقدر بھی قدر و منزلت کی جائے بجا اور اس کی جو کچھ بھی قیمت مانگی جائے مناسب ہے۔ پس بہ حیثیت مجموعی زمین کی قدر و

قیمت کے متواتر اضافے کا راز ایک حد تک انھی مستقل اور دوامی اسباب میں مضمر ہے، جنھیں ہم قدرتی خصوصیات کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن زمانۂ موجودہ میں ان قدرتی خصوصیات کے علاوہ بہت سے حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جنکا میلان زمین کی قدر و قیمت بڑھانے کی طرف نہایت قوی ہے۔ اختصار کے لیے ہم اِن حالات کو جدید ترقیات کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جدید ترقیات کیا ہیں اور ان کا زمین کی قدر و قیمت پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟

واضح رہے کہ جدید ترقیات کا ایک بہت بڑا شعبہ آجکل ذرایع نقل و حمل اور وسائل خبر رسانی سے متعلق ہے۔ گذشتہ چند سال کے اندر پیدائش دولت کے اس اہم شعبے میں انسان نے جو عظیم الشان ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہزاروں میل کی خبریں چند منٹوں میں معلوم کر لینا، لاکھوں من بوجھ دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک چند دنوں میں پہنچا دینا، سائنس کی ترقی کے یہ ادنی کرشمے ہیں اس قسم کی ترقیات کا زمین کی حالت پر جو اثر پڑنا چاہیئے وہ بدیہی ہے۔ دور دراز ممالک کی زمینیں جو اب تک یا تو بالکل بیکار پڑی ہوئی تھیں یا اُن سے صرف مقامی ضروریات کے لایق استفادہ کیا جاتا تھا اب نہایت کارآمد بلکہ ناگزیر بنجاتی ہیں، اور اُن سے کام لینے کے بیسیوں طریقے نکل آتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جن زمینوں کی طرف کبھی لوگ التفات کر کے بھی نہیں دیکھتے تھے یکایک اُن کی مونھ مانگی قیمتیں ملنے لگتی ہیں۔

اگر ہندوستان میں ریلیں نہ ہوتیں اور جہاز رانی کے ذریعے اس
ملک کا دوسرے ممالک کے ساتھ تعلق قایم نہ ہو جاتا تو آج نہ بنگال
میں اسقدر سن پیدا کیا جاتا، نہ برار میں اس کثرت سے روئی اگائی جاتی
اور نہ روغندار تخم کاشت کرنے کے لیے زمین کی ایسی شدید طلب
ہوتی - یہی نہیں بلکہ خود ہندوستان کے مختلف صوبے ایک دوسرے کی
پیداواروں سے اس کثرت کے ساتھ مستفید نہ ہو سکتے - اور ہر
علاقے کو زیادہ تر اپنی مقامی پیداواروں پر قانع رہنا پڑتا - مقامی
ضروریات پورا کرنے کے لیئے جسقدر زمین درکار ہوتی، زیر کاشت
لائی جاتی اور بقیہ زمینیں بیکار پڑی رہتیں -

ترقیات جدید کا ایک اور شعبہ جو ہمارے زیر غور مضمون سے
متعلق ہے، وہ ذرایع آبپاشی کی ترقی ہے - زراعت کے لیے پانی کی
جیسی کچھ شدید ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں - آبپاشی کے
بغیر زراعت کا مدار کلیتاً بارش پر رہتا ہے - اگر ٹھیک
ضرورت کے لایق بارش ہو گئی فبہا ورنہ زراعت کا سرسبز ہونا محال
زراعت کو اسی غیر یقینی حالت سے محفوظ رکھنا اور جہاں تک ممکن
ہو سکے زرعی کاروبار کو بارش کی احتیاج سے مستغنی کر دینا، یہی آبپاشی کا
اصلی مقصد ہوتا ہے - چنانچہ ہمارا تجربہ ہے کہ جن جن مقامات پر ذرایع
آبپاشی میں توسیع ہوتی جاتی ہے، وہاں کی بیکار زمینیں کار آمد اور
کار آمد زمینیں مزید کار آمد بنتی جاتی ہیں، اور اس طرح آس پاس کی

زمینوں کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اضافۂ قیمت کا ایک اور اہم سبب پیدائش دولت کے طریقوں کی وہ عظیم الشان تبدیلی ہے جو مشین کی ایجاد کا نتیجہ ہے۔ آجکل دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں تقسیم عمل کا رواج، مشین کا استعمال اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا طریق روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ ان جدید طریقوں کی بدولت عمدہ قسم کا مال کثیر مقدار میں کم سے کم مصارف کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے۔ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی وجہ سے عاملین پیدائش اور ہر قسم کی خام پیداواریں بڑی بڑی مقداروں میں مطلوب ہوتی ہیں۔ بہت سی زرعی پیداواریں جنکا ان ایجادات سے قبل کوئی مصرف نہ تھا اب کام میں آرہی ہیں اور اُن کو پیدا کرنے کے لیے نئی نئی زمینیں زیر کاشت لائی جاتی ہیں۔ جنگلات کی بے شمار پیداواریں اور کثیر التعداد معدنیات، جو چند سال پیشتر بالکل بیکار سمجھی جاتی تھیں آج قومی دولت کا ایک بیش بہا عنصر تصور کی جاتی ہیں۔ اسی طرح قسم قسم کے نباتات اور طرح طرح کی حیوانی پیداواروں سے آج جو جو کام لیئے جاتے ہیں، وہ ان ایجادات سے قبل بالکل نامعلوم تھے۔ مختصر یہ کہ زمانۂ حال کی نئی ایجادات اور پیدائش دولت کے جدید طریقوں کی وجہ سے زمین کے نئے نئے مصرف نمودار ہو رہے ہیں اور بیکار زمینیں کار آمد بن کر اُن کی قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

زراعت، جنگلات اور معدنیات کے علاوہ زمین سکونتی اغراض کے لیے

بھی مطلوب ہے ۔ اور سکنی زمینوں کی قیمت بہت کچھ اُن کی جائے وقوع کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے ۔ دیہات کے مقابل قصبات میں اور قصبات کے مقابل شہروں میں زمین کی جو بڑھ بڑھ کر قیمتیں ادا کی جاتی ہیں اُس کا باعث سراسر اُن زمینوں کا موقعہ محل ہے ۔ خود شہر کے اندر مختلف مقامات کی زمینوں کی قدر و منزلت مختلف ہوتی ہے کاروبار کے مرکزوں پر زمین کی جو قیمت طلب کی جاتی ہے وہ دوسری زمینوں کو میسر نہیں ہو سکتی ۔ وجہ صاف ظاہر ہے ۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے کاروبار سے قریب رہے تاکہ آمد و رفت کی زحمت یا اس کے مصارف کا بار اٹھانا نہ پڑے ۔ مزید برآں خود کاروبار چلانے کے لیے خاص خاص مقامات مقابلتہً زیادہ موزوں ہوتے ہیں ۔ لھذا ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اُس کو بھی اپنے کاروبار کے لیے انہی مخصوص مقامات میں سے کسی مقام پر حسب ضرورت جگہ ملجائے ۔ ظاہر ہے کہ جب ایک محدود رقبے کے اندر ہر شخص کچھ نہ کچھ جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے تو ایسی زمین کا جسقدر بھی معاوضہ طلب کیا جائے حق بجانب ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ و امریکہ کے بعض بعض شہروں میں بارہ بارہ اور سترہ سترہ ہزار روپیہ فی گز تک زمین فروخت ہو چکی ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ شہروں کی کثرت اور توسیع بھی اضافہ قیمت زمین کا ایک بڑا باعث ہے ۔

نوٹ ۔ یہاں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

زمین کی قیمت میں ان گوناگوں اسباب کی وجہ سے جو غیر معمولی اضافہ
ہو رہا ہے اس کا واجبی حقدار کون ہے؟ مالکِ زمین کو اس اضافہ
قیمت کا مستحق سمجھنے میں اس وجہ سے تامل ہوتا ہے کہ وہ قطعاً
اس کی کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ مالک زمین گھر بیٹھے نہایت آرام
کے ساتھ لگان کی آمدنی پر زندگی بسر کرتا ہے جو بغیر اس کی کسی جدوجہد
کے محض زمین کے قدرتی خصوصیات اور ملک کے معاشی ترقیات کی بدولت
روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔ اضافۂ آبادی، ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر،
تیز رفتار ذرایع آمدورفت کی ترقی، آبپاشی کی توسیع، جنگلات و معدنیات
سے استفادہ، ان گوناگوں اجتماعی ترقیات کی وجہ سے زمین کی قدر
قیمت میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے مگر سوسائٹی کا صرف ایک محدود
طبقہ خود کوئی خدمت انجام دیے بغیر اس تمام اضافے کا مالک بن بیٹھتا ہے،
لہٰذا واجبی طور پر یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ زمین کی قیمت کا اضافہ
اس کے واجبی حقداروں یعنے تمام باشندگان ملک کو ملے نہ کہ صرف
زمینداروں کو۔ اور اس کے لیے جو انتہائی تجویز پیش کی جاتی ہے
وہ یہ ہے کہ زمین کو خانگی افراد کی ملکیت سے نکال لیا جائے اور اُسے
بحیثیت مجموعی تمام قوم کی ملک قرار دیا جائے۔ بالفاظ دیگر جملہ زمین کی
مالک صرف حکومت ہو۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ سے تمام قوم قیمت زمین کے
غیر معمولی اضافے سے مستفید ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اسقدر سخت تدبیر اختیار
کرنا پسند نہیں کرتے وہ دوسری ترکیبوں سے زمینداروں کو مجبور

کرتے ہیں کہ قیمتِ زمین کے اضافے کا کم از کم ایک حصہ تمام باشندگانِ ملک کے لیے علیحدہ کر دیں۔ چنانچہ زمینوں اور مکانوں پر محصول لگانے کی بالعموم یہی غرض ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ اضافۂ قیمتِ زمین کا مسئلہ موجودہ زمانے میں ایک اہم سیاسی و معاشی مسئلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے اثرات صرف کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہیں بلکہ بین الاقوامی سیاسیات پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں ہم اس کی طرف صرف ایک سرسری اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

محنت میں وہ تمام دماغی اور جسمانی کام شامل ہیں جو انسان کچھ نہ کچھ آمدنی حاصل کرنے کی غرض سے انجام دیتا ہے، عام ازیں کہ وہ زر کی شکل میں حاصل ہو یا اشیا کی شکل میں۔ بہت سے کام تفریحاً یا حظ و لطف کی خاطر یا صحت برقرار رکھنے کے لیے یا محض ثواب آخرت کے خیال سے سخت سے سخت مشقت برداشت کرکے انجام دیے جاتے ہیں۔ مثلاً کرکٹ یا دوسرے میدانی کھیل کھیلنا، صبح سویرے کئی کئی میل کی مسافت پیدل طے کرنا، کشتی کھینا، عبادت و ریاضت میں وقت بسر کرنا، ان میں سے کوئی کام معاشی نقطۂ نظر سے محنت نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس کا منشا حصول آمدنی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کرکٹ کا ماہر کسی رئیس کے پاس کرکٹ کھیلنے کے لیے نوکر ہو تو اس کا کرکٹ کھیلنا بلاشبہہ معاشی محنت میں داخل ہے۔ کیونکہ وہی اس کے کسب معاش اور حصولِ آمدنی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح خطوط تقسیم کرنے کے لیے کسی ڈاکیہ کا میلوں چلنا، یا مچھلیاں پکڑنے کے لیے کسی مچھیرے کا گھنٹوں کشتی کھینا اور پانی میں کھڑا رہنا، خالص معاشی محنت ہے۔ گویا ایک ہی نوعیت کا کام اگر وہ حصول آمدنی کی غرض سے کیا جائے تو محنت ہے

اور اگر کسی اور نیت سے انجام دیا جائے تو محنت سے خارج ہے۔

محنت کے خصوصیات۔ محنت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مزدور سے جدا نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اصل اصلدار سے اور زمین زمیندار سے علٰحدہ رہکر بھی پیدائش دولت میں اپنا کام انجام دیتی ہے اسی طرح محنت مزدور سے جدا ہو کر دولت پیدا نہیں کر سکتی زمینیں تو بالعموم دیہات میں واقع ہوتی ہیں، لیکن زمیندار اپنی اپنی زمینوں سے کوسوں دور شہروں اور قصبات میں عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اصل کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔ مثلاً عثمان شاہی ملز میں جسقدر سرمایہ لگا ہوا ہے وہ کام تو کر رہا ہے نا ندیڑ میں لیکن اس کا سرمایہ بہم پہنچانے والے یا بالفاظ دیگر اس کے اصلدار حیدرآباد اور بمبئی کے مختلف علاقوں میں منتشر اپنا اپنا کاروبار انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح ٹاٹا کا مشہور لوہے اور فولاد کا کارخانہ اور اس کا کروڑوں روپے کا سرمایہ جمشید پور میں مصروفِ کار ہے۔ لیکن اس کے حصہ دار سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے اکثروں نے نہ کبھی کارخانہ کی صورت دیکھی ہوگی اور نہ کاروبار چلانے والے اشخاص سے واقف ہوں گے۔ انگلستان کے اصلدار اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہندوستان اور برطانوی نوآبادیات کے اندر طرح طرح کے کاروبار میں اپنا سرمایہ لگاتے اور خوب منافع کماتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی ریلیں زیادہ تر انھیں کے سرمایے سے جاری ہوئی ہیں۔

محنت کے خصوصیات

نوٹ۔ بعض صورتوں میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محنت مزدور سے جدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً خط و کتابت کے ذریعے طبیب علاج کر سکتا ہے، وکیل قانونی مشورہ دے سکتا ہے، پروفیسر مطالب سمجھا سکتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان مثالوں میں بھی محنت مزدور سے جدا ہو کر کام نہیں کرتی، بلکہ طبیب جہاں موجود ہوتا ہے، وہیں غور و فکر کر کے خود ہی نسخہ لکھتا ہے، یا اپنے کسی محرر سے لکھوا کر روانہ کر دیتا ہے۔ یہی حال وکیل اور پروفیسر کا ہے۔ مزدور سے جو چیز علحدہ ہوتی ہے وہ دراصل خود محنت نہیں بلکہ محنت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ لنکاشائر کے مزدور محنت کر کے کپڑا تیار کرتے ہیں اور ہم اُن کی محنت کے نتیجہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ہندوستانی کاشتکاروں کی محنت سے روئی اُگتی ہے اور انگلستان کے کارخانہ دار اس محنت کے نتیجے سے مستفید ہوتے ہیں۔

(۲) محنت کی دوسری خصوصیت اُس کی نقل پذیری ہے۔ جہاں تک نقل پذیری کا تعلق ہے محنت کی حالت زمین اور اصل کے بین بین ہے۔ نہ تو وہ زمین کی مانند قطعاً غیر منقولہ ہے اور نہ اصل کے برابر نقل پذیر۔ منتقل تو ضرور ہو سکتی ہے، لیکن مزدور کے ساتھ ساتھ۔ اور مزدور کا منتقل ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے متعلق ہم آگے چل کر محنت کی نقل پذیری کے عنوان میں کسیقدر مفصل کیفیت پیش کریں گے۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ محنت میں مزدور کی مرضی کو

بہت بڑا دخل ہے۔ زمین اور اصل ہر ایک سے کام لینے کے خاص خاص اصول مقرر ہیں جن کے مطابق کام کرنے سے کم و بیش معینہ نتائج حاصل ہونا یقینی ہے۔ محنت کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ کام کا بگاڑنا یا سدھارنا بہت کچھ مزدور کے اختیار میں ہے۔ مزدور اگر بد دل ہو جائے تو بآسانی کام خراب کر سکتا ہے اور اگر دل لگا کر کام کرے تو نہایت عمدہ نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل طرح طرح کی ترکیبوں سے مزدوروں کو خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور تجربہ بھی شاہد ہے کہ ادنی اجرت پانے والے مزدور درحقیقت ارزاں ثابت نہیں ہوتے اور نہ اعلی اجرتیں پانے والے لازمی طور پر گران ثابت ہوتے ہیں۔

(۴) محنت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اصلاح و ترقی پر بالعموم بہت کم روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ لوگ جس شوق سے زمین اور اصل میں بے دریغ سرمایہ لگاتے ہیں، محنت میں نہیں لگاتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر وہ زر کثیر صرف کر کے باغ لگائے، یا رہنے کے لیے کوئی مکان تعمیر کرے، یا مشینیں وغیرہ خرید کوئی کارخانہ جاری کرے، یا کسی چیز کی تجارت شروع کرے تو اسے اپنے سرمایہ کا ضرور کچھ نہ کچھ معاوضہ حاصل ہوگا، عام ازیں کہ وہ رفع احتیاجات کے طور پر ہو یا حصول آمدنی کی صورت میں۔ گویا حصول منفعت کی خاطر لوگ زمین و اصل پر بلا تامل روپیہ صرف کرتے رہتے ہیں۔ لیکن محنت کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں حصول منفعت

ونی محرک قوت موجود نہیں ہے ۔ باشندوں کی تعلیم پر روپیہ صرف ہونے کا واحد ذریعہ ماں باپ کی فطری محبت ہے جو اولاد کی آیندہ فلاح و بہبودی کی خاطر بسا اوقات دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں ۔ لیکن اس کا امکان بھی متعدد شرائط کے تابع ہے ۔ اول تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ماں باپ صاحب استطاعت ہوں ورنہ باوجود فطری محبت کے وہ اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتے ۔ دوسرے تعلیم کے فواید کا انھیں کافی طور پر احساس ہو ورنہ باوجود استطاعت کے اولاد کا جاہل رہجانا یقینی ہے ۔ تیسرے خود اولاد میں تعلیم سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت موجود ہو ورنہ بہت ممکن ہے کہ باوجود روپیہ خرچ کرنے کے خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ ہو ۔ غرض تعلیم کے ذریعہ سے محنت کی اصلاح کرنے کے لیے اول تو فوری حصول منفعت کی سی کوئی ترغیب و تحریص موجود نہیں ہے ۔ دوسرے جہاں تک ماں باپ کے فطری جذبے کا تعلق ہے ، اس کا عملدرآمد انتہا درجے ناقص ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر ملک میں بہت سی خدداد قابلیتیں جو نشو و نما پا کر اہل ملک کو بہت کچھ فایدہ پہنچا سکتی تھیں تعلیم و تربیت نہ ملنے کی وجہ سے یونہی ضائع ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ انھی امور کو پیش نظر رکھ کر ترقی یافتہ ممالک کی حکومتوں نے باشندوں کی تعلیم کا انتظام بہت کچھ اپنے ذمہ لے لیا ہے ۔ پسماندہ ممالک میں درد مند دل رکھنے والے اشخاص اپنے اپنے طور پر قومی جلسوں اور انجمنوں کے

ذریعہ سے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت محسوس کراتے اور حتی الوسع چندوں اور عطیات کے ذریعہ سے نادار طلبہ کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

محنت کی قسمیں۔ معاشیین نے محنت کو تین طرح پر تقسیم کیا ہے ایک جسمانی و دماغی، دوسرے با مہارت و بے مہارت، تیسرے پیدا آور و غیر پیدا آور۔

Un-skilled & Skilled Labour

جسمانی و دماغی محنت

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں جسقدر کام معاشی محنت میں شامل کیے جا سکتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر تو اس نوعیت کے ہیں کہ اُن کو انجام دینے کے لیے زیادہ تر ہاتھ پاؤں اور بدن انسانی کی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس بہت سے کام ایسے ہیں کہ ان کی تکمیل کے لیے زیادہ تر دماغ پر بار ڈالنا پڑتا ہے۔ پہلی قسم کے کام جسمانی محنت میں شامل ہیں اور دوسری قسم کے کام دماغی محنت میں۔

واضح رہے کہ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جو محض بدن انسانی کی طاقت سے پورا ہو جائے اور اُس میں دماغی قوتوں سے کام لینے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اسی طرح کوئی کام بغیر جسمانی طاقت کے محض دماغی قوتوں سے نہیں انجام پا سکتا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ جسمانی محنت پر نظر ڈالیے اس میں بھی کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ اور عقل سے کام لینا پڑتا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی محنت کو دیکھیے اس میں بھی

جسمانی طور پر کچھ نہ کچھ بار اٹھانا پڑتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جسمانی محنت اور دماغی محنت، دونوں اضافی اصطلاحات ہیں۔ بالفاظ دیگر ہر کام میں جسم و دماغ دونوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ البتہ ان کی باہمی نسبت مختلف کاموں میں مختلف ہوتی ہے۔ جن کاموں میں بدن کی طاقت کا تناسب زیادہ ہو وہ جسمانی ہیں اور جن میں دماغی قوتوں کا تناسب بڑھ جائے وہ دماغی محنت کہلاتے ہیں۔

با مہارت و بے مہارت

با مہارت و بے مہارت محنت: ایک اور نقطۂ نظر سے بھی محنت کی دو قسمیں کی گئی ہیں: با مہارت و بے مہارت۔ جن کاموں کو سیکھنے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہ ہو یا جنھیں ہر معمولی سمجھ کا آدمی ذرا سی توجہ سے سیکھ سکتا ہو، وہ بے مہارت محنت میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس جن کاموں کو انجام دینے کے لیے خاص طور پر تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہو، وہ محنت با مہارت میں داخل ہیں۔ نجار، معمار، لوہار، سنار، موچی، درزی، اور دوسرے تمام دستکار با مہارت مزدور کہلاتے ہیں۔ برخلاف اس کے خاکروب، چپراسی، اکثر و بیشتر خانگی ملازمین، اور بہت سے زرعی کام کرنیوالے بے مہارت مزدوروں میں شامل ہیں۔ طبیب، وکیل، پروفیسر، انجنیر، مصور، ایکٹر، فوجی اور غیر فوجی سرکاری عہدہ دار، یہ بھی اعلیٰ درجے کے با مہارت مزدور ہیں۔

واضح رہے کہ محنت با مہارت کا کوئی معین معیار نہیں ہے بلکہ

اس کا مدار بہت کچھ ہر ملک کے مقامی حالات اور خاصکر تعلیم کی اشاعت پر ہوتا ہے۔ پسماندہ ممالک میں جو کام مہارت طلب تصور کیے جاتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں اُن کا شمار بے مہارت کاموں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کی وسیع آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں پڑھنے لکھنے والے اشخاص کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اس لیے جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں وہ با مہارت مزدور شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جاپان میں، جہاں تقریباً ہر شخص لکھنے پڑھنے سے واقف ہے، یہی کام بے مہارت تصور کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح قسم قسم کی مشینوں کا چلانا پچاس ساٹھ برس پہلے ہر جگہ ایک با مہارت کام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ یورپ و امریکہ میں تو بے مہارت ہو گیا ہے اور ہندوستان میں ابھی تک مہارت طلب ہی خیال کیا جاتا ہے۔

پیدا آور و غیر پیدا آور محنت

پیدا آور و غیر پیدا آور محنت: قدیم معاشیین کے نزدیک پیدا آور و غیر پیدا آور، یہ بھی محنت کی دو قسمیں تھیں۔ علم المعیشت کے ابتدائی دور میں جبکہ معاشی مسایل کی تحقیق بہت ہی نامکمل حالت میں تھی، معاشیین نے خاص خاص پیشوں کو پیدا آور اور دوسرے پیشوں کو غیر پیدا آور قرار دیدیا تھا۔ مثلاً ایک گروہ کے نزدیک صرف وہی کام پیدا آور تھے جنکا معاوضہ براہ راست سونے چاندی کی شکل میں حاصل ہو کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دولت صرف سونے یا چاندی پر مشتمل تھی۔ ایک اور گروہ کا یہ خیال تھا کہ بجز زراعت

بجز کے کوئی اور پیشہ پیدا آور کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ زراعت ہی دراصل ہر چیز کا ماخذ ہے۔ صنعت و حرفت، تجارت اور باربرداری ان کے نزدیک غیر پیدا آور تھے۔ کیونکہ یہ تمام پیشے زرعی پیداوار کو لیکر ان میں ردّ و بدل کر دیتے ہیں اور بس۔ وہ اپنی طرف سے کوئی نئی دولت نہیں پیدا کرتے۔ محنت کی یہ تقسیم دراصل انہی ناقص معاشی خیالات کا نتیجہ ہے۔ جدید تحقیق کی بدولت یہ خیالات، مدت ہوئی، غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ، دولت اور محنت کی جو تعریف ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے مطابق غیر پیدا آور محنت دراصل ایک مہمل خیال ہے۔ جو محنت غیر پیدا آور ہو، وہ معاشیات میں محنت ہی نہیں کہلائی جا سکتی۔ جس محنت سے کسی نہ کسی قسم کا افادہ پیدا ہو، وہ پیدا آور ہے۔ اور جس سے کوئی افادہ پیدا نہ ہو یا بالفاظ دیگر جو محنت ضایع ہو جائے، صرف وہی غیر پیدا آور کہلائی جا سکتی ہے۔

محنت کی کارکردگی

محنت کی کارکردگی۔ مزدور عام ازیں کہ وہ جسمانی محنت کرنے والے ہوں یا دماغی، با مہارت کام کرنے والے ہوں یا بے مہارت، ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں مثال کے طور پر معمولی حمالوں کو لیجیے۔ کیا بہ لحاظ قوائے جسمانی اور کیا بہ لحاظ شوق و فرض شناسی، حمال حمال میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بعض بیمار، ضعیف، بدشوق اور کام چور ہوتے ہیں۔ بعض صحت مند، طاقتور، شوقین اور پابند وقت۔ اسی طرح سناروں کے طبقہ پر نظر ڈالیے

بعض نہایت ہوشیار، دیانت دار، اور وعدے کے پابند ہوتے ہیں، اور بعض اناڑی، چور، اور وعدہ خلاف۔ کم و بیش یہی حال دماغی کام کرنے والوں کا ہے۔ ایک ہی قسم کی تعلیم پاکر اور ایک ہی امتحان کامیاب کرکے ہر سال کثیر تعداد میں لوگ وکالت شروع کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند اپنی تندھی، کثرتِ مطالعہ اور خوش اخلاقی کی بدولت بہت جلد ترقی کر جاتے ہیں، چند گذر اوقات کے لایق کما لیتے ہیں، اور بقیہ عسرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہی حال طبیبوں اور دوسرے آزاد پیشہ لوگوں کا ہے۔ البتہ جو لوگ تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت سے کام کرتے ہیں وہ اس قسم کی اچھی یا بُری صفات سے خود تو براہ راست اور اسقدر جلد متاثر نہیں ہوتے لیکن اپنے مالکوں کے حق میں ضرور نفع یا نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ کسی مزدور کی وہ جملہ صفات جن کی بدولت وہ اپنے مفوضہ کام کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے، بہ حیثیت مجموعی اُس کی کارکردگی سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جسقدر کسی ملک کے باشندوں میں کارکردگی کی صفت زیادہ پائی جائے گی اسی قدر پیدایش دولت کا ایک اہم عامل یعنی محنت، اچھی حالت میں موجود ہوگی اور دولت کثیر مقدار میں پیدا ہوسکے گی اس کے برعکس جن ممالک کے باشندے کارکردگی کی صفت سے محروم ہوں گے، وہاں دولت کی پیدائش بہت ناقص، اور افلاس عام طور پر مسلط رہیگا۔ پسماندہ اور ترقی یافتہ اقوام کی مثالوں سے اس

بیان کی کافی تصدیق ہوتی ہے۔

نوٹ۔ واضح رہے کہ مہارت اور کارکردگی میں بہت فرق ہے

بامہارت محنت میں صرف وہی کام شامل ہیں جنھیں کوئی شخص بغیر خاص

اہتمام، تعلیم وتربیت، اور وقت صرف کرنے کے نہیں سیکھ سکتا لیکن

کارکردگی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کام بامہارت ہی ہوں۔ بامہارت

و بے مہارت جسمانی و دماغی، ہر قسم کی محنت میں کارکردگی کی صفت

موجود ہوسکتی ہے۔ چپراسیوں، محرروں، اور اعلیٰ عہدہ داروں میں،

حمالوں، دستکاروں، صناعوں اور منیجروں میں، وکیلوں، طبیبوں،

ٹھیکہ داروں، اور تاجروں میں، بہ لحاظِ کارکردگی مختلف مدارج کے

مرد ضرور دکھائی دیتے ہیں۔

قومی ترقی کے لیے کارکردگی کی اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے

ہوئے اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کسی قوم کے افراد میں کارکردگی

پیدا کرنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لیے کن شرائط کی تکمیل

ضروری ہے، یہ الفاظ دیگر لوازم کارکردگی کیا ہیں؟

لوازم کارکردگی (۱) صحت

لوازم کارکردگی۔ کسی کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام

دینے کے لیے سب سے پہلے صحت کی ضرورت ہے۔ صحت کے بغیر نہ

جسمانی کاموں کی مشقت برداشت کی جاسکتی ہے اور نہ دماغ پر زیادہ

بار ڈالا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک کے باشندوں کی صحت

بالعموم ادنیٰ حالت میں رہتی ہے، اُن کی کارکردگی کا معیار بھی مقابلۃً

گرا ہوا رہتا ہے۔ حالتِ بیماری میں جو دن گذرتے ہیں وہ تو سراسر ضایع ہوتے ہی ہیں۔ لیکن صحت ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک مزدور میں پہلی سی چستی، چالاکی، اور کام سے دلچسپی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر کہیں خرابی موسم اور طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے وقتاً فوقتاً بیماریوں کے حملے ہوتے رہیں تو پھر مزدوروں کی کارکردگی کا ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جانا یقینی ہے۔ پس ہر حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملک سے مخالفِ صحت اسباب رفع کرنے کی تدبیریں اختیار کرے اور ایسے حالات و اسباب پیدا کرنے کی کوشش کرے جو باشندوں کی صحت کو برقرار رکھنے میں مدد معاون ہوں۔ چنانچہ بیدار اور باسمجھ قوموں کا ہمیشہ سے یہی مسلک رہا اور اب بھی ہے۔ آج کل یورپ و امریکہ کے باشندے اور اُن کی حکومتیں بیماریاں دفع کرنے اور صحت کا معیار بلند کرنے کے لیے جسقدر اہتمام کرتی ہیں، اُس کا عشرِ عشیر بھی ہندوستان میں نہیں نظر آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کے باشندوں کی کارکردگی میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے۔

واضح رہے کہ ہر ملک کے باشندوں کی صحت بہت کچھ وہاں کی آب و ہوا اور موسمی حالات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے صحت پر آب و ہوا اور موسم کا دو طرح پر اثر پڑتا ہے: ایک براہِ راست دوسرے ضروریاتِ زندگی کے توسط سے۔ ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ

گرم ممالک کے لوگ زیادہ محنت کے عادی نہیں ہوتے۔ سخت جسمانی یا دماغی محنت وہ دیر تک نہیں برداشت کر سکتے۔ اس کے برعکس سرد ممالک کے باشندے نہایت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ اور گھنٹوں کام کرنے پر بھی انھیں تکان محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی ہر قسم کا کام جس کثرت کے ساتھ جاڑے کے چار مہینوں میں ہوتا ہے سال کے بقیہ حصے میں نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جن ممالک میں بار بار موسم بدلتے رہتے ہیں، وہاں کے باشندوں کی صحت پر اس کا مضر اثر پڑتا ہے۔ ابھی طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پاتی کہ دوسرا موسم شروع ہو جاتا ہے اور طبیعت کو سکون و یکرنگی میسر نہیں آتی، جس کا لازمی نتیجہ جسمانی کمزوری ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں موسموں کی اسی تبدیلی کی وجہ سے آئے دن طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں اور یہاں کے کمزور باشندے آسانی کے ساتھ ان بیماریوں سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

انسان نے اپنی علمی ترقی کی بدولت ایسی ترکیبیں ایجاد کر لی ہیں جن کی مدد سے وہ آب و ہوا اور موسم کے مخالف اثرات کا بہت بڑی حد تک مقابلہ کر سکتا اور ان کی شدت کو بہت کچھ گھٹا سکتا ہے۔ اکثر مغربی ممالک نے اپنی ترکیبوں سے کام لیکر بہت سے امراض کا تو قطعی طور پر استیصال کر دیا ہے اور جو امراض ابھی تک باقی ہیں اور وقتاً فوقتاً نمودار ہوتے رہتے ہیں، ان کے اثرات سے بھی وہ اصول حفظانِ

صحت پر عامل ہو کر بہت کچھ محفوظ رہتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں بھی انہی ترکیبوں کو کام میں لایا جائے اور انہی اصولوں پر عمل کیا جائے تو بلاشبہہ یہاں کے ناموافق موسمی حالات بھی بہت کچھ موافق بنا لیے جا سکتے ہیں۔

انسانی صحت کا مدار بہت کچھ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل پر بھی ہے خوراک، لباس، مکان، انسانی زندگی کے لیے از بس ضروری ہیں اور ان پر آب و ہوا اور موسم کا اثر نہایت بدیہی ہے۔ سب سے اول خوراک کو لیجیے۔ خوراک زمین سے پیدا ہوتی ہے اور پیداوار زمین کی نوعیت بیشتر آب و ہوا اور موسم سے وابستہ ہے .... ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف بعض میں مادۂ نشو و نما بہت زیادہ، بعض میں متوسط، اور بعض میں بہت کم۔ اسی طرح پر بعض مفید اور معاون صحت ہیں اور بعض مضر اور مخرب افغانستان میں میوہ جات کی وہ کثرت کہ کھائے بن نہیں پڑتا۔ اور ان قریب ہی راجپوتانے میں جوار باجرہ نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالت جسمانی سے صاف ظاہر ہے .... اسی طرح عرب دیکھنے میں کیسے دبلے پتلے مگر چونکہ ان کی غذا عموماً گرم خشک ہوتی ہے ان کے پٹھے فولاد جیسے مضبوط اور دل شیر جیسے قوی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سرد چیزوں کے کثرت استعمال سے بنیوں کے جسم خمیر کی مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں۔

بنک صحت وقوت کا دار و مدار خاص طور سے خوراک پر ہے۔ اور
خوراک مقامی آب و ہوا اور موسم سے مخصوص ہوتی ہے پس آب و
ہوا کارکردگی پر بذریعہ خوراک بھی بہت قوی اثر ڈالتی ہے"
(علم المعیشت)

خوراک کے بعد لباس اور مکان کی ضرورت ہے اور ان ضروریات
کی نوعیت بھی بہت کچھ آب و ہوا اور موسمی حالات سے متاثر ہوتی ہے
سرد ممالک کے باشندوں کو لباس و مکان کے متعلق جو اہتمام کرنا پڑتا ہے
گرم ممالک میں اس کی ضرورت کمتر محسوس ہوتی ہے۔ پس ہر ملک کے
حالات کی مناسبت سے کافی لباس و مکان کا دستیاب ہونا ضروری
ہے ورنہ صحت کمزور ہو کر کارکردگی پر اس کا اثر پڑنا یقینی۔

کارکردگی برقرار رکھنے کے لیے جسمانی صحت کی اہمیت تو واضح
ہو چکی۔ لیکن کسی ملک میں پیدائش دولت کا کام ٹھیک طور پر چلانے
کے لیے محض عمدہ صحت کا حاصل ہو جانا کافی نہیں ہے۔ افغانستان
باشندے بہ لحاظ اپنی صحت کے یورپ کے اکثر ممالک سے بہتر ہیں لیکن
پیدائش دولت کے نقطہ نظر سے ان میں وہ کارکردگی نہیں پائی جاتی
جو آجکل یورپ کے باشندوں کا حصہ ہے۔ یہی حال بعض اور ممالک کا
ہے۔ جسمانی صحت تو نہایت درست، لیکن کارکردگی مفقود اور
اسی وجہ سے معاشی حالت پست۔ پس معلوم ہوا کہ کارکردگی پیدا
کرنے کے لیے جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ دماغی قابلیتوں کا نشوونما

بھی ضروری ہے۔ اور دماغی قابلیتوں کی ترقی سراسر اشاعت تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب تک ملک میں تعلیم عام نہ ہو، باشندوں کی سمجھداری اور ذہانت کا معیار بلند نہیں ہو سکتا اور جب تک صنعتی اور حرفتی تعلیم کا کافی اور مناسب انتظام نہ ہو پیدائش دولت کے حقیقی کاروبار میں عملاً حصہ نہیں لیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک کے باشندوں میں تعلیم کا فقدان ہے، وہ ایک عامل پیدائش کی حیثیت سے بالکل ناکارہ نظر آتے ہیں اور جن قوموں میں صرف ادبی تعلیم کا رواج ہے اور صنعتی تعلیم کی طرف سے لاپروائی برتی جاتی ہے، وہ مقابلۃً تو کسی قدر بہتر ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی کارکردگی بہت ناقص رہتی ہے ہندوستان میں اول تو تعلیم کا رواج ہی بے حد کم ہے اور حکومت کی طرف سے جس نوعیت کی تعلیم دی جا رہی ہے وہ بسا اوقات قومی مفاد کے منافی ہوتی ہے۔ اور جہاں تک صنعتی تعلیم کا تعلق ہے، وہ قطعاً نہ ہونے کے برابر ہے۔ نتیجہ کارکردگی کا فقدان اور عام معاشی پستی ہے پیشے کے انتخاب میں کامل آزادی اور موجودہ حیثیت سے ترقی کرنے کی امنگ، یہ حالات کارکردگی کے بہت معاون ہیں۔ ہر شخص کو اس بات کا اختیار حاصل رہے کہ وہ جس پیشے کو چاہے، اپنے کسب معاش کا ذریعہ بنائے اور جہاں مناسب سمجھے، کام کرے۔ تبدیل پیشہ اور نقل مقام کی ضرورت اور ان کے نتائج سے ہم آیندہ محنت کی نقل پذیری کے عنوان میں مفصل بحث کرینگے۔ یہاں صرف یہ جتلا دینا مقصود ہے

ہمت کی کارکردگی پر اُس کی نقل پذیری کا بھی بہت کچھ اثر پڑتا ہے چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ جن قوموں میں ذات پات کی بندشیں محنت کی نقل پذیری میں مزاحم ہوتی ہیں اُن کے افراد کی کارکردگی کا معیار نسبتاً ادنیٰ رہتا ہے۔

مزید براں یہ شخص کو اس بات کا کامل احساس ہو کہ اُس کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا انحصار سراسر خود اُسی کی کوششوں پر ہے۔ اگر وہ چاہے تو غیر معمولی محنت کر کے اپنی حیثیت کو بہت کچھ بڑھا لے، یا سہل انگاری سے کام لیکر موجودہ حیثیت بھی کھو بیٹھے جب تک کہ مزدوروں میں یہ احساس مکمل نہ ہو اُن میں کام کرنے کا شوق نہیں پیدا ہو سکتا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ غلام کبھی کارگزار مزدور نہیں بن سکتے۔ ہر غلام یہ جانتا ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی جانفشانی سے کام کرے، اُسے ہمیشہ غلام ہی بنکر رہنا ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ وہ خواہ مخواہ غیر معمولی محنت و مشقت برداشت کرے۔ یہی حال اُن کاشتکاروں کا ہے جو زمین کی قلت اور اپنی پست حوصلگی کی وجہ سے زمینداروں کے مظالم سہتے اور ہمیشہ ایک پست زندگی پر قانع رہتے ہیں۔ جن ممالک میں کارخانوں کے مزدور ترقی یافتہ نہیں ہیں انکی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ پس ضرورت ہے کہ ملک میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کی بدولت مزدوروں کو اپنے کاروبار میں حقیقی آزادی حاصل رہے۔ چنانچہ مارشل کا قول ہے کہ نو آبادیات کے

باشندے ایسی ہی آزادی کی بدولت کارگزاری میں بسا اوقات اپنے قدیم ہم وطنوں سے بڑھ جاتے ہیں۔

محنت کی نقل پذیری

محنت کی نقل پذیری:۔ تجربہ شاہد ہے کہ مزدور اعلیٰ اجرت حاصل کرنے کی غرض سے بسا اوقات ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل ہوجاتے یا ایک پیشہ چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرلیتے ہیں محنت کی نقل پذیری سے مزدوروں کا یہی رجحان مراد ہے۔ اور اس کے مفہوم میں دو جداگانہ فعل شامل ہیں: ایک نقل مقام، دوسرے تبدیلِ پیشہ۔ اول ہم نقلِ مقام سے بحث کریں گے۔

نقل مقام: دنیا میں پیدائشِ دولت کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ملک میں آبادی کی تقسیم اس طور پر ہو کہ جہاں جسقدر محنت کی طلب ہو، وہاں اسی قدر مزدور اس کی رسد بہم پہنچانے کے لیے موجود ہوں۔ جسقدر آبادی اس اصول کے مطابق منقسم ہوگی، اسی قدر پیدائش دولت کے لیے مفید ہے۔ لیکن ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں آبادی کلیتاً اس اصول کے مطابق منقسم نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی ملک میں ایک مقام پر تو محنت کی طلب اسقدر زیادہ ہے کہ آجر و کارخانہ دار مزدوروں کو ہر طرح کی ترغیب دینے کے لیے آمادہ ہیں لیکن مزدور کافی تعداد میں نہیں ملتے اور دوسرے مقام پر مزدوروں کی یہ کثرت کہ وہ بھی تیرا کام کرنا چاہتے ہیں لیکن انھیں کافی مقدار میں کام نہیں ملتا اور کئی کئی روز فاقہ کشی میں بسر

مرنے پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت ملک کے لیے کسی طرح مفید نہیں خیال کی جاسکتی۔ کیونکہ ایک طرف تو پیدائش کا بہت سا کام قلتِ محنت کی وجہ سے رکا رہتا ہے اور دوسری طرف کثیر التعداد مزدور قلتِ کاروبار کی وجہ سے بیکار اور فاقہ کشی میں مبتلا رہتے ہیں۔

علمائے متقدمین نے یہ فرض کرلیا تھا کہ مزدوروں کو جہاں کہیں زیادہ اجرت ملے، وہاں وہ فوراً منتقل ہو جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی نقل و حرکت حال حال تک بہت ہی کم یاب تھی اور اب بھی بہت کچھ ناقص ہے۔ مکمل نقل پذیری تو شاید کسی ملک کے مزدوروں میں موجود نہ ہو البتہ مختلف اسباب و حالات کی بدولت ہر ملک کی جداگانہ حالت ہوتی ہے۔

پس ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ مزدوروں کی نقل و حرکت میں کس طرح کے موانعات پیش آتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ موانعات ہر ملک اور ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتے بلکہ مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلی رکاوٹ جو ہر ملک کے لیے عام ہے، وہ ایک فطری خاصہ ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو چھوڑ کر وطن سے دور زندگی بسر کرنا طبعاً پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ فطری خاصہ تنہا فیصلہ کن ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ موافق اسباب مل جائیں تو غالب ہو جاتا ہے اور اگر اسباب مخالف سے سابقہ پڑے تو مغلوب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان اسباب کا پتا لگانا ضروری

محنت کی نقل پذیری کا مدار بہت کچھ پیشے کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ بعض پیشہ وروں کے لیے نقل و حرکت بہت آسان ہوتی ہے اور بعض کے لیے سخت دقت طلب۔ چنانچہ دستکاروں اور کاشتکاروں کی مختلف حالتوں سے اس کی ایک اچھی مثال ملتی ہے۔ مثلاً ایک نجار جس سہولت کے ساتھ اپنے وطن سے دور کسی اور مقام پر کام کر کے روزی کما سکتا ہے، ایک کسان نہیں کما سکتا کیونکہ نئے ماحول سے مانوس ہونے میں جو دقتیں کسان کو پیش آسکتی ہیں وہ نجار کو نہیں پیش آتیں۔ دوسرے ملک کی معاشرتی اور عام تعلیمی حالت پر نقل پذیری کا انحصار ہے۔ بعض ملکوں کے رسم و رواج نقل و حرکت میں مانع ہوتے ہیں اور پھر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے کے لیے ہمت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے جو بغیر عام تعلیم کے نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ ممالک میں نقل پذیری مقابلۃً زیادہ پائی جاتی ہے۔ تیسرے اس بات کی ضرورت ہے کہ جو مقامات محنت کے لیے کم یا زیادہ موزوں ہوں، اُن کا علم مزدوروں کو ہو۔ بالفاظ دیگر مزدوروں کو یہ معلوم ہو کہ کن مقامات پر کس قسم کے کام کرنے والوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی واقفیت بھی آجکل باوجود ترقیات کے بہت ناقص ہے اور یہ نقص خاصکر مزدوری پیشہ طبقوں کے اندر نمایاں ہے۔ تاہم گزشتہ زمانے کا مقابلہ کرتے ہوئے، اس لاعلمی میں بہت کچھ تخفیف ہو گئی اور ہو رہی ہے

ڈاک، تار، ٹیلیفون، وغیرہ ایسی ایجادیں ہیں جن کی بدولت مختلف ممالک کے حالات، اخبار و رسائل اور خط و کتابت کے ذریعے سے معمولی آدمی بھی معلوم کرسکتا ہے۔ ریلوں، جہازوں، وغیرہ کی وجہ سے صرف یہ ناواقفیت دور ہو رہی ہے بلکہ نقل و حرکت زیادہ آسان زیادہ ارزاں اور بالکل غیر خطرناک ہو گئی ہے۔

یہاں تک تو ہمنے نقل پذیری کے صرف ایک پہلو یعنے نقل مقام کی کیفیت بیان کی ہے۔ اب اُس کے دوسرے پہلو یعنی تبدیل پیشہ کا کچھ حال معلوم کریں گے۔

تبدیل پیشہ

تبدیل پیشہ: جب کسی مقام پر کسی خاص قسم کی محنت کم ہو تو اس میں دو طرح سے اضافہ کیا جاسکتا ہے: ایک صورت تو یہ ہے کہ دوسرے مقامات سے اُسی قسم کا کام کرنے والے مزدوروں کو بلایا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ اُسی مقام کے دوسرے پیشہ وروں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنا پرانا پیشہ چھوڑکر یہ نیا کام اختیار کریں پہلی صورت نقل مقام کی ہے اور دوسری تبدیل پیشہ کی۔

نقل مقام کی طرح تبدیل پیشہ میں بھی طرح طرح کی مزاحمتیں موجود ہیں۔ اول تو خود پیشے کی نوعیت پر اُس کا بہت کچھ انحصار ہے۔ مثلاً جو کام جسقدر زیادہ مہارت طلب ہوتے ہیں، اسی قدر ان کا اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کسی وکیل کا طبیب بنجانا، کسی مدرس کا انجنیر بنجانا یا کسی کمانڈر کا پروفیسر بنجانا، اسقدر آسان نہیں ہے جسقدر کہ کسی نجار

یا معمار کا برقی فٹر بنجانا، یا کسی سیکل درست کرنے والے کا موٹر میکانک بنجانا۔ اس کے برعکس غیر مہارت طلب کاموں میں تبدیل پیشہ بہت آسان ہے۔ مثلاً تعمیرات میں کام کرنے والے ادنیٰ مزدور جو وقت چاہیں ریلوے اسٹیشنوں کے حمال بن سکتے ہیں یا خانگی خدمتگار جو وقت چاہیں دفتروں کے چپراسی بن سکتے ہیں۔

تبدیل پیشہ پر مزدوروں کی معاشرت کا اثر بھی نہایت قوی ہو ہے۔ مثلاً ہندوستان کے کثیر التعداد باشندوں پر طریق ذات پات اثر اسقدر مسلط ہے کہ جو شخص جس خاندان میں پیدا ہوتا ہے، وہ اس بات پر مجبور ہے کہ صرف خاندان ہی کے پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ اپنی موزونی طبع کے لحاظ سے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا اُس کے لیے محال ہے یہ حالت پیدائش دولت کے لیے جسقدر مضر ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے ہر قسم کی محنت کا مدار ایک خاص طبقے کے اندر شرح پیدائش و شرح اموات جیسے اتفاقی حالات پر رہجاتا ہے اور معاشی اسباب کے عملدرآمد کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جو لوگ کہ ادنی درجے کے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں، انھیں قدرت نے خواہ کتنی ہی ذہانت عطا کی ہو، وہ بجز انہی ادنیٰ پیشوں میں زندگی بسر کرنے کے کوئی اور کام نہیں کر سکتے، اور نہ انھیں یہ موقع دیا جاتا ہے کہ اپنی قدرتی قابلیتوں سے اپنے آپ کو یا اپنی قوم کو کسی قسم کا کوئی فایدہ پہنچا سکیں۔ ہندوستان کو اپنی معاشرت کی اس خرابی کی وجہ سے جسقدر نقصان پہنچا اور اب بھی پہنچ رہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے

نقلِ مقام اور تبدیلِ پیشہ میں جسقدر رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ان میں سے اکثر و بیشتر کی اصلاح اشاعتِ تعلیم کے ذریعے سے ہو سکتی ہے۔ جسقدر کوئی شخص تعلیم یافتہ ہوتا ہے اُسی قدر اُس کو نقلِ مقام اور تبدیلِ پیشہ میں بالعموم سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں اعلیٰ ترین اجرت ملنے کا ذریعہ ہو وہاں وہ فوراً منتقل ہو جاتا ہے اور اعلیٰ اجرتوں کی خاطر اُس کو تبدیلِ پیشہ میں بھی (جس حد تک کہ وہ ممکن ہو) کوئی تامل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعلیم عام طور پر رائج ہوتی ہے وہ معاشرتی تغیرات سے زیادہ نقصان نہیں اٹھاتیں کیونکہ وہ نقل پذیری کے ذریعے سے اپنے آپ کو بہت جلد جدید حالات کے مطابق بنا لیتی ہیں۔ قحط، بیکاری، مالیات کے مراحل، اور دوسرے معاشی حوادث کی وجہ سے وقتاً فوقتاً جو مصیبتیں پیش آتی ہیں، اُن کی سختی میں محنت کی غیر نقل پذیری کی بدولت بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔

مسئلہ آبادی۔ ہر ملک میں محنت کی مقدار کا مدار ایک طرف تو مزدوروں کی تعداد پر ہوتا ہے اور دوسری طرف ہر مزدور کی کارکردگی پر۔ کارکردگی سے کیا مراد ہے، اور لوازمِ کارکردگی کیا ہیں، اس کی مفصل کیفیت ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف تعدادِ مزدوراں سے سروکار ہے جو بہت کچھ ملک کی آبادی سے وابستہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس مسئلے کی طرف بھی توجہ کی جائے۔

واضح رہے کہ مسئلہ آبادی معاشیات کے دوسرے مسائل کی طرح

مسئلہ آبادی

کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ قدیم اقوام کی تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی آبادی کے مسائل کافی اہمیت رکھتے تھے اور اُن کے سلجھانے میں بسا اوقات اُن کے بہترین دماغ اپنی اپنی واقفیت اور استعداد کے موافق مشغول رہتے تھے لیکن عہد جدید میں جس شخص نے سب سے پہلے اس مسئلہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی، وہ انگلستان کا مشہور معاشی مالتھس ہے جسکے نظریۂ آبادی کا مختصر خلاصہ ہم اُسی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:-

(۱) یہ ایک لازمی بات ہے کہ ذرایع معاش بالآخر آبادی کو محدود کر دیں کیونکہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے، اُسی رفتار سے ذرایع معاش میں اضافہ نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ ذرایع معاش میں صرف غذا بلکہ ایندھن، پوشاک، جائے سکونت، وغیرہ بھی شامل ہیں۔

(۲) جب ذرایع معاش میں اضافہ ہوتا ہے تو آبادی بھی لازمی طور پر بڑھتی ہے، بجز اس صورت کے جبکہ خاص خاص موانعات کے ذریعے سے اُسے روکا جائے۔

(۳) یہ موانعات دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ جن کی بدولت شرح پیدائش میں تخفیف ہوتی ہے، دوسرے وہ جن کی بدولت شرح اموات میں اضافہ ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے موانعات کو امتناعی اور دوسری قسم کے موانعات کو موانعات مثبت کہا جاتا ہے۔ دیر سے شادی کرنا موانعات امتناعی کی بہترین مثال ہے اور وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نامناسب

بھی نہیں ہے۔ لیکن موانعات امتناعی کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جو شرح پیدائش میں تخفیف کا باعث تو ہوتی ہیں لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے ہرگز پسندیدہ نہیں خیال کی جاسکتیں۔ اسی طرح موانعات مثبت میں سے بعض تو قوانین قدرت کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ مثلاً قحط، وبا، طوفان، زلزلہ، وغیرہ اور بعض انسانوں کی خودغرضی اور شرارت سے پیدا ہوتے ہیں جیسے جنگ و جدال، لوٹ مار، قتل و غارت، وغیرہ۔

مالتھس اس بات کا مدعی تھا کہ آبادی سلسلۂ ہندسیہ کے مطابق بڑھتی ہے اور اشیائے خوراک کی رسد میں سلسلہ حسابیہ کے مطابق اضافہ ہوتا ہے * بہ الفاظ دیگر آبادی، ذرایع معاش کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار کے ساتھ بڑھتی ہے۔ یعنی پیدائش، صرف دولت کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی بلکہ ہمیشہ اُس کے پیچھے رہے گی اور ان دونوں میں توازن صرف اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جبکہ آبادی میں وقتاً فوقتاً تخفیف ہوتی رہے۔ اب اگر لوگ اخلاقی ضبط سے [illegible] افراد کی تعداد کو ایک معقول حد سے متجاوز نہ ہونے دیں تو وبائیں، [illegible] طوفان اور زلزلے وبائیں اور قحط، جنگ و جدال اور فسادات، اور اسی قسم کے دوسرے اسباب خود آبادی کی کاٹ چھانٹ کرتے رہیں گے۔

---

* سلسلۂ ہندسیہ مثلاً ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲، ۶۴، وغیرہ۔
سلسلہ حسابیہ مثلاً ۲، ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۲، وغیرہ۔

اکثر معاشیین نے مالتھس کے نظریۂ آبادی پر طرح طرح کے اعتراضات کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ آبادی اور وسائلِ معاش کے متعلق اس کی مایوس کن پیشنگوئی بعد کے واقعات سے بالکل غلط ثابت ہو گئی ہے، تمام ممالک میں دولت بمقابل آبادی کے بہت بڑھ گئی ہے، اعداد و شمار یہ ثابت کرتے ہیں کہ دولتمند طبقوں میں شرح پیدائش بمقابل غریبوں کے ادنٰی ہوتی ہے، گویا جب کسی ملک میں خوشحالی پھیلے گی تو شرح پیدائش میں اسی مناسبت سے تخفیف ہوگی، حیاتیات کے قوانین یہ توقع دلاتے ہیں کہ جوں جوں بنی نوع انسان دماغی اور اخلاقی حیثیت سے ترقی کریں گے اسی مناسبت سے ان کی قوتِ تولید گھٹتی جائے گی، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جمہوری ممالک میں شرح پیدائش بمقابل دوسرے ممالک کے ادنٰی ہوتی ہے۔ کیونکہ کثیر العیال اشخاص اپنے ملک کے سیاسیات میں پورے انہماک کے ساتھ حصہ نہیں لے سکتے اور اس وجہ سے سیاسی میدان میں اتنی ترقی نہیں کر سکتے جتنی وہ تنہا رہکر یا ایک چھوٹے خاندان کے ساتھ کر سکتے ہیں، عورتوں کی آزادی کی جو تحریکیں ترقی یافتہ ممالک میں پھیلتی جا رہی ہیں اُن کا میلان بھی آبادی کی تخفیف ہی کی طرف ہے۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مالتھس کے نظریۂ آبادی کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے لیکن درحقیقت یہ نظریہ اسقدر بے بنیاد نہیں ہے جسقدر کہ وہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اس بارے میں پروفیسر مارشل نے جو رائے ظاہر کی ہے وہی سب سے زیادہ قرین صحت معلوم ہوتی ہے لھذا ہم اسی کے بیان پر اکتفا

... گئے ہیں۔

مارشل کا یہ خیال ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان کے معاشیین نے اضافہ آبادی کا وسائل معاش پر جو بار پڑتا ہے اسکے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا یہ مبالغہ ایک حد تک حق بجانب تھا۔ وہ لوگ کیونکر یہ جان سکتے تھے کہ آگے چلکر ذرایع آمدورفت میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوگی کہ دنیا کی زرخیز ترین زمینوں کی پیداوار دور دراز ممالک میں جاکر اسقدر ادنی قیمتوں پر فروخت ہوگی۔ انھیں کس طرح یہ علم ہوسکتا تھا کہ سائنس کی ترقی سے قدرت پر انسان کا تصرف اس درجے بڑھ جائیگا اور وہ اپنے محدود وسائل سے اسقدر زیادہ کام لے سکیگا۔ ان واقعات کی وجہ سے مالتھس کا نظریہ کسقدر قدیم ہوگیا ہے اور اس میں جدید حالات کے ساتھ مطابقت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن خواہ اس نظریے کی شکل قدیم ہوگئی ہو، اپنی اصلیت میں وہ اب بھی بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔

مارشل نے مسئلہ آبادی کو جدید شکل میں حسب ذیل طریقے پر بیان کیا ہے: اضافہ آبادی کا انحصار دو چیزوں پر ہے: ایک قدرتی اضافہ یعنی بمقابل اموات کے پیدایش کی کثرت، دوسرے توطن۔

(۱) قدرتی اضافہ: تعداد پیدایش کا انحصار زیادہ تر ان عادات پر ہوتا ہے جو شادی کے متعلق ملک کے باشندوں میں مروج ہوتی ہیں۔ لیکن خود ان عادات پر حسب ذیل اسباب کا اثر پڑتا ہے:۔

(ا) آب و ہوا۔ گرم ممالک کے باشندے بمقابل سرد ممالک میں رہنے والوں کے جلد شادی کر لیتے ہیں۔

(ب) پرورشِ خاندان کی دقتیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی کے مختلف طبقوں میں شادی کی عمر مختلف ہوتی ہے مثلاً متوسط طبقے کے افراد بہت دیر سے شادی کرتے ہیں، دستکار اور صناع ان سے کسیقدر جلد، اور بے مہارت مزدوران سب سے جلد۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ متوسط طبقے کے افراد کے لیے ازدواجی زندگی بہت گراں ہوتی ہے۔ اولاد کی تعلیم میں اور سوسائٹی کے اندر اپنا وقار برقرار رکھنے میں انھیں بہت روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ لہذا جب تک کہ وہ پرورشِ خاندان کی ضرریات کا لحاظ کرتے ہوئے کافی مقدار میں کما نہ لیں شادی کی خواہش نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے وہ بالعموم دیر سے شادی کرتے ہیں۔ دستکاروں کی حالت اس سے کسیقدر مختلف ہے۔ ایک دستکار بیس اکیس سال کی عمر میں جو کچھ کماتا ہے، وہی گویا اس کی انتہائی آمدنی ہوتی ہے۔ آگے چلکر اس سے زیادہ کمانے کی اسے بمشکل کوئی توقع ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس عمر پر پہنچتے ہی وہ بالعموم شادی کر لیتا ہے۔ بے مہارت مزدوروں کی حالت یہ ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر ہی میں اُن کی آمدنی اپنی انتہائی حد پر پہنچ جاتی ہے۔ اور چونکہ اُن کے بچے بہت جلد کمانے کے قابل ہو جاتے ہیں اس لیئے وہ بالعموم بہت کمسنی میں شادی کر لیتے ہیں۔

(ج) رسم و رواج۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض پسماندہ دیہاتی علاقوں

ہیں صرف بڑے لڑکے کو شادی کی اجازت دی جاتی ہے ۔ قدرتی موانعات کے علاوہ بعض رسم و رواج ایسے ہیں جو اضافۂ آبادی میں مزاحم ہوتے ہیں اور جن کا اثر قریب قریب اتنا ہی قوی ہوتا ہے جتنا کہ قانون کا ۔ مثلاً یورپ میں اب بھی بہ کثرت ایسے مقامات موجود ہیں جہاں از روئے رواج ہر خاندان میں صرف ایک لڑکے کو شادی کی اجازت دی جاتی ہے ۔ اس کے برعکس جن مقامات میں اضافۂ آبادی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں ایسے قوانین اور رسوم جاری کیے جاتے ہیں جن کا میلان آبادی کو بڑھانے کی طرف ہوتا ہے ۔

(۲) **توطن** : عام مشاہدہ ہے کہ اکثر لوگ خاصکر معاشی اسباب کے زیر اثر، اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا بستے ہیں ۔ اس نقل وطن کا بھی ملک کی آبادی پر بسا اوقات گہرا اثر پڑتا ہے ۔ نقل وطن کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : ایک توطن داخلی، دوسرے توطن خارجی اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک کے باشندے کسی ملک میں آکر مستقل طور پر بس جائیں اور اسی کو اپنا وطن بنالیں مثلاً آج کل انگلستان کے اکثر خاندان آسٹریلیا میں جا جا کر بس رہے ہیں ۔ اس کے برعکس اگر ملک کے باشندے مستقل طور پر اپنا وطن ترک کر کے کہیں اور چلے جائیں تو یہ توطن خارجی کی صورت ہوگی ۔ مشہور ہے کہ اسی توطن خارجی کی وجہ سے ایرلینڈ کی آبادی بہت کچھ گھٹ گئی ہے ۔ مختصر یہ کہ کسی ملک کی آبادی میں توطن داخلی کے ذریعہ سے اضافہ، اور توطن خارجی کی وجہ سے تخفیف ہوتی

اصل کی تعریف و تشریح:- ہر ایسی دولت جس سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام لیا جائے اصل ہے۔ اس تعریف کے مطابق دوسرے دو عامل یعنے زمین اور محنت بھی اصل میں داخل ہوجاتے ہیں۔ لھذا اصل کی زیادہ مکمل تعریف یہ ہوگی کہ اصل میں وہ تمام اشیا شامل ہیں جو انسان کی پیدا کی ہوئی ہوں اور جن سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام لیا جائے۔ جن اشیا سے پیدائش دولت کا کام نہ لیا جائے بلکہ جو براہِ راست ہماری احتیاجات پوری کریں، وہ دولت ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ کسی چیز کا دولت یا اصل میں شامل ہونا محض اُس کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی سکونت کے لیے مکان تعمیر کرے تو یہ اس کی دولت ہے۔ اور اگر یہی مکان دوسروں کو کرایہ پر دیدیا جائے تو اصل ہے۔ بالفاظ دیگر دولت گویا انسانی جد و جہد کا نصب العین ہے اور اصل اُس نصب العین تک پہنچنے کا ایک ذریعہ۔

ہم اس سے قبل عاملین پیدائش کے عنوان میں واضح کرچکے ہیں کہ زمانۂ موجودہ میں اصل ایک نہایت ہی اہم عامل پیدائش ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے غیر مہذب ممالک میں بھی اصل کی امداد کے

دولت نہیں پیدا ہوتی۔ اور جہاں تک ترقی یافتہ ممالک کا
تعلق ہے، اُن کی تو ترقی کا راز ہی اصل کی ترقی میں مضمر ہے۔
روز بروز نئی نئی احتیاجات کا نمودار ہونا، اور ان کی تکمیل کے لیے
نئے دن نئی نئی چیزوں کا عجیب وغریب اور پیچیدہ طریقوں سے
تیار کیا جانا، یہ تہذیب جدید کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جو سراسر
افزونی اصل کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ موجودہ زمانے کو
عہد اصل یا اصل شاہی دور کہتے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ آج
یورپ کی اکثر و بیشتر حکومتیں سرمایہ داروں کے زیر اقتدار ہیں اور
یہی سرمایہ دار قومیں آج دنیا کے اکثر حصوں پر نہایت مضبوطی کے
ساتھ مسلط ہیں۔ پس ہر قوم کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ دنیا میں عزت
و آسایش کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے اپنے ملک میں
ایسے حالات پیدا کرے جو افزائش اصل میں ممد ومعاون ہوں تاکہ
اس کی بدولت ملک میں مختلف قسم کے کاروبار جاری ہوں اور
سب معاش کے متعدد راستے کھلنے سے باشندوں کا افلاس رفع ہو
آیندہ عنوان میں ہم انہی حالات کی مفصل کیفیت پیش کرینگے۔

اجتماع اصل کے شرائط

اجتماع اصل کے شرائط۔ اصل کی مذکورہ بالا تعریف کا
اطلاق انواع واقسام کی اشیاء پر ہوتا ہے۔ مکانات، مشینیں، جانور،
خام پیداوار، اور مختلف قسم کے آلات و اوزار، یہ سب اصل میں شامل
ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل کی ایک شکل اور بھی ہے جو عام طور پر سرمایہ

کہلاتی ہے اور جسے اصطلاح معیشت میں زر کہا جاتا ہے۔ اصل کی شکل
زر کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اُس کے ذریعے سے دوسری تمام
اشکالِ اصل کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کارخانے کے اصل کی
مقدار بیان کرنا مقصود ہو تو اُس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ کارخانے کے
کل سامان کی فہرست پیش کی جائے بلکہ ہر چیز کی قیمت کا بہ شکل
زر تخمینہ کیا جاتا ہے اور اس طرح جو مجموعی قیمت حاصل ہو وہی بیان
کر دی جاتی ہے۔ ہم بھی اپنے موجودہ عنوان میں اصل سے صرف
سرمایہ مراد لیں گے اور یہ دریافت کریں گے کہ کسی ملک میں سرمایہ کا
اجتماع کن شرائط کے تابع ہوتا ہے۔

(۱) واضح رہے کہ پیدائش اصل کے لیے سب سے مقدم شرط
پس اندازی ہے۔ بالفاظ دیگر باشندگانِ ملک کو اسقدر آمدنی
حاصل ہو کہ وہ اپنی ضروریات زندگی و کارکردگی کو پورا کرنے کے
بعد اس کا کچھ حصہ پس انداز کر سکیں۔ جس ملک کے باشندوں کی آمدنی
کا اوسط بلند ہوگا، وہاں کاروبار کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کا زیادہ
امکان ہوگا۔ اس کے برعکس جن ممالک کے باشندوں کی کثیر تعداد
مفلس و محتاج ہوگی، وہاں پیدائشِ اصل کا سرچشمہ ہی مسدود رہے گا
اور قلت اصل کی وجہ سے پیدائشِ دولت میں طرح طرح کی رکاوٹیں
پیش آئیں گی۔ چنانچہ ہندوستان کی آجکل یہی حالت ہے۔ ہندوستان
کی اکثر و بیشتر آبادی افلاس میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

انھیں نہ کھانے کے لیے کافی غذا میسر ہوتی ہے، نہ پہننے کے لیے کافی لباس ملتا ہے اور نہ رہنے کے لیے مناسب مکان نصیب ہوتے ہیں۔ جب ادنیٰ ضروریات ہی کے لیے آمدنی ناکافی ہو تو ایسے اشخاص سے پس اندازی کی توقع ہرگز قرین انصاف نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی ضروری احتیاجات کو نظرانداز کرکے آمدنی پس انداز کرنے کا عادی ہو تو اُس کی یہ عادت معاشی نقطۂ نظر سے ہرگز پسندیدہ نہیں خیال کی جاسکتی۔ کیونکہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے اگر ایک عامل پیدائش یعنے اصل میں کسی قدر اضافہ ہوتا ہے تو دوسرے عامل پیدائش یعنے محنت میں اس سے کہیں زیادہ خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ملک میں افزائش اصل کے لیے پس اندازی ایک شرط اولین ہے اور پس اندازی کا مدار باشندوں کی استطاعت پر ہے۔

(۲) تجربہ شاہد ہے کہ اکثر لوگ باوجود استطاعت کے اپنی آمدنی کا کوئی جزو پس انداز نہیں کرتے بلکہ جس قدر کماتے ہیں ساتھ ساتھ خرچ کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر حیدرآباد کے معماروں پر نظر ڈالیے۔ اکثر معمار روزانہ سوا روپیہ سے دو روپیہ تک اجرت کماتے ہیں اور اُن کے معیار زندگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس اجرت میں پس اندازی کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے آیندہ آنے والی احتیاجات کو، خواہ وہ کتنی ہی اہم ہوں، نہیں محسوس کرتے۔ اور اپنی آمدنی کا جو حصہ واجبی

طور پر پس انداز کر سکتے ہیں، وہ بھی احتیاجاتِ حاضرہ کی تکمیل میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور جب آگے چلکر غیر معمولی احتیاجات پیش آتی ہیں تو قرضداری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ آگے آنے والی اہم احتیاجات کو محسوس کر کے غیر اہم احتیاجاتِ حاضرہ کو ترک کر دینا، صرف انہی اشخاص سے ممکن ہے جو آیندہ احتیاجات کا محسوس کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور یہ قابلیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جبکہ ملک میں تعلیم کی عام اشاعت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں بمقابل جہلا کے تعلیم یافتہ طبقوں میں پس اندازی کی عادت زیادہ نظر آتی ہے۔

(۳) بہت سے لوگ ایسے بھی دکھائی دیتے ہیں جو باوجود صاحب استطاعت اور تعلیم یافتہ ہونے کے پس انداز نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی آمدنی ضروریات حاضرہ کی واجبی تکمیل کے بعد بچ سکتی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انھیں چند سال بعد اولاد کی تعلیم اور شادی بیاہ پر بہت کچھ صرف کرنا پڑیگا۔ لیکن پھر بھی احتیاجاتِ حاضرہ کی تکمیل سے جو حظ و لطف حاصل ہوتا ہے، اس کا اثر ان پر اسقدر غالب ہوتا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا کوئی جزو پس انداز نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات فضول خرچیوں میں مبتلا ہو کر آیندہ آمدنی کی امید میں قرضدار ہو جاتے ہیں۔ لھذا پس اندازی کے لیے استطاعت اور احتیاجاتِ آیندہ کے احساس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ باشندگان

کی قوتِ ارادی اسقدر مضبوط ہو کہ وہ فوری حظ و لطف کی ترغیب پر غالب آسکیں۔

(۴) ملک میں امن و امان کا قیام بھی افزائش اصل کے لیے بےحد ضروری ہے۔ جب کوئی شخص دولت پس انداز کرتا ہے تو اس کو یہ توقع رہتی ہے کہ آیندہ وقتِ ضرورت وہ یا اس کی اولاد اس دولت سے مستفید ہو سکے گی۔ اگر کسی کو یہ اندیشہ لگا رہے کہ مبادا اس کی پس انداز کی ہوی دولت لوٹ لی جائے یا اس کا کوئی بڑا حصہ بشکل ٹکس سرکار کے حوالہ کرنا پڑے تو ظاہر ہے کہ اس کی طبیعت پس اندازی کی طرف راغب نہ ہوگی۔ چنانچہ تجربے سے ثابت ہے کہ سرحدی علاقوں میں جہاں اکثر لوٹ مار مچی رہتی ہے، لوگ پس انداز کرنے کے بہت کم عادی ہوتے ہیں۔

(۵) جس قدر کسی ملک میں اصل سے کام لینے کے ذرایع وسیع پیمانے پر موجود ہوں گے، اسی قدر وہاں کے باشندوں کو پس اندازی کی زیادہ ترغیب ہوگی۔ اصل سے کام لینے کو اصطلاح میں شغلِ اصل کہتے ہیں اور اس کی مفصل کیفیت ہم آیندہ بیان کریں گے۔ یہاں صرف یہ ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ ملک میں مختلف قسم کے بنک، مشترک سرمایہ دار کمپنیاں، ڈاکخانے کے سیونگ بنک، انجمنہاے امداد باہمی، اور اسی طرح کے دوسرے ذرایع شغلِ اصل کا موجود ہونا آجکل اجتماعِ اصل کے لیے ناگزیر ہے۔ دورِ جدید سے قبل جبکہ پیدایش

دولت کا میدان نہایت تنگ اور وسائل پیدائش بہت ہی محدود
اور غیر ترقی یافتہ حالت میں تھے، کاروبار میں اصل سے کام لینے کی
نہ اتنی گنجائش تھی اور نہ کاروباری اشخاص کو سرمایے کی اسقدر طلب
تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوس زمانے میں جو لوگ آیندہ احتیاجات کے
خیال سے اپنی آمدنی کا کوئی جزو پس انداز کرتے تھے، وہ دوسروں کو
اُس کی حفاظت کا معاوضہ دیا کرتے تھے۔ آجکل صورتِ حال بالکل
اس کے برعکس ہے۔ بنک نہ صرف ہمارا سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں بلکہ
ہمیں اُسپر کچھ سود بھی ادا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تغیر محض کاروبارِ
پیدائش کی وسعت کا نتیجہ ہے۔ پس جن ممالک میں سرمایے سے
پیدائشِ دولت کا کام لینے کے مواقع وسیع پیمانے پر موجود ہوتے
ہیں، وہاں لوگوں میں پس اندازی کا شوق مقابلتہً زیادہ پایا جاتا ہے
اور اجتماعِ اصل کی رفتار بھی بہت تیز ہوتی ہے۔

شغل اصل۔ زراعت، صنعت، تجارت، باربرداری، یا کسی
اور شعبہ پیدائش میں سرمایہ لگانے کو اصطلاحاً شغل اصل کہتے ہیں۔
سرمایے سے کام لینے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمایے سے
خود ہی کوئی کاروبار جاری کرے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے کسانوں،
دستکاروں، تاجروں، اور گاڑی بانوں میں بکثرت اس کی مثالیں
ملتی ہیں۔ لیکن آجکل اکثر و بیشتر کاروبار اسقدر بڑے پیمانے پر جاری

بیئے جاتے ہیں کہ کسی ایک شخص کا سرمایہ اس کے لیے کافی نہیں ہو سکتا اور اگر کافی ہو بھی تو کوئی سمجھدار شخص اپنی ساری کمائی ایک ہی کاروبار میں لگا دینا پسند نہیں کریگا۔ کامیابی اور ناکامی کا احتمال ہر کاروبار میں لگا رہتا ہے لھذا تمام باسمجھ سرمایہ داروں کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنا سرمایہ مختلف قسم کے کاروبار میں پھیلا کر رکھتے ہیں تاکہ اگر کسی ایک کاروبار میں نقصان لاحق ہو تو دوسرے کاروبار کے منافع سے اسکی تلافی ہو جائے اور پورے طور پر دیوالیہ ہونے کی صورت پیش نہ آئے۔ مزید براں یہ کیا ضروری ہے کہ جس شخص کے پاس سرمایہ موجود ہے، وہ کاروبار چلانے کی قابلیت سے بھی بہرہ مند ہو۔ بہت سے نااہل اشخاص اپنے آبا و اجداد سے بڑی بڑی دولت وراثت میں حاصل کرتے ہیں جس کو اگر وہ خود کام میں لگائیں تو بہت جلد خسارہ اٹھا کر تباہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ بہت سے سرمایہ دار خاص خاص پیشوں میں مہارت رکھتے اور اُنہی کو اپنی معاش کا ذریعہ بناتے ہیں۔ انھیں اپنے پیشے کے مشاغل سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اپنے سرمایہ سے کوئی کاروبار جاری کرکے اُس کی نگرانی کریں اور اُس کی ترقی اور کامیابی کی تدبیریں سوچیں۔

(۲) مذکورۂ بالا دقتوں کو پیش نظر رکھ کر شغل اصل کی ایک ترکیب ایجاد کی گئی جس کا اصطلاحی نام شراکت ہے۔ دو یا دو سے زاید اشخاص ملکر جب کسی خاص معاہدے کی بنا پر کاروبار جاری کرتے ہیں تو

اس طریق کاروبار کو شراکت کہتے ہیں۔ مختلف شراکتوں کے تفصیلی شرایط ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ان کا انحصار سراسر اراکین شراکت کی مرضی اور باہمی معاہدے پر ہوتا ہے لیکن چند خصوصیات ایسی بھی ہیں جو لازمی طور پر شراکت میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر شراکت کا کوئی ایک رکن فوت ہوجائے تو قانون کی نظر میں وہ شراکت خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شراکتی کاروبار کی کامیابی سراسر اراکین کی باہمی یگانگت اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔ جس شراکت میں اس طرح کا اتحاد مفقود ہو، وہاں باہمی رنجشوں اور بدگمانیوں کا پیدا ہونا یقینی، اور بالآخر کاروبار کا تباہ ہوجانا لازمی ہے۔ تیسرے یہ کہ شراکت میں ہر شریک کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر شراکتی کاروبار میں نقصان آئے اور شراکت کا اثاثہ اُس کے قرضوں کی ادائیگی کے لیے ناکافی ثابت ہو تو اراکین کی دوسری جایداد و املاک سے بقیہ قرضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے زبردست خطرے کی موجودگی میں بہت کم سرمایہ داروں کو شراکت کے طریقے پر کاروبار جاری کرنے کی ہمت پڑے گی۔ اس کے علاوہ جدید طریق پیدایش کے لیے جس عظیم الشان سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شراکت کے ذریعے سے بھی مہیا نہیں ہوسکتا۔

(۳) شراکت کے مذکورۂ بالا نقایص اور پیدایش دولت کے

ان طریقوں کا لحاظ کرتے ہوئے شغلِ اصل کا ایک اور عجیب و غریب
طریقہ جاری کیا گیا جو آجکل تمام ترقی یافتہ ممالک میں بے حد مقبول ہے
یعنی مشترک سرمایہ دار کمپنی کا طریقہ ہے۔ ان کمپنیوں کے حسب ذیل
خصوصیات قابل ذکر ہیں:۔ (i) کاروبار کے لیے جسقدر سرمایہ درکار
ہوتا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر شخص
اپنی حیثیت کے مطابق جسقدر حصے خریدنا چاہے، خرید سکتا ہے۔ نتیجہ
یہ ہے کہ بڑے سے بڑے کاروبار کے لیے بھی کثیر مقدار میں نہایت آسانی
کے ساتھ سرمایہ فراہم ہو جاتا ہے۔ (ii) مشترک سرمایہ دار کمپنی پر
اس کے حصہ داروں کی شخصیت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حصہ داروں
کے فوت ہو جانے سے کمپنی کا شکست ہونا تو درکنار، اس کے روزمرہ
کام میں سرِ مو فرق نہیں آتا۔ (iii) اگر کوئی حصہ دار کمپنی کے
طریق عمل سے متفق نہ ہو تو وہ شراکت کی طرح اس کا خاتمہ نہیں کر سکتا
بلکہ بازار میں اپنا حصہ کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر کے کمپنی سے
قطع تعلق کر سکتا ہے۔ (iv) سب سے زیادہ باعثِ سہولت یہ امر ہے
کہ حصہ دار کی ذمہ داری اس کے حصے یا حصص کی مالیت تک محدود
ہوتی ہے۔ شراکت کی طرح غیر محدود ذمہ داری کا اس طریق میں بہت کم
رواج ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی محدود کمپنی قائم ہوتی ہے تو سرمایہ دار
نہایت اشتیاق کے ساتھ اس کے حصص خریدنے کے لیے دوڑتے ہیں
اور کئی کئی لاکھ روپے کا سرمایہ چند روز میں جمع ہو جاتا ہے۔ ترقی یافتہ

ممالک کے سرمایہ دار تو ہمیشہ نئی نئی کمپنیوں کے لیے چشم براہ رہتے ہیں حتیٰ کہ بسا اوقات رقم مطلوبہ سے کہیں زیادہ مالیت کے حصص کی درخواستیں پیش ہو جاتی ہیں۔ اور جب کوئی کمپنی کامیابی کے ساتھ اپنا کاروبار چلاتی اور حصہ داروں کو خوب منافعہ تقسیم کرتی ہے تو پھر اس کے حصص کی قیمت میں اسی تناسب سے اضافہ ہونے لگتا ہے۔

(۴) شغلِ اصل کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنا سرمایہ کسی بنک میں بہ طورِ امانت رکھا دے۔ اور قاعدے کے مطابق بنک سے سود وصول کرتا رہے۔ مذکورۂ بالا تمام طریقوں میں سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ محفوظ یہی طریقہ ہے۔ امانت دار کو نہ کاروبار کے جنجال میں پڑنے کی ضرورت، اور نہ اُسے شراکت و محدود کمپنی کے جھگڑوں اور ذمہ داریوں سے کوئی سروکار۔ اُس کا تو صرف یہ کام ہے کہ میعاد معیّنہ پر بنک سے اپنی امانت کا سود وصول کرے اور بس۔ لیکن بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک ایک معتدبہ رقم پیش نہ کی جائے، اکثر بنک امانت نہیں قبول کرتے۔ مثلاً امپیریل بنک آف انڈیا میں اگر کوئی شخص اپنا اندوختہ امانت رکھنا چاہے تو اُس کے لیے ضرور ہے کہ وہ کم از کم پانسو روپیے داخل کرے۔ یہی حال کم و بیش دوسرے بنکوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن اداروں سے صرف متمول اشخاص ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جز معاش افراد بلکہ ہندوستان کے اکثر متوسط الحال طبقے بھی ان سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ خیانچہ اسی خامی کو پیشِ نظر رکھ کر سرکار کی جانب سے ڈاکخانوں میں سیونگز بنک کھولے جاتے ہیں جہاں چھوٹی

چھوٹی رقم بھی جمع کرلی جاتی ہے اور اس پر حسب قاعدہ سود ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن سیونگ بنک صرف اندوختہ جمع کرتا، اُس پر سود ادا کرتا اور حسب ضابطہ اُسے واپس کرتا ہے۔ قرضے کا لین دین اس کے دایرۂ عمل سے خارج ہے۔ حالانکہ جس طرح چھوٹے چھوٹے اندوختے وصول کرنے کی ضرورت ہے، اسی طرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ خرمعاش افراد کو اُن کی واجبی احتیاجات کے لیے مناسب شرایط پر وقتاً فوقتاً قرضہ ملا کرے جسے وہ چھوٹی چھوٹی اقساط میں واپس کرسکیں تحریک امداد باہمی سے درحقیقت اسی ضرورت کا پورا کرنا مقصود ہے۔

(۵) شغل اصل کی ایک اور صورت جو زمانۂ موجودہ میں بہت زیادہ مروج ہے، وہ حکومتوں یا بلدیات کے تمسکات ہیں۔ جہاں تک حکومتوں کے معمولی ضروریات کا تعلق ہے، وہ تو اُن کی مقررہ آمدنی سے پورے ہوتے ہیں، جو سال بسال باشندوں پر محصول لگا کر یا دوسرے طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن بسا اوقات حکومتوں کو غیرمعمولی ضروریات کے لیے کثیر مقدار میں سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دشمن سے جنگ کرنا، ملک میں ریلیں جاری کرنا، بڑے بڑے ذرایع آبپاشی مہیا کرنا، حکومت کے غیر معمولی ضروریات کی چند مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اغراض کے لیے جو سرمایہ مطلوب ہوتا ہے، وہ محض ٹکس لگا کر یا دوسرے معمولی ذرایع سے نہیں مہیا کیا جا سکتا۔ لھذا حکومتیں قرض لینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ سرکاری قرضے کے اصول، اس کے فواید ونقصانات، اور ادائی

سود و و ایسی اصل کے طریقے" اِن مباحث کا تعلق اصول مالیات سے ہے۔ یہاں صرف اسقدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جس طرح مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے حصّے خریدنے میں لوگ اپنا اندوختہ لگاتے ہیں اسی طرح وہ سرکار کے پرامیسری نوٹ اور مختلف قسم کے دوسرے تمسکات میں بھی اپنا سرمایہ مشغول کر سکتے اور کرتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ زیادہ محتاط ہوتے ہیں، وہ اس طریقے کو اُس کے غیر معمولی تحفظ کی وجہ سے دوسرے تمام طریقوں پر ترجیح دیتے ہیں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے حصص کی طرح حکومتوں کے تمسکات بھی بازار میں خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس یہ تمسکات موجود ہوتے ہیں وہ سرکاری خزانے سے سالانہ یا ششماہی سود پاتے ہیں۔

اصل کا بیان ختم کرنے سے قبل اس کے متعلق دو اور امور کا حال مختصراً معلوم کرنا ضروری ہے؛ ایک اصل کے خواص، دوسرے اصل کی قسمیں اب ہم انہی عنوانات کے طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اصل کے خصوصیات

اصل کے خصوصیات۔ زمین اور محنت کے جو خصوصیات اوپر بیان ہو چکے ہیں، انہی سے ہم اصل کے خصوصیات بھی بہ آسانی اخذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً زمین کے متعلق ہم اوپر معلوم کر چکے ہیں کہ اُس کی مقدار میں قطعاً اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور محنت کی مقدار اگرچہ زمین کی طرح معین نہیں، تاہم اُسپر بھی خاص قسم کی بندشیں موجود ہیں۔ اصل کی حالت اِن دونوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ اصل کی مقدار میں اضافہ کرنا سراسر

انسان کے اقتدار میں ہے اور زمانۂ موجودہ کی امتیازی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں بہ مقابل ازمنۂ سابقہ کے اصل کی مقدار بے حد و شمار بڑھ گئی اور بڑھتی جا رہی ہے۔ زمین کے متعلق ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اپنی جگہہ پر اسقدر مضبوطی کے ساتھ قایم ہے کہ اُس کا دوسری جگہہ منتقل کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ رہی محنت وہ زمین کی طرح بالکل اٹل نہیں بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوسکتی ہے مگر صرف اُسی حالت میں جبکہ خود مزدور بھی اُس کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتا جائے اور مزدوروں کے منتقل ہونے میں کس قسم کی مزاحمتیں پیش آتی ہیں اُس کا حال ہم اوپر بیان کرچکے ہیں۔ اب اصل پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے برابر دنیا میں کوئی چیز سریع الانتقال نہیں ہے۔ اصل اپنے مالک سے جدا ہوکر کوسوں دور دنیا کے ہر گوشے میں کام کرتا ہے۔ سائنس کی ترقیات نے جب سے ذرایع خبر رسانی اور وسائل آمد و رفت ارزاں اور آسان کردیے ہیں اصل کی نقل پذیری میں اور بھی عظیم الشان اضافہ ہوگیا ہے۔ اصل کی تیسری خصوصیت اسکی غیر محدود قوت پیدائش ہے۔ زمین کی نہ صرف قوت پیدا آوری محدود ہے بلکہ اُس پر موسموں کی پابندی بھی لازم ہے۔ محنت کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ ایک وقت معینہ تک کام کرنے کے بعد مزدوروں کو آرام لینا ضروری ہے۔ لیکن اصل کی حالت اس سے مختلف ہے۔ بجز اُس اصل کے جو جانوروں کی شکل میں پایا جاتا ہے، باقی تمام اصل سے شب و روز

بلا توقف کام لے سکتے ہیں۔ نہ اُسے وقفے اور آرام کی ضرورت، اور نہ
اس پر کسی خاص موسم کا کوئی اثر۔ چنانچہ بسا اوقات گرم بازاری کے
زمانے میں کارخانے دن رات برابر کام کرتے ہیں۔ مزدور تو باری
باری سے بدلتے رہتے ہیں لیکن مشینیں اور دوسرا تمام اصل یکساں کام
کرتا رہتا ہے۔

اصل کی قسمیں

اصل کی قسمیں۔ اگر ہم اپنے استعمال کی مختلف اشیا پر
غور کریں تو بہ لحاظ دیرپائی اور سریع الزوالی کے ہیں اُن کے بیشمار درجے
نظر آئیں گے۔ بعض چیزیں تو صرف ایک ہی مرتبہ کے استعمال سے بیکار ہو جاتی
ہیں جیسے غذا۔ بعض چند مہینے یا سال ڈیڑھ سال کام دے کر ناکارہ ہو جاتی
ہیں جیسے روزمرّہ استعمال کے کپڑے، اور بعض کئی کئی سال تک کام
دیتی رہتی ہیں جیسے مکان، گاڑی، فرنیچر وغیرہ۔ بالکل یہی حال ہماری
ان اشیا کا ہے۔ جن سے ہم براہِ راست احتیاجات رفع نہیں کرتے
بلکہ جنھیں بطورِ اصل استعمال کرتے ہیں۔ جو اصل عملِ پیدائش میں صرف
ایک ہی مرتبہ استعمال ہو کر اپنا کام ختم کر دے، اُسے ہم اصلِ دایر کہتے
ہیں۔ اس کے برعکس جو اصل ایک مرتبہ سے زاید استعمال میں آسکے
وہ اصل قایم کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی ریلوے کمپنی کے اصل پر
نظر ڈالیے۔ اس میں ایک طرف تو کوئلہ، تیل اور روپیہ ہے جو ہفتہ وار
یا ماہانہ ملازمین ریلوے کو اجرتوں یا تنخواہوں کی شکل میں تقسیم کیا جاتا
ہے۔ دوسری طرف ریلوں کا وہ عظیم الشان اثاثہ ہے جو انجنوں،

ڈبوں، اور عمارات وغیرہ کی شکل میں موجود ہوتا ہے پہلی قسم کی چیزیں اصلِ دایر اور دوسری قسم کی اصلِ قایم کہلاتی ہیں۔ کیونکہ جب ایک مرتبہ استعمال ہو چکا تو پھر اُس سے دوبارہ وہی کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہی حال تیل اور اجرتوں میں تقسیم ہونے والے روپے کا ہے۔ اِس کے بعکس ریلوے انجن، اسٹیشن، اور ریل گاڑیاں، سالہا سال تک ریلوے کے کاروبار میں اپنا کام انجام دیتی رہتی ہیں۔ اسی طرح کسی پارچہ بافی کے کارخانے پر نظر ڈالیے۔ روئی، کوئلہ، اور دوسری خام پیداواریں، مع اُس روپے کے جو اجرتوں وغیرہ کی ادائیگی میں صرف ہو، اصلِ دایر میں شامل ہیں۔ کارخانے کا مکان، اُس کے جملہ آلات واوزار، اور اُس کی مشینیں اصلِ قایم ہیں۔ کاشتکار، اُس کے مویشی، اور دوسرے زرعی آلات اصلِ قایم ہیں تخم اور کھاد اصلِ دایر ہیں۔

واضح رہے کہ آجکل تقسیمِ عمل کی کثرت اور مشین کے رواج کی بدولت ہر قسم کے کاروبار میں اصلِ قایم کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں کاروبار کی ترقی کا لب لباب ہی یہ ہے کہ ہر کام چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو۔ جو جو کام مشین کے ذریعے سے انجام پا سکتے ہیں اُن کے لیے مشین ایجاد ہو اور مال کثیر سے کثیر مقدار میں تیار ہو تاکہ اس کے مصارفِ پیدایش کم سے کم رہیں اور وہ ارزان سے ارزاں قیمت پر فروخت ہو سکے۔ اِن تمام رجحانات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ

کاروبار میں اصلِ دایر و اصلِ قایم کی مقداروں کا تناسب بہت کچھ بدل گیا اور بدلتا جا رہا ہے ۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ کوئی کاروبار بغیر دو نو قسم کے اصل کے نہیں چل سکتا ۔ لیکن یہ بھی بدیہی ہے کہ ہر کاروبار میں اصلِ قایم کی مقدار اصلِ دایر کی مقدار سے بہت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

تنظیم

تنظیم سے کس نوعیت کے کام مراد ہیں اور آج کل پیدائش دولت کے لیے تنظیم کی کیا اہمیت ہے، عاملین پیدائش کے عنوان میں ہم اس کی کافی توضیح کر چکے ہیں۔ اب ہم اُن امور کی مفصل تشریح کرنا چاہتے ہیں جو اجروں یعنی تنظیم کا کام کرنے والوں کے ہمیشہ پیش نظر رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم خاصکر مندرجۂ ذیل مسائل کی کیفیت بیان کریں گے: تقسیم عمل۔ مشین کا استعمال۔ پیدائش بر پیمانۂ کبیر۔ تخصیص صنایع۔ قانون بدل۔

تقسیم عمل

تقسیم عمل۔ تمدنِ انسانی کے ابتدائی دور میں ہماری احتیاجات نہ اسقدر کثیر تھیں اور نہ ان کی تکمیل کے لیے اسقدر اہتمام کی ضرورت تھی۔ ذرائع پیدائش بے حد قلیل اور معیار زندگی نہایت ادنی تھا۔ انسان کو قدرت پر بہت کم تصرف حاصل تھا۔ اس لیے نہ صنعت و حرفت کا کہیں وجود تھا، نہ آمد و رفت کے انتظامات تھے، اور نہ تجارت کی گرم بازاری تھی اور زراعت بھی انتہا درجے ادنی حالت میں تھی۔ آبادی چھوٹے چھوٹے دیہات میں منتشر تھی جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ

محض اپنے مقامی وسائل پر زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر گاؤں چند خاندانوں کا مجموعہ تھا اور ہر خاندان اپنے افراد کی جملہ ضروریات کا خود کفیل۔ بالفاظ دیگر ہر خاندان کے افراد کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لیے جو جو اشیاء مطلوب ہوتی تھیں، اُن کی تیاری اور بہم رسانی کے وہ خود ہی ذمہ دار تھے۔ دوسروں کی بنائی ہوئی اشیاء سے اپنی احتیاج رفع کرنا اور اپنی بنائی ہوئی اشیاء دوسروں کے حوالے کرنا، اس طریق کا ابھی کوئی رواج نہ تھا۔

جب انسانی تمدن نے اس ابتدائی حالت سے آگے قدم بڑھایا تو سب سے پہلے جو قابلِ لحاظ تغیر واقع ہوا، وہ دیہاتی آبادی کا مختلف پیشوں میں تقسیم ہونا تھا۔ اور یہی گویا تقسیم عمل کا پہلا زینہ تھا۔ اس تقسیم کے بعد ہر شخص اہل قریہ کی ضروریات میں سے کسی ایک ضرورت کی بہم رسانی کا ذمہ دار قرار پا جاتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی یا خاندانی استعمال کے لیے چیزیں تیار نہیں کرتا بلکہ دوسرے لوگ اس کی محنت کے نتائج سے مستفید ہوتے، اور معاوضے میں اس کو کچھ اور چیزیں ادا کرتے ہیں اور یہیں سے لین دین یا مبادلے کی ابتدا ہوتی ہے۔ تقسیم عمل کے اس دورِ اول میں ہر شخص اپنے آپ کو صرف کسی ایک چیز کی پیدائش کے لیے وقف کر دیتا ہے اور گاؤں کی آبادی میں کسان، معمار، نجار، خیاط، لوہار، سنار، کمہار، موچی، اور پارچہ باف جیسے پیشہ ور اور دھوبی، حجام اور خاکروب جیسے خدمتگار رشتہ دار ہو جاتے ہیں اوّلاً تو لوگ دو دو تین تین

۲ے

پیشے ساتھ ساتھ چلاتے ہیں۔ لیکن جب گاؤں کی آبادی اسقدر بڑھ جائے اور مصارف باربرداری اسقدر ارزاں ہو جائیں کہ وہاں کئی کئی اشخاص اپنا تمام وقت محض کسی ایک چیز کی تیاری میں صرف کر سکیں تو پھر تقسیم عمل کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ایک ہی چیز کی تیاری کے لیے جو مختلف کام انجام دینے پڑتے ہیں، اُن میں سے ہر کام ایک جداگانہ مزدور کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً جوتا بنانے کے لیے ایک شخص چمڑا کاٹتا ہے، دوسرا اسے صاف کرتا ہے، تیسرا مختلف ٹکڑوں کو ملا کر سیتا ہے، چوتھا ایڑی بناتا ہے، پانچواں تلا تیار کرتا ہے، چھٹا کیلیں جڑتا ہے، ساتواں پالش لگاتا ہے، یہ تقسیم اسی طرح جاری رہتی ہے حتیٰ کہ بڑے بڑے کارخانوں میں جہاں مشین استعمال ہوتی ہے کوئی جوتا اُسوقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ایک سو سے زاید مزدوروں کے ہاتھوں سے نہ گذر لے۔ یہی حال سوتی اور اونی پارچہ بافی، گھڑی سازی، مشین سازی، اور طرح طرح کی دوسری صنعتوں کا ہے۔ پس تقسیم عمل پیدائش دولت کا ایک طریقہ ہے جس کے مطابق ہر چیز کی تیاری متعدد کاموں میں تقسیم کی جاتی ہے اور ان میں سے ہر کام ایک جداگانہ مزدور کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور بالعموم وہی کام اُس کے سپرد کیا جاتا ہے جس کے لیے وہ خاص طور پر موزوں ثابت ہو۔ بہ الفاظ دیگر ہر ہر مزدور اپنی اپنی موزونی طبع اور مشق کے مطابق ایک ایک جزو کی تیاری میں منہمک رہتا ہے اور ان سب کے اتحاد سے ایک مکمل چیز تیار ہو جاتی ہے۔

تقسیم عمل کی ایک اور قابل لحاظ صورت وہ ہے جسے افقی تقسیم عمل کہا جاتا ہے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ملک یا ایک ہی ملک کے مختلف مقامات صرف وہی اشیا تیار کریں جنھیں وہ کمترین مصارف کے ساتھ پیدا کر سکتے ہیں ۔ اور پھر بذریعۂ مبادلہ ہر مقام دوسرے مقامات کی پیداواروں سے مستفید ہو ۔ تجارت خارجہ کی ساری جد و جہد درحقیقت اسی فایدے پر مبنی ہے ۔ اس کی بدولت ہر ملک مقابلۃً ارزاں قیمت پر ایسی چیزیں حاصل کر لیتا ہے جو یا تو وہاں پر پیدا نہیں ہو سکتیں یا اگر ہوں بھی تو گراں مصارف سے ۔

تقسیم عمل کے فواید

تقسیم عمل کے فواید ۔ تقسیم عمل کی بدولت دشوار، پیچیدہ، اور طاقت طلب کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر آسان ہو جاتے ہیں ۔ کام کے دشوار اور آسان حصے علیحدہ ہو جانے سے ہر ہر مزدور سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جا سکتا ہے ۔ اسی سہولت کا یہ نتیجہ ہے کہ آجکل اکثر کارخانوں میں مزدوروں کے ساتھ ساتھ عورتیں اور بچے بھی مصروفِ کار نظر آتے ہیں اور ہر شخص سے پورا پورا کام اور صرف وہی کام لیا جاتا ہے جس کے لیے وہ خاص طور پر موزوں ہو ۔ یہ تقسیم ایک طرف تو تخفیف مصارف کی شکل میں آجر کے لیے مفید ہوتی ہے اور دوسری طرف خاندانی اجرتوں میں اضافہ ہونے سے وہ مزدوروں کے حق میں بھی نفع بخش ہے ۔ ظاہر ہے کہ عورتوں اور بچوں کو بالعموم اسقدر اجرتیں نہیں ملتیں جسقدر کہ مردوں کو ملتی ہیں ۔ پس جو جو کام عورتوں اور بچوں کے

ذریعے سے انجام پا سکتے ہیں وہ مردوں کو نہیں دیے جاتے تقسیم عمل کی بدولت عورتوں اور بچوں کے لایق کام بکثرت نکل آتے ہیں اور اجرتوں کی تخفیفِ اجرت کی شکل میں بہت بڑی بچت ہوتی ہے۔ لیکن یہ بچت مزدوروں کے حق میں نقصان رساں نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ عورتوں اور بچوں کی مسابقت سے مردوں کی اجرتوں میں کمی واقع ہوتی ہے لیکن عورتوں اور بچوں کے نوکر ہو جانے سے نہ صرف اس نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے بلکہ خاندان کی مجموعی آمدنی میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کام تقسیم ہوتے ہوتے اسقدر آسان ہو جائیں کہ محض اُن کا بار بار دُھرانا کافی ہو جایے تو پھر ایسے کاموں کے لیے بہت جلد کوئی مشین ایجاد ہو جاتی ہے اور مشین کا استعمال پیدایش دولت کے لیے کس درجہ مفید ہے اس کا حال ہم آیندہ عنوان میں بیان کرینگے۔

تقسیم عمل کے طریقے پر کام کرنے والے مزدوروں کو جو مہارت حاصل ہوتی ہے، وہ دوسرے مزدوروں کو میسر نہیں ہو سکتی۔ جسقدر انسان کو کسی کام کی مشق ہوتی ہے اسیقدر وہ اس میں کمال پیدا کرتا ہے۔ تقسیم عمل کے تحت ہر مزدور ہمیشہ صرف ایک ہی کام کرتا رہتا ہے۔ لھذا اُسکے کام کو بار بار دھرانے سے اس کی مہارت میں غیر معمولی اضافہ، اور اس کے کام میں بے حد صفائی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) وقت کی بچت اور اصل کی کفایت، یہ بھی تقسیم عمل کی نمایاں خصوصیات

ہیں۔ جب کوئی مزدور شروع سے آخر تک کوئی چیز تیار کرتا ہے تو اُسے چیز تیار ہونے تک متعدد کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ پس ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا کام شروع کرنے تک جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بسا اوقات بہت زیادہ ہوتا ہے اور اُس کی بچت خاصکر اس دورِ مسابقت میں بہت ہی فایدہ مند ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر کام کے لیے جُدا جُدا آلات و اوزار استعمال کیے جاتے ہیں لھذا جس وقت تک کہ مزدور ایک کام میں مشغول رہے، دوسرے کاموں کے آلات و اوزار بیکار پڑے رہتے ہیں اور یہ صورت پیدایش دولت کے لیے مضر ہے۔ تقسیم عمل کی بدولت ایک طرف تو وہ تمام وقت بچ جاتا ہے جو کاموں اور آلات و اوزار کے بدلنے صرف ہوتا ہے اور دوسری طرف کارخانے کے اصل کا کوئی جزو ایک لمحے کے لیے بیکار نہیں رہتا۔

(۳) تقسیم عمل کا ایک اور قابل لحاظ فایدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت مشینوں اور ان کے طریق استعمال میں اصلاح و ایجاد کے بہ کثرت مواقع نکل آتے ہیں۔ جو شخص اپنا تمام وقت صرف کسی ایک مشین کے پیچھے صرف کرے، اُس کو یہ سوچنے کا بہت زیادہ موقعہ ملتا ہے کہ کیونکر اُس مشین میں کوئی نئی بات پیدا کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مشینوں کی اکثر و بیشتر اصلاحات خود مزدوروں ہی کی ایجاد ہیں۔

تقسیم عمل کے مذکورۂ بالا فوائد کا خلاصہ ہم بغرض سہولت ذیل میں درج کرتے ہیں :-

(۲) دشوار کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو کر آسان ہو جاتے
ہیں جس کی وجہ سے :

(i) ہر شخص سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جا سکتا ہے۔

(ii) آجر کے مصارف میں کمی اور مزدور کی خاندانی آمدنی میں اضافہ
ہوتا ہے۔

(iii) مشین کا استعمال ممکن ہوتا ہے۔

مشق کی بدولت مہارت بڑھتی ہے (۳) کام اول اور آلات و اوزار کے
بدلنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بچ جاتا ہے (۴) اصل کی
کفایت ہوتی ہے۔ (۵) مشینوں میں اصلاح و ایجاد کے مواقع
نکل آتے ہیں۔

نوٹ :- واضح ہو کہ تقسیم عمل سے صرف اُس حالت میں
فائدہ ہو سکتا ہے جبکہ کام کی کثرت ہو ورنہ سب مزدور پورے طور
مصروف نہ رہ سکیں گے۔ "اگر کام کی مقدار قلیل ہے تو ایک آدمی کا
کام بہت سے لینا سراسر فضول ہے" (علم المعیشت)

تقسیم کے نقایص

تقسیم عمل کے نقایص۔ تقسیم عمل کے طریقے میں بہت سے
نقایص بتائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم اُن کا بھی ایک مختصر خاکہ ذیل میں
پیش کرتے ہیں :-

(۱) تقسیم عمل کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُس کی وجہ سے
مزدور کی واقفیت کا دایرہ بہت ہی تنگ ہو جاتا ہے۔ بجز اپنی

انتہا درجے مختصر قابلیت کے، جو کہ ایک نہایت ہی جزئی کام کے انجام دینے میں اُسے حاصل ہوتی ہے، وہ دنیا کی کسی اور چیز سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ ایک محض وہمی اعتراض ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایک کام میں خصوصیت کے ساتھ مہارت پیدا کرنا چاہے تو اُس کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ بجز اُس ایک کام کے دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہے۔ مثال کے طور پر کسی ڈاکٹر کو لیجیے جو صرف آنکھ کے امراض اور اُن کے علاج کا ماہر ہے۔ کیا کوئی سمجھ دار شخص ایسے ڈاکٹر یا اسی قسم کے کسی اور ماہر کی محدود قابلیت پر معترض ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ترقی یافتہ ممالک کے پڑھے لکھے مزدوروں پر تو اس اعتراض کا اور بھی کم اطلاق ہوتا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف کسی ایک جزئی کام کے خاص طور پر ماہر ہوتے ہیں بلکہ ان کی عام معلومات کا معیار بھی کافی بلند ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ایک ہی مختصر کام بار بار دھرانے سے مزدور کو اپنے پیشے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ اور اُسے بہت جلد کام کا نکان محسوس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً جس شخص کی ساری عمر محض پنوں کی نوک بنانے میں گذر جائے، اُسے دنیا میں کیا حظ و لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ اعتراض بھی عملاً کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ تقسیم عمل اور چند دیگر اسباب کی وجہ سے جب دولت بہ افراط پیدا ہونے لگی تو کام کے اوقات میں بھی تخفیف شروع ہو گئی۔ چنانچہ جو مزدور چند سال پیشتر دس دس بارہ بارہ گھنٹے بلا چون و چرا محنت کرتے تھے، وہ آج سات یا آٹھ

گھنٹے بھی کام کرنا پسند نہیں کرتے اور نہایت شدت کے ساتھ اس بات کے طالب ہیں کہ اُن سے روزانہ صرف چھ گھنٹے کام لیا جائے۔ نتیجہ یہ کہ اب مزدوروں کو دوسرے اشغال کے لیے بہت کافی وقت ملتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ تقسیم عمل کا طریقہ اُن کے حق میں وبالِ جان ثابت ہو، وہ اُن کی زندگی کو پہلے سے زیادہ پُرلطف اور آرام دہ بنا دیتا ہے۔

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جو شخص صرف ایک ہی کام سے واقف ہو اور اسکا کام کسی وجہ سے نفع بخش نہ رہے، تو وہ اپنی محدود قابلیت کے باعث کوئی اور پیشہ بہ آسانی نہیں اختیار کرسکتا۔ لیکن یہ بھی محض ایک سطحی دھوکہ ہے۔ تقسیم عمل کے اثر سے تو اکثر و بیشتر کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو کر آسان ہو جاتے ہیں اور اُن کا سیکھنا بجائے مشکل ہونے کے پہلے سے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

(۴) تقسیم عمل کی بدولت کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے کام لینے کا جو امکان پیدا ہو گیا ہے، وہ بسا اوقات نہایت ہی خطرناک معاشرتی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ یہ بھی تقسیم عمل کا ایک نقص ہے بلاشبہ ایک حقیقی مضرت ہے۔ اور تقسیم عمل کے ابتدائی زمانہ میں اس سے کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ لیکن حکومت کی مؤثر نگرانی اور قوانین کارخانہ جات کی مدد سے اس خرابی کی بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔

مشین کا رواج

مشین کا رواج۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو عقل کی صورت میں ایک ایسا اسم اعظم عطا کیا ہے جس کی بدولت وہ دوسری تمام

مخلوقات کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا کر اپنے شرف کا عملی طور پر ثبوت دیتا ہے۔ حیوانات، نباتات، جمادات، اور قدرت کے تمام عطیات و وسائل، گویا اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ انسان کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال بنائیں۔ چنانچہ آغاز آفرینش سے اب تک انسان کی عظیم الشان مادی ترقی کا ماحصل بجز اس کے کچھ نہیں کہ اُسے قدرت پر روز افزوں تصرف حاصل ہو رہا ہے۔ یہ تصرف حاصل کرنے کے لیے کبھی تو وہ جانوروں کی طاقت سے کام لیتا ہے، کبھی ہوا اور پانی کی قوت محرکہ سے کام نکالتا ہے، کبھی بھاپ اور دوسری گیسوں میں جو پھیلاؤ کی قوت موجود ہے، اُس کو مفید مطلب بناتا ہے اور کبھی برقی طاقت استعمال کرتا ہے۔ مشین کی ایجاد بھی درحقیقت قدرت ہی پر تسلط حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن وہ ایسا قوی ذریعہ ہے کہ اُس کی بدولت جو کام کبھی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے، وہ واقعات کی شکل میں ہماری نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

تقسیم عمل کے فوائد میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ جب کوئی کام چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے تو اس کے اکثر حصوں کے لیے محض دُھرانا کافی ہو جاتا ہے اور ایسے حصے بالعموم مشین کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ گویا کسی کاروبار میں مشین کا استعمال بہت کچھ تقسیم عمل کے امکان پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن کاموں میں تقسیم عمل کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی، اُن میں مشین سے بہت کم کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زراعت

اور تعمیرات کی بھی حالت ہے۔ اس کے برعکس صنعت و حرفت اور ذرایع
بار برداری میں جسقدر تقسیم عمل کی زیادہ گنجایش ہے، اسی قدر مشین کا
استعمال بھی روز افزوں ہے۔

استعمال فواید

استعمال مشین کے فواید۔ (۱) مشین ایسے کام انجام دیتی ہے
جو انسان کی طاقت سے بالا تر ہیں۔ مثلاً کئی کئی ہزار گھوڑوں کی طاقت
ایک چھوٹی سی جگہ پر مہیا کر دینا، لاکھوں من بوجھ نہایت سرعت کے ساتھ
دور دراز مقامات پر منتقل کر دینا، فولاد نہایت آسانی کے ساتھ ڈھال لینا
(۲) مشین بعض انتہا درجے نازک کام بھی کرتی ہے۔ مثلاً بال کا
قطر ناپنا، ایک سکنڈ کا ہزارواں حصہ قلمبند کرنا، ایک انچ کو ہزار مساوی
حصوں میں تقسیم کرنا، ظاہر ہے کہ انسان کے ہاتھ اور اس کی آنکھیں ان
کاموں کے ناقابل ہیں۔

(۳) تیسری صفت یہ ہے کہ مشین اپنا کام جس سرعت کے ساتھ
پورا کرتی ہے، وہ انسان سے ممکن نہیں۔ معمولی سنگر مشین ہی کو لیجیے
کیا اس زمانے میں کوئی درزی محض ہاتھ سے سلائی کرکے روزی کما سکتا
ہے؟ جب انسان کی طاقت سے چلنے والی سنگر مشین کی یہ کیفیت ہے تو
جو مشینیں بھاپ یا برق کی قوت سے چلتی ہیں، ان کی سرعت کا کیا حال ہوگا
چنانچہ ایک گھنٹے میں ڈھائی لاکھ دیا سلائیاں بنانا یا بیس میل لمبا کاغذ
چھاپنا، مشین کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔

(۴) مشین کے ذریعے جو اشیا تیار ہوتی ہیں وہ اسقدر ایک

دوسرے کے مشابہہ ہوتی ہیں کہ ان میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔
اسی یکسانیت کی وجہ سے لوگ محض نمونہ دیکھ کر چیزوں کی فرمایش
کردیتے ہیں۔ انھیں کامل اطمینان ہے کہ ان کی مطلوبہ اشیا بالکل نمونے کے
مطابق ہوں گی۔ اس یکسانیت کا ایک اور بڑا فایدہ یہ ہے کہ اس کی
وجہ سے دور دراز مقامات میں مشین کا رواج شروع ہوجاتا ہے۔ مثلاً
اگر موٹر کار کا کوئی پرزا خراب ہوجائے تو ہم کسقدر آسانی کے ساتھ
اس کی جگہہ دوسرا پرزا خرید کر لگادیتے ہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو
ہمیں اپنے طور پر اُسی قسم کا دوسرا پرزا تیار کرانا کس قدر دقت طلب ہوتا!

(۵) مشین کے رواج سے پیشہ بدلنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے۔
اگرچہ مختلف کاروبار میں مختلف قسم کی مشینیں استعمال ہوتی ہیں تاہم جو
شخص ایک مشین کے کل پرزوں اور اُن کے استعمال سے واقف ہوتا ہے
وہ ذرا سی توجہ اور تھوڑی سی مشق سے کوئی دوسری مشین بھی چلا سکتا ہے
اس غرض سے آجکل مختلف مشینوں کی ساخت میں جہاں تک ممکن ہوسکے
مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۶) مشین کی بدولت آج نہایت معمولی قابلیت کے لوگ ایسے
ایسے کام کرلیتے ہیں جو پہلے انتہا درجے مہارت طلب تصور کیے جاتے
تھے اور جن کو سیکھنے کے لیے سالہا سال تک سخت مشقت اٹھانی پڑتی
تھی۔ مشین کی بدولت تخصیص یافتہ دستی مہارت کی طلب میں تو تخفیف
ہوجاتی ہے۔ لیکن عام واقفیت اور سمجھ کی اس میں زیادہ ضرورت

ہوتی ہے۔

مشین کا اثر مزدوروں پر

مشین کا اثر مزدوروں پر۔ بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی نئی مشین ایجاد ہوئی تو مزدوروں کی جانب سے اُس کی مخالفت کی گئی۔ بعض اوقات تو یہ مخالفت اسقدر شدید ہوتی تھی کہ مزدور مشینوں کو تباہ کرنے کے درپے ہوجاتے تھے۔ بدیہی طور پر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید مشین کا رواج مزدوروں کے حق میں ضرررساں ہے۔ واضح رہے کہ اس مسئلے پر مغربی ممالک میں اسقدر خامہ فرسائی کی گئی ہے کہ یہاں اُسکا خلاصہ بیان کرنے کی بھی گنجایش نہیں ہے۔ ہم صرف چند اہم شکایتوں کو لیکر، جو کہ خاصکر مزدوروں کی حالت سے متعلق ہیں، نہایت اختصار کے ساتھ یہ دریافت کریں گے کہ وہ کس حد تک حق بہ جانب ہیں۔

(۱) مشین کے خلاف ایک بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ اُس کی وجہ سے اجرتوں میں تخفیف ہوجاتی ہے۔ بلاشبہہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ تقسیم عمل اور استعمال مشین کی بدولت بہت سے کام جو پہلے صرف مردوں کے لیے مخصوص تھے، وہ عورتوں اور بچوں کے ذریعے سے، جن کی اجرتیں بالعموم مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں، انجام پاسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ مرد بھی ادنی اجرتیں قبول کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لیکن ہم تقسیم عمل کی بحث میں یہ واضح کرچکے ہیں کہ گو انفرادی طور پر اجرتیں کم ہوجاتی ہیں بحیثیت مجموعی مزدوروں کی خاندانی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ

ہو جاتا ہے کیونکہ کام آسان ہونے سے اب عورتیں اور بچے بھی خاندانی آمدنی بڑھانے میں مردوں کا ہاتھ بٹانے لگتے ہیں۔ مزید براں جو اشیا مشین کے ذریعے سے تقسیم عمل کے طریقے پر بنائی جاتی ہیں، وہ بہت ارزاں قیمتوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ لھذا اگر مزدوروں کو تخفیف اجرت کی شکل میں کوئی نقصان پہنچے تو اس کی تلافی ایک حد تک ارزاں قیمتوں کی مدد سے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ صرف اسی حالت میں ممکن ہے جبکہ مشین کی بنی ہوئی اشیا مزدوروں کے استعمال میں آئیں۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ مزدور مشین کی بنی ہوئی چیزیں بہت کم میسر ہوتی ہیں۔ انکی آمدنی کا بیشتر حصہ اشیائے خوراک پر صرف ہوتا ہے اور اشیائے خوراک کا ماخذ زراعت ہے جسمیں مشین کے استعمال کو بہت کم دخل ہے۔ ممکن ہے مشین کے ابتدائی زمانے کے متعلق یہ اعتراض درست ہو لیکن مغربی ممالک کا تجربہ شاہد ہے کہ مشین کا رواج بالآخر خود مزدوروں کے حق میں بھی مفید ہے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ آج مشین کی بنی ہوئی انواع واقسام کی چیزیں بکثرت مزدوروں کے استعمال میں آتی ہیں۔

(۲) مشین کے خلاف دوسرا زبردست اعتراض یہ ہے کہ وہی مزدور کی بیکاری کا بڑا باعث ہے۔ مشین جس سرعت کے ساتھ مال تیار کرتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ایسی حالت میں ہر کارخانہ دار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، مزدوروں کی تعداد کم کرکے ان کا کام مشین سے لے کیونکہ اس ترکیب سے نسبتاً بہتر مال کثیر مقدار میں جلد تر تیار ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ مشین کے رواج سے مزدور

پیدا ہوئے بڑی بڑی سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں بلکہ بسا اوقات فاقہ کشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ نتیجہ خاصکر اُس حالت میں اور بھی زیادہ نمایاں ہوتا ہے جبکہ مشین کا رواج بہ تدریج نہیں، بلکہ سرعت سے ہوتا ہے۔ لیکن قابل لحاظ امر یہ ہے کہ مزدوروں پر یہ سختی کا زمانہ محض عارضی ہوتا ہے۔ اول تو مشین کی بدولت اشیا کی قیمتوں میں تخفیف ہونے سے طلب میں اسقدر عظیم الشان اضافہ ہوتا ہے کہ پہلے سے بہت زیادہ مزدور بالآخر کام سے لگ جاتے ہیں دوسرے یہ کہ کاروبار کی کامیابی سے سرمایہ داروں کو جو زبردست منافع حاصل ہوتا ہے اس کا بھی کسی نہ کسی کام میں مصروف ہونا ضروری ہے۔ یا تو وہ اسی کاروبار کی مزید توسیع میں لگایا جائیگا یا دوسری نئی نئی صنعتیں جاری کرنے میں صرف ہوگا۔ لیکن مزدوروں کے لیے ہر حالت میں کسب معاش کے جدید راستے نکل آئیں گے۔ تیسرے یہ کہ اگر ایک طرف مشین کی وجہ سے کچھ لوگ عارضی طور پر بیکار ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف خود مشین سازی کے کارخانوں میں کام کرنے کے لیے ہزاروں مزدور درکار ہوتے ہیں اور اس طرح مجموعی حیثیت سے بیکاری بہت زیادہ نہیں پھیلنے پاتی۔ چوتھے یہ کہ جوں جوں مشین کا رواج پھیلتا جاتا ہے کام کے اوقات میں بہ تدریج تخفیف ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر صنعتوں میں جہاں روزانہ بارہ یا چودہ گھنٹے کام ہوتا تھا اب صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مزدور بھی

جانب سے چھ گھنٹے والے دن کا مطالبہ نہایت شد و مد سے جاری ہے اس طور پر مزدوروں کو جو فرصت حاصل ہوتی ہے وہ سیر و تفریح کے نئے نئے مشاغل میں صرف ہوتی ہے اور ان نئی احتیاجات کی تکمیل کے لیے مزید نئی نئی اشیا مہیا کرنی پڑتی ہیں جنکی تیاری کے لیے کثیر تعداد میں مزدور درکار ہوتے ہیں۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک طویل مدت پیش نظر رہے تو مشین کے رواج سے معیار زندگی بلند، اور تہذیب و تمدن میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ صرف اسی وقت برآمد ہوتا ہے جبکہ محنت داخل ضروری تغیرات کے بعد جدید حالات و اثرات کے ساتھ مطابقت پیدا کریں اور جس اثنا میں کہ یہ مطابقت مکمل ہوتی رہتی ہے مزدوروں کو لازمی طور کچھ نہ کچھ سختی اٹھانی پڑتی ہے۔ البتہ اگر یہ تغیر زیادہ تیزی کے ساتھ ظہور پذیر ہو تو مزدوروں کی مشکلات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔

پیدائش بر پیمانۂ کبیر۔ تقسیم عمل کی غیر معمولی ترقی اور مشین کے روز افزوں استعمال کا اثر کاروبار کے پیمانے پر پڑنا ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک شعبۂ پیدائش میں بڑے بڑے کاروبار جس کثرت سے آجکل نظر آتے ہیں، وہ اس سے پہلے مفقود تھے۔ خاصکر ترقی یافتہ ممالک کی دولت کا تو اکثر و بیشتر حصہ آجکل ایسے ہی کارخانوں میں پیدا ہوتا ہے۔ صنعت و حرفت، کان کنی، جہازرانی، بنک کاری، تھوک فروشی، غرض ہر ایک کاروبار میں عاملین پیدائش کی بڑی بڑی مقداریں کام میں لگی

پیدائش بر پیمانۂ کبیر

ہی میں جس کی وجہ سے مال بھی کثیر مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ اور
کاروبار پر منافع بھی خوب حاصل ہوتا ہے۔ معاشی ترقیات کے موجودہ
دور سے پیشتر اول تو کاروبار ہی نسبتاً بہت کم تھے اور جسقدر کاروبار
ہوتے بھی تھے وہ زمین و محنت و اصل کی بہت تھوڑی ہی مقداروں
سے جاری ہو سکتے تھے۔ لیکن زمانہ موجودہ کے رجحانات چھوٹے چھوٹے
کاروبار کے سراسر مخالف ہیں۔ آجکل اگر کوئی کاروبار جاری کرنا مقصود ہو تو
بہ لحاظ اس کی نوعیت کے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے لیے وسیع
زمین مہیا کی جائے، لاکھوں روپیہ کا اصل فراہم کیا جائے، اور ہزاروں کی
تعداد میں مزدور نوکر رکھے جائیں۔ تب کہیں جاکر کام شروع کیا جا سکتا ہے
جو کام عاملین پیدائش کی تھوڑی مقداروں سے یعنی بر پیمانہ صغیر
شروع کیا جائیگا وہ اپنے بڑے حریفوں کے مقابلے میں کامیابی کے ساتھ
قائم نہیں رہ سکیگا۔ ایسے کاروبار کو یا تو بند کرنا پڑیگا یا کسی بڑے کاروبار
میں ضم کر دینا ہوگا۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر کی گوناگوں کفایتوں پر نظر ڈالنے
سے اس امر کی توضیح ہو جائے گی۔

پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فواید

پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فواید۔۔ (۱) پیدائش بر پیمانہ کبیر
کی سب سے پہلی خوبی یہ ہے کہ زمانہ حال کے بہت سے ناگزیر کاروبار
بجز اس طریقے کے چل ہی نہیں سکتے۔ کیا کوئی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ
تھوڑی سی زمین لیکر معمولی آلات و اوزار اور دس پانچ مزدوروں کی
مدد سے موٹر سازی کا کاروبار جاری کر سکیگا۔ کان کنی، جہازرانی ریلوے

اور اُن کے علاوہ بیسیوں اور کاروبار ایسے موجود ہیں جو اگر چل سکتے ہیں تو صرف پیدائش بر پیمانہ کبیر کے طریقے پر۔ عاملین پیدائش کی تھوڑی تھوڑی مقداریں لیکر ایسے کاروبار جاری کرنے کا خیال عبث ہے۔

(۲) تقسیم عمل اور استعمال مشین کے گوناگوں فواید کا ہم اچھی طرح ذکر کر آئے ہیں۔ ان فواید سے پورے پورے طور پر استفادہ کرنا پیمانہ کبیر ہی کی صورت میں ممکن ہے۔

(۳) کفایت زمین۔ اگر کسی کارخانے میں سو گنی زیادہ جگہ حاصل کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ موجودہ سطح زمین سے سو گنی زیادہ زمین خریدی یا کرایہ پر لی جائے۔ بڑے کارخانوں میں نہ کوئی مشین کسی وقت بیکار رہتی ہے اور نہ پیداوار خام کا کوئی جزو بیکار پڑا رہتا ہے۔ ہر چیز کی تیاری کا سلسلہ بغیر ایک لمحے کے وقفے کے ابتدا سے اختتام تک برابر جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑا کارخانہ زمین کا جو کرایہ ادا کرتا ہے وہ اگرچہ ایک چھوٹے کارخانہ کے کرایہ سے فی نفسہ زیادہ ہوتا ہے تاہم مجموعی منافع کے لحاظ سے وہ نسبتاً کم ہوتا ہے۔

(۴) کفایت محنت۔ بڑے کاروبار میں بہ حیثیت مجموعی محنت کم صرف ہوتی ہے۔ اگر کسی چھوٹے کاروبار کے لیے ایک محرر، ایک محاسب، اور ایک منیجر کی ضرورت ہے تو اس سے دس

بڑے کاروبار کے لیے دس محرر، دس محاسب، اور دس منیجر درکار ہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ صرف چار محرر، دو محاسب، اور تین منیجر کافی ہو جائیں۔ مزید براں بڑے بڑے کارخانوں کو اعلیٰ درجے کے کارنیجر جس آسانی کے ساتھ ملجاتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کو نہیں ملتے۔

(۵) کفایت اصل۔ چھوٹے کارخانون میں تقسیم عمل کی زیادہ گنجایش نہیں ہوتی۔ ایک ایک مزدور کو کئی کئی قسم کے متعدد کام انجام دینے پڑتے ہیں اور چونکہ ہر کام کے لیے جداگانہ آلات واوزار درکار ہوتے ہیں اس لیے جب تک چند آلات واوزار زیر استعمال رہتے ہیں، اس وقت تک دوسرے آلات واوزار بیکار پڑے رہتے ہیں۔ بڑے کارخانوں میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہاں ایک ایک مشین اور پیداوار خام کا ایک ایک جزو ہمیشہ زیر استعمال رہتا ہے۔ مزید براں ایک دس گنے بڑے مشین کے مصارف چھوٹے مشین کے مقابلے میں دس گنے زیادہ نہیں ہوتے۔

(۶) کفایت مصارف۔ بڑے کارخانے اپنے تمام ضروریات کثیر مقدار میں خریدتے ہیں۔ لھذا چھوٹے خریداروں کے مقابلے میں وہ ان کو کم قیمت پر ملجاتی ہیں۔ ریلوے اور جہازراں کمپنیاں بھی بڑے کارخانوں کو خاص خاص رعایتیں عطا کرتی ہیں تاکہ انہیں زیادہ کاروبار ملے۔ اشتہارات پر بڑے کارخانے جو

کثیر رقمیں صرف کرسکتے یا کرتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کے لیے ممکن نہیں۔

(۷) ذیلی پیداواروں کا استعمال:۔ بڑے کارخانوں میں ذیلی پیداواروں کو کام میں لاکر کثیر منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ مثلاً روئی اوٹنے کے بڑے کارخانوں میں بنولہ اس کثرت سے نکلتا ہے کہ اس سے تیل نکالنے کا کاروبار کامیابی کے ساتھ جاری کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح پٹرولیم صاف کرنے میں پرفین، نفتھا اور دوسری متعدد ذیلی پیداواریں اسقدر دستیاب ہوتی ہیں کہ ان کو نفع بخش طریقہ پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔

(۸) بڑے کارخانے اسقدر دولتمند ہوتے ہیں کہ وہ نئے نئے تجربوں پر لاکھوں روپیہ بہ آسانی صرف کرسکتے ہیں اور جب وہ کوئی نئی بات معلوم کرلیتے ہیں تو بذریعہ پٹینٹ اس کا حق استعمال محفوظ کراکر اپنے تمام مصارف کی تلافی کرلیتے ہیں۔

نوٹ:۔ مذکورۂ بالا گوناگوں فوائد کی بناء پر یہ خیال کرنا کہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوسکتی، غلط ہے اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو کسی ملک میں ایک ہی قسم کا کاروبار کرنے والے بڑے بڑے کارخانے اسقدر کثیر تعداد میں نظر نہ آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدائش بر پیمانہ کبیر پر بہت سی بندشیں موجود ہیں جو زیادہ فطرت انسانی کی کمزوریوں کا نتیجہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسے

رنیت کمیاب ہیں جو بحیثیت ملازمین کے اپنے آجر کا کام اسی
طرح ہی اور جوش و خروش سے انجام دیں جس سے وہ خود اپنا
کام انجام دیتے۔ ایک مزدور کو اپنے ذاتی کام میں جو دلچسپی ہوتی
ہے وہ اپنے آجر کے کام میں نہیں ہوسکتی۔ اور نہ اُسے آجر کے
نفع و نقصان کی اسقدر پرواہ ہوسکتی ہے جسقدر خود اپنے نفع و نقصان
کی۔ مزید براں خود انسان کی استعداد اور قابلیت محدود ہے۔
پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی کامیابی کا انحصار بہت کچھ افراد کی جدوجہد
ان کی حوصلہ مندی، اور ذہانت پر ہے اور ایسی خوبیوں والے
افراد بالعموم مشکل ہی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی
کاروبار ایک خاص حد تک تو ترقی کرجاتا ہے۔ لیکن اس سے آگے
نہیں بڑھ سکتا بلکہ اس کی موجودہ ترقی بھی بسا اوقات برقرار نہیں
رہتی جب وہ ادنی درجے کی قابلیت والے منتظمین کے ہاتھوں میں
منتقل ہوجاتا ہے۔ کچھ تو ان وجوہ سے اور کچھ پیدائش بر پیمانۂ صغیر
کے خاص فوائد کی وجہ سے، یہ آخرالذکر طریقہ دنیا سے نہ بالکل متروک
ہوا اور نہ ہوسکتا ہے بلکہ دوسرے طریقے کی عظیم الشان ترقی کے باوجود
بعض مخصوص کاروبار میں وہی ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے اور غالباً
آئندہ بھی رہیگا۔

تخصیص صنائع۔ ہم جانتے ہیں کہ اکثر کاروبار خاص خاص
مقامات کے ساتھ کچھ اس طور پر وابستہ ہوتے ہیں کہ اگر انھیں دوسرے

مقامات میں جاری کرنے کی کوشش کیجائے تو اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ مراد آباد کے برتن، اورنگ آباد کا ہمرو، بیدر کے بٹن، برار کی روئی، بنگال کا جوٹ، بریلی کا فرنیچر اور اسی قسم کی بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کسی خاص صنعت کا کسی خاص مقام کے ساتھ اسطرح وابستہ ہو جانا اسی کو اصطلاح میں تحصیر صنایع کہتے ہیں۔

تحصیر صنایع کے اسباب

تحصیر صنایع کے اسباب۔ تحصیر صنایع کے مختلف اسباب ہوتے ہیں جن کے منجملہ چند اہم اسباب ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں

(۱) خام پیداوار کی قربت۔ جمشید پور میں لوہے کا کاروبار جاری کرنے کی خاص وجہ بنگال میں کوئلے کی کانوں کا وجود ہے عثمان شاہی ملز کے لیے ناندیڑ کا انتخاب خاصکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہی ریاست حیدر آباد میں روئی کی پیداوار کا خاص مرکز ہے۔

(۲) قوت محرکہ کی رسد۔ نیگارا کے آبشاروں کے قریب بہت سی صنعتیں خاصکر اس لیے جاری ہیں کہ وہاں کارخانوں کے لیے برقی قوت نہایت ارزاں قیمت پر ملجاتی ہے۔

(۳) زرخیز زمین اور موافق آب وہوا۔ آسام اور سیلون کی چاے، مصر اور امریکہ کی روئی، بنگال کا جوٹ، محض ان مقامات کی مخصوص زمینوں کا نتیجہ ہیں۔ لنکا شائر کی آب وہوا میں ایک خاص قسم کی نمی پائی جاتی ہے جو دھاگے کو نرم اور مضبوط بنا دیتی ہے یہی

وجہ ہے کہ وہ انگلستان میں پارچہ بافی کی صنعت کا خاص مرکز ہے۔

(۴) بازار یا خریداروں کی قربت۔ ترکاریوں اور پھولوں کے باغات بالعموم شہروں کے قریب ہی موجود ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے معمار یا درزی یا سنار صرف انہی مقامات میں کاروبار کرتے ہیں جہاں اُن سے کام لینے والے موجود ہوں۔ دہلی اور لکھنو جو سونے چاندی کے زیورات بنانے میں اب تک مشہور ہیں اس کا باعث بجز اس کے کچھ نہیں کہ یہ دونوں شہر کسی زمانے میں بادشاہوں، امرا، اور بڑے بڑے دولتمندوں کا مسکن رہ چکے ہیں۔

(۵) دربار کی سرپرستی یا حکومت کی توجہ۔ پچھلے زمانے میں بادشاہوں اور امرا کی سرپرستی اور خاص دلچسپی سے اکثر صنعتیں خاص خاص مقامات میں ترقی کر جاتی تھیں۔ آجکل اکثر حکومتیں ملکی کارخانوں کو انعام و اکرام دیکر یا دوسرے ممالک کے مال پر محصول درآمد لگا کر یا اسی قسم کی دوسری تدبیروں سے خاص خاص صنعتوں کو اپنے علاقوں میں ترقی دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

تخصیص صنایع کے فواید

تخصیص صنایع کے فواید۔ جب ایک مرتبہ کوئی صنعت کسی خاص مقام پر قایم ہو جاتی ہے تو پھر اس کو طرح طرح کے فواید حاصل ہونے لگتے ہیں جن کی وجہ سے وہاں اس کا پھلنا پھولنا اور زیادہ یقینی ہو جاتا ہے۔ محنت و اصل، دونوں میں ایک قسم کی تخصیص پیدا ہو جاتی ہے، اصلاحات اور ایجادات کا سلسلہ بندھ جاتا ہے، اس نتایج کی

پیداوار کو خاص شہرت حاصل ہو جاتی ہے، اصلی صنعت سے متعلق بہت سی اور صنعتیں جاری ہو جاتی ہیں جنھیں اصطلاح میں صنائع تضمینی کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات ذرائع آمد و رفت میں بھی اس کی وجہ سے بہت کچھ اصلاح اور ترقی ہو جاتی ہے "تاکہ خام پیداوار لانے اور تیار شدہ مال لیجانے میں سہولت ہو، جب کوئی کاروبار کسی ایک مقام کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے تو وہاں کے بچے اس کاروبار کی پوشیدہ باتوں سے بغیر کسی خاص کوشش کے خود بخود واقف ہو جاتے ہیں اور اسی طرح اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی قابلیت حاصل کر لیتے ہیں، با مہارت مزدوروں کو کام آسانی سے ملجاتا ہے اور آجروں کو کارگذار مزدوروں کے انتخاب کا اچھا موقع ملتا ہے مزید براں ایک ہی پڑوس میں رہنے والے اور ایک ہی کاروبار میں کام کرنے والے مزدور آسانی کے ساتھ اپنی انجمنیں بنا سکتے، اور موثر طریقے پر اپنے حقوق کی نگہداشت کر سکتے ہیں۔

اصول بدل

اصول بدل۔ ظاہر ہے کہ پیدائش دولت کے لیے مختلف عاملین درکار ہیں۔ جب تک یہ عاملین مہیا نہ کیے جائیں دولت نہیں پیدا کیجا سکتی۔ لیکن ان عاملین کے مہیا کرنے میں ضرور کچھ نہ کچھ مصارف لاحق ہوتے ہیں لھذا جو دولت ان کے تعاون سے پیدا کی جایے، اسی سے بالآخر ان مصارف کا نکلنا ضروری ہے۔ اب آجروں کی کامیابی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ کمترین مصارف سے بہترین نتائج حاصل کریں۔ جو آجر اپنے حسن انتظام کی بدولت کاروبار کے مصارف کو بے ضرورت نہیں بڑھنے

دیتے، وہی مسابقت میں بالعموم کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جن کارخانوں کا انتظام ٹھیک نہیں ہوتا، وہاں مصارف پیدائش بجائے گھٹنے کے اور بڑھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے قیمتوں میں کوئی تخفیف نہیں کی جا سکتی اور بازار ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصارف پیدائش کی فہرست ہمیشہ مستعد اور سمجھدار آجروں کے پیش نظر رہتی ہے۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ عاملین پیدائش میں کوئی ایسا ردوبدل کریں جس کی وجہ سے ان کے مصارف نسبتاً کم ہو جائیں، یا انہی مصارف سے نسبتاً بہتر نتائج حاصل ہوں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ چند مزدور گھٹا دیے جائیں اور ان کا کام کسی مشین سے لیا جائے، یا کسی قدیم مشین کے بدلے میں کوئی نئی مشین استعمال کی جائے یا ایک قسم کی خام پیداوار کو چھوڑ کر کوئی دوسری قسم کی خام پیداوار کام میں لائی جائے۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں سوالات ہمیشہ ہر آجر کے دماغ میں گھومتے رہتے ہیں اور ہر آجر اپنی واقفیت اور کاروباری قابلیت کے مطابق انہی عاملین کا انتخاب کرتا ہے جنھیں وہ اپنی دانست میں اپنے اغراض کے لیے بہترین تصور کرتا ہے۔ اور جب کبھی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے اس انتخاب میں کوئی ردّوبدل ضروری ہو تو فوراً ایسا ردوبدل کر دیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنا منافع بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ قانون بدل پر عمل پیرا رہتا ہے۔

قانون بدل کے عملدرآمد میں بسا اوقات بہت سی رکاوٹیں پیش

آتی ہیں۔ کبھی رسم و رواج یا قانون اس میں مزاحم ہوتا ہے تو کبھی خاص خاص پیشوں کی روایات یا انجمن مزدوراں کے ضوابط اس میں حائل ہوتے ہیں، کبھی حوصلہ مندی کا فقدان اس کے عمل کو کمزور کر دیتا ہے تو کبھی قدیم ساتھیوں سے جدا نہ ہونے کی خواہش اس میں نرمی پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن باوجود ان رکاوٹوں کے اس قانون کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور خاصکر دور جدید کے تمام معاشی معاملات میں وہ خوب سرایت کیے ہوئے ہے۔

واضح رہے کہ قانون بدل کا عمل محض پیدائش دولت کے شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ انسانی جد و جہد کے کم و بیش ہر شعبے میں اس کا اثر نظر آتا ہے۔ انسان خواہ کسی ماحول میں کام کرے، وہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے وہی طریقہ اختیار کریگا۔ (بشرطیکہ کوئی مخالف اثرات مانع نہ ہوں) جو مصارف کا لحاظ کرتے ہوئے سب سے زیادہ کارگزار ہوگا۔ مثال کے طور پر صرف دولت کے شعبے کو لیجئے۔ ہر شخص کے ساتھ کچھ احتیاجات لگی ہوئی ہیں جنھیں پورا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن احتیاجات کی تکمیل بغیر خرچ کے ممکن نہیں۔ لھذا ہر شخص کی فطرتی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی احتیاجات جسقدر کم خرچ سے ممکن ہو سکے پوری کرلے، یا معینہ خرچ میں اس کی کثیر سے کثیر احتیاجات پوری ہو جائیں۔ اس غرض سے وہ اپنے گھر کے مصارف میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ردوبدل کرتا رہتا ہے۔ غذا، لباس،

مکان، اور دوسری گوناگوں ضروریات میں وہ اپنی آمدنی اس طور پر تقسیم کرتا ہے کہ اس سے کثیر سے کثیر افادہ حاصل ہو۔ (دیکھو صفحہ ۱۰ تقسیم آمدنی) جو لوگ قانون بدل پر ٹھیک طریقے سے عمل کرتے ہوئے اپنی دولت صرف کرتے ہیں وہ بمقابل ان لوگوں کے جو اس قانون کی طرف سے غافل رہتے ہیں، اپنی آمدنی سے زیادہ افادہ حاصل کرتے ہیں۔ بسا اوقات یہ دیکھا جاتا ہے کہ دو خاندان بہ لحاظ آمدنی اور خرچ کے مساوی الحالت ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس مساوات کے مادی خوشحالی میں وہ ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ایک خاندان میں ہر شخص خوش لباس اور تندرست نظر آتا ہے، مکان بھی خاص سلیقے کے ساتھ پاک وصاف اور حسب حیثیت آراستہ رہتا ہے بچوں کے رکھ رکھاؤ اور ان کی تعلیم کا بھی حسب حیثیت اہتمام ہوتا ہے اس کے برعکس دوسرا خاندان ہے کہ وہاں نہ لباس ٹھیک ہے اور نہ مکان، بچے ہیں کہ میلے کچیلے کپڑوں میں ادھر ادھر منھ اٹھائے پھرتے ہیں، تندرستی ندارد اور تعلیم مفقود۔ ہم فرض کر چکے ہیں کہ دونوں خاندانوں کی آمدنی مساوی اور ہر ایک پر بار بھی مساوی ہے، باوجود اس کے یہ فرق محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ ایک خاندان میں اصول بدل پر عمل کیا جا رہا ہے اور دوسرے میں سے نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ صرف دولت میں قانون بدل کو نظرانداز کر دینے کا نتیجہ اسقدر سخت نہیں ہوتا جسقدر کہ پیدائش دولت

میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنی آمدنی بے ڈھنگے طریقے پر خرچ کرے تو پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح سے بسر اوقات کر ہی لیتا ہے۔ لیکن پیدائش دولت میں چونکہ دوسروں کے ساتھ مسابقت جاری رہتی ہے، اس لیے اس قانون کو نظر انداز کرنیکی سزا بہت سخت اور بہت جلد ملتی ہے۔ جو آجر اپنے کاروبار کے مصارف میں حتی الوسع تخفیف نہیں کریگا، اس کا مال گران قیمت ہونے کی وجہ سے فروخت نہ ہو سکیگا اور اسے بالآخر اپنا کاروبار بند کرنا پڑیگا۔

چوتھا باب
تقسیمِ دولت

تقسیم دولت کی اہمیت

تقسیمِ دولت کی اہمیت :- زمین، محنت، اصل اور تنظیم کے متفقہ عمل سے کسی ملک میں جو دولت پیدا ہوتی ہے، وہ انہی عاملین کے درمیان خاص خاص اصولوں کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے چنانچہ معاشیات کی اصطلاح میں زمین کا حصہ لگان، محنت کا معاوضہ اجرت، اصل کا سود، اور تنظیم کا منافعہ کہلاتا ہے۔ تقسیم دولت کے شعبے میں انہی حصص کی ماہیت، ان کے تعین کے اصول، اور دیگر امور متعلقہ سے بحث کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب تک دولت پیدا نہ ہو انسانوں کی احتیاجات پوری نہیں ہو سکتیں لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ پیدا کی ہوئی دولت سے کما حقہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ پیدا کرنے والوں میں ٹھیک طور پر تقسیم نہ ہو، چنانچہ اگر چند ممالک میں پیدائش دولت کی کمی سے سخت افلاس پھیلا ہوا ہے تو بعض دوسرے

ممالک میں تقسیم دولت کے نقایص بھی کچھ کم تباہی کا باعث نہیں ہیں
مثال کے طور پر انگلستان کو لیجیے۔ انگلستان میں ہر سال جو عظیم الشان
دولت پیدا ہوتی ہے، دنیا کے بہت کم ممالک اُس کا مقابلہ کر سکتے ہیں
باوجود اس کے افلاس انگلستان سے ناپید نہ ہو سکا اور اب تک
اُس کی بدترین مثالیں وہاں نظر آتی ہیں۔ کم و بیش یہی حال دوسرے
مغربی ممالک کا ہے۔ دولت تو روز افزوں مقدار میں پیدا ہو رہی ہے
لیکن ناقص تقسیم کی بدولت اُس کی بہت بڑی مقدار تو چند افراد
کے ہاتھوں میں رہجاتی ہے اور بہت تھوڑی مقدار مقابلۃً کثیر تعداد
میں منقسم ہوتی ہے۔ دولتمند مزید دولتمند بنتے جاتے ہیں اور مفلسوں
اپنے افلاس سے نجات نہیں ملنے پاتی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم
کی عام اشاعت اور جمہوریت کی ترقی سے سرمایہ داری کے ان رجحانات کی
بہت کچھ روک تھام ہو رہی ہے تاہم انگلستان و امریکہ جیسے ممالک کی
عظیم الشان دولت کا لحاظ کرتے ہوے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دولت
کی تقسیم ناقص نہ ہوتی تو وہاں افلاس کا باقی رہنا ناممکن تھا تعلیم
اور جمہوری خیالات کی اشاعت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ آبادی کے
جو طبقے ملک کی دولت میں اپنے واجبی حصے سے محروم رہجاتے
ہیں، اُن میں اپنی غیر اطمینان بخش حالت کا احساس اور ایک طرح کی
بددلی اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور جیسے جیسے یہ احساس قوی
ہوتا جاتا ہے، وہ اپنی حالت کی اصلاح کے لیے عملی تدبیریں اختیار

لگتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں ایک مدت سے اشتراکیت اور اسی
ذہبیت کی جو مختلف تحریکیں مختلف ناموں سے نمودار ہوتی رہی ہیں، وہ
سب اسی احساس کا نتیجہ ہیں۔ ان تمام تحریکوں میں اب تک جس تحریک کو
عملی حیثیت سے مقابلتاً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ روس کی
بالشویک تحریک ہے۔ تقسیم دولت کے مباحث کی اہمیت جتانے کے بعد
اب ہم مختلف حصص کی ماہیت اور ان کے اصول متعلقہ کی طرف متوجہ
ہوتے ہیں۔

لگان

Rent RENT.

لگان کی ماہیت

لگان کی ماہیت۔ لگان کی ماہیت سمجھنے یا بالفاظ دیگر
معلوم کرنے کے لیے کہ لگان کس بات کا معاوضہ ہے اور کیونکر پیدا
ہوتا ہے، اولاً چند ابتدائی امور اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے
سب سے پہلے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مختلف کھیتوں کے مصارف
پیدائش مختلف ہوتے ہیں۔ آسانی بیان کے خیال سے ہم زرعی پیداوار کے
مصارف کو پانچ شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) کھیت جوتنا اور تر انا
پانی دینا، رکھوالی کرنا اور فصل تیار ہونے پر کاٹنا، یہ اور اسی قسم کے
متعدد کام انجام دینے پڑتے ہیں تب کہیں جاکر پیداوار اس قابل ہوتی
ہے کہ بازار میں فروخت کی جا سکے۔ خواہ یہ سب کام صرف کاشتکار اور

اُس کی بیوی بچے کرلیں یا وہ اپنی مدد کے لیے کچھ مزدور نوکر رکھ لیں، بہر صورت یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کی محنت کا معاوضہ مصارف پیدایش میں شامل کیا جائے۔ صرف زرعی مزدوروں کی اجرتوں کا حساب کرلینا اور کاشتکار اور اس کے اہل وعیال کی محنت کو نظر انداز کرنا غلطی ہے۔ (۲) تخم، کھاد، مویشیوں کا چارہ، اور تمام اصل دایر کی قیمت بھی مصارف میں شامل ہونی چاہیئے۔ (۳) ہل بیل، اور دیگر آلات واوزار کی شکل میں جسقدر اصل قایم کام کر رہا ہو، اُس پر مطالبات فرسودگی اس حساب سے نکالے جائیں کہ جب تک وہ فرسودہ اور بیکار ہو جائے کاشتکار کو اسکی پوری قیمت وصول ہو جائے (۴) اس کے علاوہ کوئیں کھودنا، نہریں بنانا اور گودام تعمیر کرنا، اور اسی طرح کی مستقل ترقیات اراضی میں بھی بسا اوقات بہت سا اصل صرف ہوتا ہے لہٰذا بقیہ اصل کے ساتھ اسپر بھی شرح مقررہ سے سود نکالا جائے (۵) جب پیداوار تیار ہو جائے تو اسے بازار تک لانے اور فروخت کرنے میں جو خرچ لاحق ہوتا ہے اُسکا بھی مصارف پیدایش میں شامل ہونا ضروری ہے۔ خرچ کی ان تمام مدوں کو پیش نظر رکھتے ہوے ہم بدیہی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ کوئی دو کھیت اپنے جملہ مصارف کے لحاظ سے بالکل ایک ہی حالت میں نہیں پائے جاسکتے۔ بلکہ مختلف زمینوں کے مصارف کی حالت مختلف رہتی ہے۔ فرق مصارف کے اِن اسباب کے علاوہ کھیتوں میں اور بھی طرح طرح کے اختلافات نظر آتے ہیں مثلاً بعض کھیت قدرتی طور پر زیادہ زرخیز ہوتے

ہیں اور بعض کم، زرعی مزدوروں کی اجرتیں کہیں اعلیٰ ہوتی ہیں اور کہیں ادنیٰ، آبپاشی کہیں بیش خرچ ہوتی ہے اور کہیں ارزاں، بعض کھیت ریل اور پختہ سڑکوں کے ارد گرد واقع ہوتے ہیں اور بعض دور افتادہ مقامات ہیں" ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہے کہ بہ لحاظِ مصارف مساوی الحالت کھیت بہت کم نظر آتے ہیں اور بالعموم مختلف کھیتوں کے مصارفِ پیدائش ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

لگان کا مفہوم سمجھنے کے لیے مبادلۂ دولت کا یہ مشہور کلیہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایک وقت میں ایک بازار کے اندر ایک ہی قسم کی پیداوار کی قیمت ایک ہوتی ہے۔ اس کلیے کے ثبوت میں کسی مکمل استدلال کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہماری عقل اُس کی مخالف حالت کو تسلیم نہیں کرتی جو فروشندہ ایک ہی بازار میں بمقابل دوسرے فروشندوں کے اپنے مال کی زیادہ قیمت طلب کرے گا اُس کا مال فروخت نہ ہو سکے گا۔ اس کلیے کی تشریح اور معاشی بازار کا مفہوم آئندہ مبادلہ دولت کے مباحث میں تفصیل سے معلوم ہوگا۔ یہاں اسقدر ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ اگر پیداوار ایک ہی قسم کی ہو اور بازار بھی مختلف نہ ہو تو وقت واحد میں اُس پیداوار کی دو قیمتیں نہیں ہو سکتیں۔

لیکن بازار میں جو پیداوار فروخت ہونے کے لیے آتی ہے وہ صرف کسی ایک کھیت کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ متعدد مختلف الحالات

کھیتوں کی پیداوار کا مجموعہ ہوتی ہے اور اختلاف حالات کی وجہ
ان کھیتوں کے مصارف پیدائش بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ ایک ہی
مقدار پیداوار حاصل کرنے کے لیے بعض کھیتوں پر لاگت زیادہ
آتی ہے اور بعض پر کم اور پھر اس زیادتی اور کمی کے بھی بے شمار مدارج
ہیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بازار میں مختلف
الحالات کھیتوں کی پیداوار کی ایک ہی قیمت کس اصول کے مطابق معین
ہوگی۔ واضح رہے کہ اگر خریداروں کو جملہ کھیتوں کی پیداوار مطلوب ہے
بہ الفاظ دیگر ان کی طلب اتنی زیادہ ہے کہ جب تک ہر ہر کھیت کی
پیداوار حاصل نہ کی جائے، وہ پوری نہیں ہو سکتی تو ایسی حالت میں قیمت
کم از کم اتنی ہونی چاہیے کہ جو پیداوار سب سے زیادہ ناموافق حالات
اور اسی وجہ سے بیشترین مصارف والے کھیت سے حاصل ہوئی ہے،
اس کے بھی مصارف پیدائش نکل آئیں۔ کیونکہ اگر قیمت اس سطح سے کم
رہے گی تو یہ آخری کھیت مصارف نہ ملنے کی وجہ سے خارج از کاشت
ہوجائیں گے، پیداوار کی رسد میں کمی واقع ہوگی اور بازار کی طلب
پوری نہ ہو سکے گی۔ لھذا اگر ادنی درجے کے کھیتوں کی پیداوار حاصل
کیے بغیر کام نہیں چلسکتا تو مجبوراً قیمت اتنی بڑھانی پڑے گی کہ بیشترین
مصارف والے کھیتوں پر اگرچہ حاصل زاید نہ ملے تو کم از کم مصارف
پیدائش ہی پورے پورے نکل آئیں۔ لیکن چونکہ ایک بازار میں ایک
ہی قسم کی پیداوار کی قیمت ایک ہوتی ہے اس لیے دوسرے کھیتوں کی

پیداوار کی بھی یہی قیمت قرار پائے گی۔ خریداروں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ جو پیداوار وہ خریدنا چاہتے ہیں وہ اعلیٰ درجے کے کھیت سے آئی ہے یا ادنیٰ درجہ کے کھیت سے؛ اُس پر مصارف پیدائش زیادہ ہوئے ہیں یا کم اور نہ انھیں یہ اختیار ہے کہ ایک ہی قسم کی پیداوار کے مختلف اجزا کی قیمتوں میں خاص اس بنا پر کوئی کمی بیشی کریں۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کھیتوں کے مصارف کی بنا پر پیداوار کی قیمت قرار پائے گی اُن پر تو مصارف پیدائش اور قیمت پیداوار دونوں برابر برابر ہوں گے لیکن جن کھیتوں پر موافقت حالات کی وجہ سے مصارف کم ہوں گے اُن پر کاشتکاروں کو کچھ ماحصل زاید ملیگا اور یہی ماحصل زاید اصطلاح میں **معاشی لگان** کہلاتا ہے۔

معاشی لگان

پس معاشی لگان کسی کھیت کی پیداوار کا وہ حصہ ہے جو قیمت سے مصارف پیدائش منہا کرنے کے بعد بچ رہے۔ اب جسقدر کسی کھیت کے مصارف پیدائش کم رہیں گے اُسی قدر اُس پر معاشی لگان کی مقدار زیادہ ہوگی اور جہاں جہاں مصارف پیدائش زیادہ ہوں گے، وہاں معاشی لگان بھی اسی مناسبت سے گھٹتا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب مصارف بڑھتے بڑھتے قیمت پیداوار کے برابر آ لگیں تو ایسی زمینوں پر کوئی ماحصل زاید نہ ملے گا اور وہ زمینیں بے لگان کہلائینگی۔

مندرجۂ بالا تشریح کے نتائج نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں مع ایک مثال کے درج کیے جاتے ہیں تاکہ معاشی لگان کی ماہیت اور

زیادہ واضح ہو جائے۔

(۱) مختلف کھیتوں کے مصارف پیدائش مختلف ہوتے ہیں۔

(۲) ایک وقت میں ایک بازار کے اندر ایک ہی قسم کی پیداوار کی قیمت ایک ہوتی ہے۔

(۳) اور یہ قیمت کم از کم اتنی ہوتی ہے کہ اس سے بیشترین مصارف والے کھیت کے مصارف نکل آئیں۔

(۴) پس جن کھیتوں کے مصارف پیدائش اس قیمت سے کم ہونگے ان پر کچھ ماحصل زاید ملیگا اور یہی ماحصل زاید معاشی لگان کہلاتا ہے۔

مثال:۔ فرض کرو کہ کسی مقام کی مزروعہ زمین صرف پانچ کھیتوں پر مشتمل ہے اور یہ پانچوں کھیت بہ لحاظ مصارف پیدائش ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ

درجہ اول	کے کھیت پر	مصارف پیدائش	۲ روپیہ	فی من ہیں
درجہ دوم	"	"	۲½ روپیہ	" "
درجہ سوم	"	"	۳ روپیہ	" "
درجہ چہارم	"	"	۳½ روپیہ	" "
درجۂ پنجم	"	"	۴ روپیہ	" "

اگر طلب اتنی زیادہ ہے کہ پانچوں کھیتوں کی پیداوار بغیر کام نہیں چلسکتا تو ضروری ہے کہ بازار میں گیہوں کی قیمت کم از کم ۴ روپے فی من ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں

پانچویں کھیت پر کوئی ماحصل زائد نہ ملیگا۔

چوتھے کھیت پر ماحصل زائد یا لگان ۸ ؍ فی من ہوگا۔

تیسرے کھیت پر " " " عہ " " "

دوسرے کھیت پر " " " لعہ " " "

پہلے کھیت پر " " " عمہ " " "

نوٹ۔ فرض کرو کہ قیمت گھٹ کر $3\frac{1}{2}$ روپیہ فی من ہو جائے
ایسی حالت میں درجۂ پنجم کے کھیت پر کاشت موقوف کردی جائے گی،
درجۂ چہارم کا کھیت جس پر فی من ۸ ؍ لگان مل رہا تھا، اب بے لگان
ہو جائے گا۔ اور درجہ سوم و دوم و اول کے کھیتوں پر پہلے سے کم معاشی
لگان ملنے لگے گا۔ گویا تخفیف قیمت سے معاشی لگان میں تخفیف واقع ہوتی
ہے۔ اس کے برعکس اگر قیمت بڑھ کر $4\frac{1}{2}$ فی من ہو جائے تو درجۂ پنجم کے کھیت پر
بھی ۸ ؍ فی من لگان ملنے لگے گا اور اس سے ادنی درجے کی زمینوں پر
جن کے مصارف پیدائش $4\frac{1}{2}$ روپیہ فی من سے زائد نہ ہوں، کاشت
پھیل جائے گی۔ گویا اضافہ قیمت کی بدولت کاشت میں توسیع ہوتی
ہے، بے لگان زمینوں پر کچھ لگان ملنے لگتا ہے اور لگان والی زمینوں کے
لگان میں اضافہ ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ لگان کی کمی بیشی کا باعث
قیمت پیداوار کی کمی بیشی ہے۔ بہ الفاظ دیگر لگان قیمت کا نتیجہ یا اس کا
آفریدہ ہے۔ "لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا" یا "لگان
قیمت میں داخل نہیں ہوتا" ان مقولوں سے اسی واقعے کا اظہار

مقصود ہوتا ہے۔

قانون تقلیل حاصل اور لگان

قانون تقلیل حاصل اور لگان۔ قانون تقلیل حاصل کو مسئلہ لگان کا سنگ بنیاد کہا جاتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ قانون تقلیل حاصل ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ کاشت صرف اعلیٰ درجے کی زمینوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ اضافۂ آبادی اور اضافۂ طلب کے ساتھ ساتھ اوسط اور ادنیٰ درجے کی زمینوں پر بھی پھیلتی جاتی ہے۔ اور جیسے جیسے کاشت مختلف قسم کی زمینوں پر پھیلتی جاتی ہے، مصارف پیدائش میں اختلافات رونما ہوتے جاتے ہیں اور یہی اختلافات پیدائش لگان کا باعث ہیں۔ اور اگر کاشت مختلف الحالات کھیتوں پر نہ پھیلے، تب بھی جیسے جیسے مزید جرعے استعمال کیے جاتے ہیں، قانون تقلیل حاصل کی بدولت اُن کے مصارف بڑھتے جاتے ہیں اور کم مصارف والے جرعوں پر کچھ ما حصل زاید یا لگان ملنے لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ لگان مصارف پیدائش کے فرق سے پیدا ہوتا ہے اور مصارف پیدائش کے اختلافات سراسر قانون تقلیل حاصل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُسے مسئلہ لگان کا سنگ بنیاد کہنا بالکل بجا ہے۔

پیدائش لگان کے شرائط

پیدائش لگان کے شرائط۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مسئلہ لگان جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے، دو اہم مفروضات پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ کل پیداوار ایک ہی نرخ سے فروخت ہو، دوسرے یہ کہ نرخ معین ہو وہ بیشترین مصارف پیدائش کے برابر ہو، کم نہ ہو۔ اب جہاں تک پہلے مفروضے یعنی مساوات نرخ کا تعلق ہے، یہ صرف اسی حالت میں

ممکن ہے جبکہ ساری پیداوار ایک ہی بازار میں فروخت ہو اور اس بازار کے اندر خریداروں اور فروشندوں کے مابین کامل آزادی اور مقابلہ ہو۔ اسی طرح دوسرے مفروضے کی صحت کے لیے لازم ہے کہ زرعی پیداوار کی طلب و رسد برابر برابر ہو ورنہ نرخ کا بیشترین مصارف کے برابر ہونا ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین کی پیداوار ہوا، پانی، روشنی، اور دیگر قدرتی عطیات کی طرح لامحدود ہوتی یعنی پیداوار زمین کی رسد اس کی طلب پر غالب ہوتی تو لگان کا وجود ناممکن تھا۔ پس پیدائش لگان کے لیے تین شرطیں لازمی ہیں:-

(۱) کل پیداوار کا ایک ہی منڈی میں فروخت ہونا
(۲) خرید و فروخت میں کامل آزادی اور مقابلہ
(۳) طلب و رسد کی قوت میں برابری۔

} = مساوات نرخ

نرخ بیشترین مصارف کے برابر

لگان کی قسمیں

لگان کی قسمیں۔ ہم ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ اگر پیداوار کی رسد اُس کی طلب پر غالب ہوتی تو لگان کا وجود ہی ناممکن تھا۔ لگان کی پیدائش کے لیے طلب و رسد کی قوت برابر ہونی چاہئے۔ لیکن اگر طلب رسد پر غالب ہو جائے تو ممکن ہے کہ نرخ بیشترین مصارف پیدائش سے بھی بڑھ جائے۔ مثلاً اگر ھزار من غلے کی طلب ہو اور صرف آٹھ سو من غلہ منڈی میں موجود ہو تو باوجودیکہ بیشترین مصارف پیدائش تین روپیہ فی من ہوں، نرخ کا ساڑھے تین روپیہ تک چڑھنا دشوار نہ ہوگا۔

ایسی حالت میں اختتامی زمینوں یا انتہائی جرعوں پر بھی کچھ ماحصل زاید ملنے لگے گا اور اعلیٰ زمینوں یا ابتدائی جرعوں کے ماحصل زاید میں اضافہ ہوگا۔ چونکہ یہ ماحصل زاید محض تعین رسد اور کثرت طلب کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے اُسے لگانِ قلت کہا جاتا ہے۔

مثلِ لگان۔۔ بعض پیشہ ور اپنی خداداد استعداد و ذہانت کی بدولت اپنے سے زیادہ تعلیم یافتہ ہم پیشہ اشخاص سے پیدائش دولت میں بڑھ جاتے ہیں مثلاً دو وکیل ایک ہی جگہ تعلیم پاکر اور ایک ہی جگہ کی سند حاصل کرکے مساوی محنت و توجہ کے ساتھ ایک ہی قسم کے حالات میں وکالت شروع کرتے ہیں لیکن ایک اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے ہزاروں کی آمدنی تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرا مدتوں بعد بھی چند سو سے زیادہ نہیں کما سکتا۔ اس قسم کی مزید آمدنی معاشی لگان سے بہت مشابہہ ہے۔ کیونکہ جس طرح معاشی لگان قدرتی اسباب کا نتیجہ ہے اُسی طرح اس آمدنی کا بھی اصلی باعث قدرت کی عطا کردہ قابلیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مثلِ لگان کہا جاتا ہے۔

لگانِ اجارہ۔۔ بعض کارخانوں کو خاص خاص سہولتوں کی وجہ سے بمقابل دوسرے کارخانوں کے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے جو خود کارخانہ دار کی جد و جہد یا قدرتی استعداد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کسی اتفاقی سہولت یا غیراختیاری فریق کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مزید منافع کو اصطلاحاً لگانِ اجارہ کہتے ہیں۔

نوٹ ۔۔ واضح رہے کہ اس قسم کی آمدنیوں کو لگان کہنے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اُن میں معاشی لگان کی اہم ترین خصوصیت پائی جاتی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ لگان "ایک مفت عطیہ ہے جو اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف ومحنت حاصل ہوتا ہے"۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شبہ لگان اور لگانِ اجارہ بھی پانے والوں کی کوشش سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ غیر اختیاری اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ان کے حاصل کرنے کے لیے کچھ اصل لگانا پڑتا یا کچھ محنت صرف کرنی پڑتی تو انھیں لگان نہ کہا جاتا بلکہ سود اور اجرت میں شامل کیا جاتا۔ اسی طرح سکنی زمینوں کے کرایوں میں بھی موقعہ محل اور بعض دیگر غیر اختیاری اسباب کی وجہ سے زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک باموقعہ چھوٹی سی دکان کا جو کرایہ وصول ہوتا ہے، وہ بے موقعہ بڑے بڑے مکانوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ پس باموقعہ زمینوں پر ان وجوہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، وہ سکنی زمینوں کا لگان ہے جس کی پیدائش میں مالکانِ زمین کی جد و جہد کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

لگان کے حصہ دار

لگان کے حصہ دار ۔۔ زمین کی پیداوار کا وہ حصہ جو تمام مصارف کاشت منہا کرنے کے بعد بچ رہے، معاشی لگان کہلاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مفت عطیہ ہے جو اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف و محنت حاصل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عطیۂ قدرت کا واجبی حقدار کون ہے اور کن لوگوں میں کس نسبت سے وہ عملاً تقسیم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کاشتکار خود ہی زمین کا مالک ہے تو یہ ماحصل زاید بلا
غیرے صرف اسی کے حصہ میں آئیگا۔ لیکن اگر اُس نے کسی اور شخص سے
زمین پٹے پر حاصل کی ہے تو ایسی صورت میں مالکِ زمین یا زمیندار بھی اسکا
شریک بن جائیگا اور معاشی لگان اِن دونوں میں کسی خاص نسبت سے تقسیم
ہو جائیگا۔ لیکن چونکہ معاشی لگان کسی خاص شخص کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے
بلکہ وہ ایک مفت عطیہ ہے جو بہت سے اجتماعی اسباب کے زیر اثر قدرت کی
جانب سے انسان کو حاصل ہوتا ہے اس لیے عام طور پر ضروری اور مناسب
سمجھا گیا کہ عوام کو بھی اس کے ثمرات سے فیضیاب ہوسکنے کا موقعہ دیا جائے
اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ حکومت، جو درحقیقت تمام باشندگان
ملک کی نمایندہ ہوتی ہے اِس ماحصل زاید کا ایک حصہ خود وصول کرلے اور اسے
عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے صرف کرے۔ حکومت کے اغراض کے لیے
جب رعایا کی محنت کی کمائی سے کوئی حصہ وصول کرلینا نامناسب نہیں سمجھا جاتا
تو پھر معاشی لگان جیسی غیر مکتسب آمدنی اور خالص عطیۂ قدرت کا ایک جز
انہی اغراض کے لیے حاصل کرنا کسی طرح خلافِ انصاف نہیں کہا جاسکتا۔
ہند کے مختلف صوبوں کی حکومتیں انہی اسباب کی بنا پر زمین کی پیداوار کا
جو حصہ وصول کرتی ہیں، وہ اصطلاح میں مالگزاری کہلاتا ہے اور خواہ
زمین خود کاشتکار کی ملک ہو یا وہ کسی زمیندار سے پٹے پر حاصل کی گئی
ہو، دونوں صورتوں میں حکومت مالگزاری کے نام سے معاشی لگان کا
ایک جزو وصول کرلیتی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ جہاں کاشتکار خود

زمین کا مالک ہوتا ہے (یعنی رعیت واری علاقوں میں) وہاں وہ براہ راست حکومت کو مالگزاری ادا کر دیتا ہے اور جہاں درمیان میں زمیندار موجود ہوتا ہے (یعنی زمینداری علاقوں میں) وہاں مالگزاری کاشتکار سے نہیں بلکہ زمیندار سے وصول کی جاتی ہے۔ پس جہاں تک ہند کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں معاشی لگان کے حصہ دار کہیں دو ہوتے ہیں اور کہیں تین: رعیت واری علاقوں میں صرف کاشتکار اور حکومت، زمینداری علاقوں میں کاشتکار، زمیندار، اور حکومت۔

قوانین لگان

قوانین لگان۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان مختلف حصہ داروں کے حصص کا تعین کیونکر ہوتا ہے۔ جہاں تک مالگزاری کا تعلق ہے اس کی شرح تو ہم دیکھ چکے ہیں معین ہے اور وہ رعیت واری علاقوں میں معاشی لگان کا نصف اور زمینداری علاقوں میں زمینداری لگان[*] کا نصف ہوتی ہے۔ لیکن زمینداری لگان کے تعین میں قانون کا دخل بہت زیادہ ہے۔ لہذا قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مداخلت کس حد تک مطابق انصاف ہے۔ حکومت نہ مزدوروں کی اجرت مقرر کرتی ہے، نہ اصلداروں کا سود، اور نہ آجروں کا منافع۔ لیکن کسان اپنے حق کاشت کا جو معاوضہ زمیندار کو ادا کرتا ہے یعنی زمینداری لگان، اسکا تعین اور اس میں کمی بیشی سراسر

---

[*] زمین کی پیداوار کا جو حصہ کسان مالک زمین کو اپنے حق کاشت کے عوض میں حسب معاہدہ ادا کرتا ہے، وہ زمینداری لگان ہے۔

قوانین لگان کے تابع ہیں۔ واضح رہے کہ اس مداخلت کا راز ہند کے زمینداروں اور کاشتکاروں کے تعلقات اور کاروبار زراعت کی نوعیت میں مضمر ہے۔ لہذا اب ہم مختصر طور پر ان تعلقات کی کیفیت معلوم کریں گے۔

ہر شخص کا یہ مشاہدہ ہے کہ جب کوئی چیز فروخت کی جاتی ہے تو خریدار کم سے کم قیمت دینے کی کوشش کرتا ہے اور فروشندہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حالات حاضرہ اور گوناگوں اسباب کے زیر اثر ایک ایسی قیمت قرار پاتی ہے جس پر دونوں فریق رضامند ہو جاتے ہیں۔ فرض کرو کہ شئے زیر بحث خریداروں کے لیے ناگزیر ہے۔ جب تک کہ اس کی کچھ نہ کچھ مقدار حاصل نہ کی جائے کام نہیں چلسکتا۔ اس کے برعکس فروشندے اتنے محتاج نہیں ہیں کہ جب تک اپنے مال کی قیمت وصول نہ ہو، ان کا کام نہ نکل سکے۔ ان کے پاس سابقہ پس انداز اتنا موجود ہے کہ اگر سردست اچھی قیمت نہیں ملتی تو وہ اس کے انتظار میں بہ آسانی اپنا مال روک سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں خریدار بہت ہی مجبور ہوں گے اور فروشندوں کو منہ مانگی قیمتیں وصول ہوں گی۔ فرض کرو کہ خریداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور فروشندوں کی تعداد بہت کم خریدار بعید منتشر ہیں اور فروشندے مقابلۃً متحد۔ مزید براں خریدار جاہل ان پڑھ اور بازار کے حالات سے ناواقف ہیں، اس کے برعکس فروشندے لکھنے پڑھنے سے واقف اور مقابلۃً چالاک۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خرید و فروخت کے جملہ معاملات خریداروں کے مفاد کے خلاف اور فروشندوں کے

موافق مطلب طے پائیں گے۔ ہند کے کسانوں اور زمینداروں کی حالت علی الترتیب مذکورۂ بالا خریداروں اور فروشندوں کی حالت کے مشابہ ہے اول تو اپنی پست حوصلگی اور دیہاتی دستکاریوں کے زوال کے باعث کسانوں کے لیے بجز زراعت کے کسب معاش کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے دوسرے کثرت تعداد کی وجہ سے اُن میں زمین کے لیے انتہائی مسابقت جاری ہے، تیسرے اُن کی جہالت اور عام ناواقفیت بھی ان کے لیے بیحد ضرر رساں ہے۔ اس کے برعکس زمینداروں کی حالت پر غور کیجیے۔ اول تو وہ ایک ایسے عطیۂ قدرت کے مالک بن بیٹھے ہیں جو انتہا درجے ناگزیر ہے، جسکی مقدار میں قطعًا کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اور جسپر قدرت نے طرح طرح کی پابندیاں عاید کر دی ہیں۔ دوسرے وہ تعداد میں ان لوگوں سے بہت کم ہیں جو زمین حاصل کرنے کے بے انتہا خواہشمند ہیں۔ تیسرے اُن کے پاس بعموم اتنا پس انداز موجود ہوتا ہے کہ اگر اُن کی زمین کچھ عرصے کے لیے خالی پڑی رہے تو اُن پر اس کا کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا۔ مختصر یہ کہ قوت و اقتدار کے تمام اسباب تو صرف ایک فریق یعنی زمینداروں کو حاصل ہیں ضعف و احتیاج کے جملہ امور کلیتًا دوسرے فریق یعنی کاشتکاروں کے حصے میں آئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ کاشتکار زمینداروں کی نگاہوں میں غلاموں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ زمیندار جس وقت چاہے لگان میں اضافہ کر دے۔ کاشتکار کی مجال نہیں کہ اس میں ذرا بھی چون و چرا کر سکے۔ ورنہ زمیندار بلا کسی مزاحمت کے اُسے فورًا کھیت سے بے دخل کر دے گا۔

اور اس کی جگہ بیسیوں کسان زیادہ لگان پر زمین لینے کے لیے خوشی
کرتے نظر آئینگے - غرض اضافۂ لگان اور بے دخلی ان دو حربوں کا
خوف کسانوں کو زمینداروں کا مطیع و فرمانبردار بنائے رکھنے کے لیے
بہت کافی ہے۔ لیکن یہاں پر جو امر ہمارے لیے خاص طور پر اہم ہے
وہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا خود زراعت کے کاروبار پر کیا اثر
پڑتا ہے۔

زمین کی خصوصیات کے تحت ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ قدرت نے
اُس کی قوت پیداآوری محدود کر دی ہے۔ بالفاظ دیگر کسی قطعۂ زمین سے
ایک مقررہ میعاد کے اندر کوئی خاص قسم کی پیداوار مقدار معینہ سے زیادہ
حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اِلّا اینکہ اُس میں نئے نئے کھاد ڈالے جائیں
ترقی زراعت کی مستقل اصلاحات عمل میں لائی جائیں یا کاشت کے
بہتر اور ترقی یافتہ طریقے اختیار کیے جائیں۔ ان تدبیروں سے زمین
کی پیداوار میں نہ صرف موقتی اضافہ ہوتا ہے بلکہ مستقل طور پر اُس کی
زرخیزی بڑھتی جاتی ہے اور نسبتاً کمتر مصارف سے مقابلۃً بیشتر او بہتر
پیداوار حاصل ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس اگر زمین پر بے ڈھنگے
طریقے سے کاشت کی جائے، وقتاً فوقتاً ضروری اصلاحات عمل میں
نہ لائی جائیں اور تھوڑے سے وقت میں کثیر سے کثیر مقدار پیداوار
حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسی زمین بہ تدریج کمزور ہوتی جاتی
یہاں تک کہ اُس کی زرخیزی میں مستقل تخفیف واقع ہوگی۔

ہند کے کسانوں کی جو حالت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ یہاں کے کاشتکار کو اپنے کاروبار سے کوئی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے کاشتکار اپنی زمین کی اصلاح اور اس کی زرخیزی بڑھانے یا برقرار رکھنے کی طرف اُسی وقت توجہ کرتا ہے جبکہ اُسے کامل اطمینان ہو کر اپنی محنت وجانفشانی کے ثمرات سے مستفید ہونے کا اُسے پورا پورا موقعہ ملے گا۔ لیکن اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو، بالفاظ دیگر کاشتکار کو یہ خدشہ لگا رہے کہ کافی سرمایہ خرچ کرکے اور انتہائی محنت ومشقت کے بعد کھیت کی پیداوار میں جو اضافہ کیا جائیگا، اُس کا یا اُس کے ایک بڑے حصے کا مالک زمیندار بن بیٹھے گا تو پھر وہ کس امید پر کھیت کی اصلاح کی جانب مائل ہو۔ مزید براں مستقل ترقیات اراضی پر جو سرمایہ صرف ہوتا ہے اسکا معاملہ کہیں سالہا سال میں پورے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ جب کاشتکار کو چند مہینے بھی اپنے کھیت پر قابض رہنے کا یقین نہ ہو تو پھر کیونکر اُس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس قسم کی ترقیات پر اپنا روپیہ، اپنا وقت، اور اپنی محنت صرف کرے۔ ایسی حالت میں کاشتکار کی محض یہ کوشش ہوگی کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرلے۔ نہ معلوم کس وقت زمیندار کی جانب سے اضافہ لگان کا مطالبہ ہو یا بے دخلی کا حکم ملے۔ لٰہذا مناسب یہ ہے کہ کمترین مصارف سے جسقدر پیداوار ممکن ہو سکے، جلد از جلد حاصل کرلی جائے

خواہ آگے چلکر زمین کی زرخیزی پر اس کا کیسا ہی برا اثر پڑے اگر کسی ملک کی تمام مزروعہ زمین یا اُس کا ایک بہت بڑا حصہ ان حالات کے تحت زیر کاشت رہے تو ملک کی پیدائش پر اُس کا ناگوار اثر پڑنا یقینی ہے۔ اور جسقدر یہ حالات زیادہ مدت تک جاری رہیں گے اُسی قدر اُن کے نتائج زیادہ مہلک ثابت ہوں گے۔ اُن کے مضر اثرات نہ صرف زراعت پیشہ طبقے کے افراد تک محدود رہیں گے بلکہ عوام پر بھی ان کا گہرا اثر پڑیگا اور خود حکومت کے مالیات معرض خطر میں پڑجائینگے۔ لہٰذا حکومت کا یہ اہم فریضہ ہے کہ ایسی ناگوار صورت حال کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کردے۔ چنانچہ اسی غرض سے ہند کے ہر ہر صوبے میں قوانین لگان نافذ ہیں جن کا منشا بجز اس کے کچھ نہیں کہ کاشتکاروں اور زمینداروں کے باہمی تعلقات میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن کی بدولت مندرجۂ بالا خرابیاں پیدا نہ ہونے پائیں۔

ہند کے مختلف صوبے بہ لحاظ اپنے معاشی اور معاشرتی حالات کے ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ہر ہر صوبے کے لیے جدا جدا قوانین لگان مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن باوجود تفصیلی اختلافات کے تمام صوبوں کے قوانین لگان میں دو باتیں نمایاں طور پر مشترک نظر آتی ہیں جن میں سے ایک کا تعلق اضافۂ لگان سے ہے اور دوسری کا بے دخلی سے۔ اضافۂ لگان اور بے دخلی یہی دو زبردست حربے ہیں جو کسان کو زمیندار کے مقابلے

میں بے بس کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہر جگہ کے قوانینِ لگان کا رجحان ہمیں
بات کی طرف ہوتا ہے کہ اضافہ لگان کو محض مالکِ زمین کی مرضی پر
نہ چھوڑا جائے بلکہ اُسے گوناگوں شرائط کا پابند کر دیا جائے۔ اسی طرح
بے دخلی کے اختیار میں بھی طرح طرح کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔
کہیں تو زمیندار سے یہ اختیار بالکل چھین لیا جاتا ہے۔ چنانچہ موروثی
کاشتکار جب تک حسبِ معاہدہ لگان ادا کرتے رہے، زمیندار اُس کو
بے دخل کر ہی نہیں سکتا۔ گویا موروثی کاشتکاروں کو زمین میں ایک طرح
کے مالکانہ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو نسلاً بعد نسل جاری رہ سکتے ہیں
کہیں کاشتکاروں کو اتنے زبردست حقوق تو حاصل نہیں ہوتے لیکن
پھر بھی قانون انھیں بے دخلی یا اُس کے ناگوار نتائج سے محفوظ رکھنے
کی بہت کچھ کوشش کرتا ہے۔ کہیں تو بے دخلی کو خود زمیندار والے لیے
نقصان دہ بنا دیا جاتا ہے اور کہیں غیر معمولی رعایتوں کے لالچ سے
انھیں ترغیب دی جاتی ہے کہ پٹے کی میعادیں توسیع کریں۔

اُجرت
wages.

WAGES.

پیدائش دولت کا دوسرا ناگزیر عامل محنت ہے جس کی مفصل کیفیت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ہمیں صرف اُن مسائل سے سروکار ہے جو تقسیم دولت میں محنت کے معاوضے سے متعلق ہیں۔ واضح رہے کہ جب سے تقسیم عمل کا رواج پھیلا، دولت بڑے پیمانے پر پیدا ہونے لگی، مشین کا استعمال روز افزوں بڑھنے لگا، اور پیدائش دولت کے نئے نئے طریقے اختیار کیے جانے لگے، دوسری چیزوں کی طرح محنت کے بازار بھی نمودار ہوتے گئے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک میں محنت کی اسی طرح خرید و فروخت ہوتی ہے جس طرح کہ دوسری اشیا کی محنت بیچنے والا مزدور کہلاتا ہے اور خریدنے والا آجر۔ اور اجرت گویا کہ قیمت ہے جو محنت کے معاوضے میں ادا کی جاتی ہے۔

اجرت کی تشریح۔ اس عنوان کے تحت ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ اجرت کیوں ادا کی جاتی ہے؟ اور اس کی کمی بیشی کے کیا اسباب ہیں؟ اجرت اور قیمت کی باہمی مشابہت کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔ قیمت کے متعلق ہم اجمالی طور پر یہ جانتے ہیں کہ وہ طلب و رسد کے زیر اثر معین ہوتی ہے، بہ الفاظ دیگر جس چیز کے خواہشمندوں کی تعداد زیادہ ہو لیکن وہ مقدار میں بہت کم، تو لازمی طور پر اس کی

اجرت کی تشریح

Q 43

قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی چیز کثیر مقدار میں موجود ہو لیکن بہت کم لوگ اس کے خواہشمند ہوں تو اس کی قیمت خواہ مخواہ گھٹ جائے گی۔ بالکل یہی حال محنت کا ہے۔ اگر کسی مقام کاروبار کی کثرت ہو لیکن مزدور مقابلۃً کم دستیاب ہوں تو وہاں اجرتوں کا معیار بلند ہوگا۔ اس کے برعکس جہاں بہ مقابلہ کاروبار کے مزدوروں کی کثرت ہو، وہاں اجرتیں ادنیٰ نظر آئیں گی۔ مختصر یہ کہ اور چیزوں کی قیمت کی طرح محنت کی قیمت یعنی اجرت بھی طلب و رسد کے زیر اثر قرار پاتی ہے۔ لهذا ضروری ہے کہ محنت کی طلب و رسد کے حالات پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کیا جائے۔

محنت کیوں طلب کی جاتی ہے؟ اس لیے کہ اس کے بغیر پیدائش دولت ناممکن ہے اور دولت بغیر انسان کی زندگی محال۔ لهذا محنت میں جو پیدا آوری کی صفت موجود ہے، وہی اس کی طلب کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجر کارگزار مزدوروں کو اعلیٰ اجرتیں دیکر نوکر رکھ لیتے ہیں اور جن مزدوروں کی کارکردگی ادنیٰ ہوتی ہے ان کو ادنیٰ اجرتیں بھی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ پس اجرتوں کی کمی بیشی کا ایک اہم سبب محنت کی پیدا آوری میں مضمر ہے۔ لیکن خود محنت کی پیدا آوری بہت کچھ مزدوروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ لهذا ہم ذیل میں اسی واقعے کی تشریح کرتے ہیں۔

محنت کی پیداوری

واضح رہے کہ کسی کاروبار سے قطع نظر اس سے کہ وہ زراعت ہو یا صنعت

تجارت ہو یا آمدورفت، کا حقہ فایدہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کاروبار کی نوعیت کے لحاظ سے ہر ہر عامل پیدایش کی ٹھیک ٹھیک مقدار شامل کی جایے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ایک یا دو عامل ضرورت سے زیادہ مقداریں لگایے جائیں اور بقیہ عامل معین رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جو عامل زاید از ضرورت مقداریں لگایے گئے ہیں اُن کی پیداوار نسبتاً کم ہوتی جایے گی۔

قانون تقلیل حاصل میں زمین کی مقدار معین تصور کر کے اصل اور محنت کی مقداریں بتدریج بڑھائی جاتی ہیں۔ ایک حد تک تو اضافۂ اصل محنت کا نتیجہ بشکل اضافۂ پیداوار حاصل ہوتا ہے لیکن اُس کے بعد جسقدر اصل و محنت میں اضافہ کیا جاتا ہے، اُسی قدر مزید پیداوار بہ مقابلہ پیشتر کے گھٹنے لگتی ہے۔ اب اگر زمین کی طرح اصل کی مقدار بھی معین مان لی جائے اور صرف محنت کے جرعوں میں اضافہ کیا جائے تب بھی قانون تقلیل حاصل کا اثر نمودار ہوگا۔ چنانچہ ہم ذیل میں زراعت کے کاروبار سے اس واقعے کی ایک مثال پیش کرتے ہیں:

زمین	اصل	محنت	پیداوار
۲ ایکر	۴۰۰ روپے	۴ مزدور	۱۰۰ من
"	"	۵ "	۱۲۰ "
"	"	۶ "	۱۳۵ "
"	"	۷ "	۱۴۵ "
"	"	۸ "	۱۵۰ "

مذکورہ بالا مثال میں زمین اور اصل کی مقدار معین یا کم مزدوروں
کی تعداد میں بہ تدریج اضافہ کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر جدید مزدور کے
شامل ہونے سے پیداوار میں جو اضافہ ہوتا ہے، وہ بھی مقدار میں
بتدریج گھٹتا جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے آخری یعنی آٹھویں مزدور کے
شامل ہونے سے مقدار پیداوار میں پانچ من اضافہ ہوا ہے۔ ایسی
حالت میں آٹھویں مزدور کو زیادہ سے زیادہ جو اجرت مل سکتی ہے،
وہ پانچ من ہوگی بلکہ مزدوروں کی کثرت اور اُن کے عام افلاس کی بدولت
اجرت پانچ من سے بھی کم ہو جائے تو عجب نہیں۔ لیکن توجہ طلب امر
یہ ہے کہ یہ اجرت نہ صرف آٹھویں مزدور کی ہوگی بلکہ سابقہ تمام مزدوروں
کو بھی (جو کارکردگی میں ایک دوسرے کے برابر ہیں) یہی اجرت قبول
کرنی پڑے گی۔ کیونکہ ہمارے مفروضے کے مطابق انھیں کہیں اس سے
زیادہ اجرت نہیں مل سکتی اور اگر کہیں مل سکتی تو پھر آٹھواں مزدور
ہی کیوں پانچ من پر راضی ہو جاتا۔ مذکورہ بالا مثال میں آٹھواں
مزدور "مزدور مختتم" اور اُس کی محنت کی پیداوار "پیداوار مختتم"
کہلاتی ہے۔

نوٹ۔ واضح رہے کہ "مزدور مختتم" سے مراد ایسا مزدور نہیں
ہے جو سب سے آخر میں شریک کار بنے۔ بلکہ مزدوروں کے اُسی گروہ
میں جو ایک ہی وقت کام شروع کرے، مزدور مختتم کی موجودگی ممکن ہے
مزدور مختتم در اصل ایسی جماعت کا کوئی فرد ہے کہ اگر اُس میں کوئی جدید

مزدور شامل کریں تو مزید ماحصل اس کی اجرت سے کم رہے"..
اُس کے شریک ہونے سے جو ماحصل میں اضافہ ہوتا ہے اور جو سب ماسبق
اضافوں سے کم مقدار ہوتا ہے وہ درحقیقت کل جماعت کی مجموعی محنت
سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ اُس کی جداگانہ محنت سے۔ اور اُس کے سب سے
کم مقدار ہونے کا باعث مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص نہیں بلکہ قانون
تقلیل حاصل ہے" (علم المعیشت)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دوسری چیزوں کی قیمتوں کی طرح
محنت کی قیمت یعنی اجرت بھی طلب و رسد کے زیر اثر معین ہوتی ہے۔
اب ہم قیمت اور اجرت کی ایک اور مشابہت پر غور کریں گے جس سے
خاصکر محنت کی رسد کے پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر چیز کی پیدائش میں کچھ نہ کچھ مصارف
لاحق ہوتے ہیں۔ اور پیدا کرنے والے کو ہمیشہ یہ توقع رہتی ہے کہ اُسے
اپنی چیز کی کم از کم اتنی قیمت ضرور ملے گی کہ اس سے مصارف پیدائش
ادا ہوسکیں۔ اگر قیمت سے مصارف پیدائش بھی نہ نکلیں تو پھر ایسی
چیز کی تیاری ترک کردی جائے گی۔ کیونکہ کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ
خواہ مخواہ نقصان اٹھا کر کوئی چیز تیار کرے۔ کم و بیش یہی حال محنت کا
ہے۔ جسطرح کہ قیمت سے مصارف پیدائش حاصل نہ ہونے کی صورت میں
چیزوں کی تیاری موقوف کردی جاتی ہے، اُسی طرح اگر اجرت، محنت کے
مصارف پیدائش یعنی مزدوروں کی ضروریات زندگی کے لیے کم ہو

نہ ہو تو پھر کافی تعداد میں مزدوروں کا دستیاب ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر مزدور کو ایک برقی طاقت پیدا کرنے والے ڈینامو سے تشبیہ دی جائے تو یہ صورت زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر برقی طاقت حاصل کرنا مقصود ہو تو لازمی ہے کہ اُس کا کم از کم اتنا معاوضہ دیا جائے جس سے کوئلے کی قیمت اور ڈینامو کے مطالبات فرسودگی، یہ دونوں ہی تکمل آئیں۔ جب تک کہ کوئلہ نہ جلے ڈینامو نہیں چلسکتا اور جوں جوں ڈینامو کام کرتا ہے، وہ بتدریج فرسودہ ہوتا ہے حتیٰ کہ کچھ مدت کے بعد وہ بالکل از کار رفتہ ہو جاتا ہے اور جب تک کہ اس کی جگہ دوسرا ڈینامو نہ خریدا جائے، برقی طاقت کی رسد جاری نہیں رہ سکتی۔ پس اگر برقی طاقت کی رسد جاری رکھنا مقصود ہو تو اُس کی کم از کم اتنی قیمت دینی چاہئے کہ اُس سے کوئلے کا خرچ اور مطالبات فرسودگی، دونوں کی تکمیل ہو جائے تاکہ نہ صرف موجودہ مشین اچھی طرح کام کرسکے بلکہ جب وہ کام کرتے کرتے بالکل فرسودہ ہو جائے تو برقی طاقت کی قیمت سے اتنا پس انداز جمع ہو جائے جو جدید ڈینامو خریدنے کے لیے کافی ہو سکے۔ اسی طرح اگر محنت کی رسد جاری رکھنا مقصود ہو تو مزدوروں کو اتنی اجرت دینی چاہیے کہ وہ بے فکری کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی بسر اوقات کر سکیں اور اپنی اولاد کو ایسی تعلیم دے سکیں کہ وہ آگے چلکر اپنے بزرگوں کے جانشین بنجائیں یہ اگر اجرت سے مزدور کے مایحتاج زندگی اور پرورش اولاد کے مصارف نہ نکلیں گے تو بالآخر عمدہ محنت کا دستیاب ہونا

ممکن نہ ہوگا۔"

واضح رہے کہ محنت اور دوسری چیزوں میں باوجود اس مشابہت کے ایک بہت بڑا فرق موجود ہے، وہ یہ کہ جس طرح اشیا کا بنانا یا نہ بنانا کلیۃً انسان کے اختیار میں ہے، اسی طرح محنت کی پیدائش یا عدم پیدائش پر انسان کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ اگر اشیا کی قیمت اُن کے مصارف سے کم ملے تو فوراً اُن کی تیاری ترک کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر مزدور کو کافی اجرت دستیاب نہ ہو تو محنت کی رسد میں فوراً کمی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جو مزدور پیدا ہوگئے ہیں، اُن کو اپنی پرورش کے لیے محنت کرنا ضروری ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تخفیف اجرت کا نقصان صرف مزدور کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اگر اس کی ضروری روک تھام نہ کی جائے تو ساری قوم پر اُسکا ضرر رساں اثر پڑنا یقینی ہے۔ زمانہ موجودہ کے ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کی اشاعت اور عام بیداری کی بدولت مزدوروں کی جماعتیں اس قابل ہوگئی ہیں کہ خود اپنے مفاد کی نگہبانی کرسکیں چنانچہ اس غرض سے انہوں نے بڑی بڑی انجمنیں بنا رکھی ہیں جو عام طور پر "ٹریڈ یونین" یا انجمہائے مزدوراں کہلاتی ہیں۔ آگے چلکر ترقیات مزدوراں کے عنوان میں ہم ان انجمنوں کی مفصل کیفیت بیان کریں گے۔ فی الحال یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ اجرت مزدور اور اس کے خاندان کی پرورش اور تربیت اولاد کے لیے کافی ہو ورنہ محنت کی رسد پر اُس کا مضر اثر پڑنا لازمی ہے۔

نوٹ۔ واضح رہے کہ مزدوروں کے مایحتاج زندگی کا کوئی معین معیار نہیں ہے بلکہ اوس کا مدار ہر ہر ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات پر ہوتا ہے۔ بعض علمائے معیشت نے یہ دیکھ کر کہ اکثر ممالک میں بیکار مزدوروں کی بڑی بڑی جماعتیں تلاش روزگار میں سرگرداں رہتی ہیں، یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اجرت ہمیشہ ناگزیر ضروریات تک محدود رہتی ہے اور اس سے متجاوز نہیں کر سکتی لیکن بعد کے تجربے سے اس خیال کی غلطی واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے چنانچہ زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ ممالک پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے مزدوروں کا معیار زندگی ضروریات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اچھی اچھی غذائیں کھاتے، اچھا اچھا لباس پہنتے، پختہ مکانوں میں رہتے اور سیر و تفریح میں بھی آمدنی کا ایک حصہ صرف کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان یا دوسرے ایشیائی ممالک کے مزدوروں کی حالت مقابلتاً بہت پست نظر آئے گی۔ اُن کی اجرتیں بالعموم اتنی نہیں ہوتیں کہ وہ آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اس کا باعث کاروبار کی کمی اور خود مزدوروں کی جہالت اور ان کا انتشار ہے۔ مختصر یہ کہ مزدوروں کا معیار زندگی مختلف ممالک میں مختلف ہوتا ہے خوشحال اور ترقی یافتہ ممالک میں یہ معیار بلند ہوتا ہے اور پسماندہ ممالک میں پست۔

اجرت کی قسمیں؛ اجرت صحیحہ و اجرت متعارفہ۔

اجرت کی قسمیں: اجرت صحیحہ و اجرت متعارفہ۔

معاشیین نے اجرت کی دو طرح پر تقسیم کی ہے: ایک بہ لحاظ ادائی، دوسرے بہ لحاظ

تعین شرح۔ ادائی کے لحاظ سے اجرت کی دو قسمیں کی گئی ہیں: ایک اجرت صحیحہ، دوسرے اجرت متعارفہ۔ اجرت متعارفہ سے مراد زر کی وہ مقدار ہے جو کسی مزدور کو اُس کی محنت کے معاوضہ میں ادا کی جائے مثلاً چار آنے روز یا سو روپے ماہانہ۔ لیکن چار آنے روز یا سو روپے ماہانہ میں مزدور کو بشکل خوراک، لباس، مکان، وغیرہ جسقدر ضروریات حاصل ہونگی وہ اُس کی اجرت صحیحہ شمار ہوں گی۔ واضح رہے کہ مزدور کو در اصل جس چیز سے سروکار ہوتا ہے، وہ مقدار زر نہیں بلکہ مقدار ضروریات ہے۔ ہر شخص کسب معاش کے لیے محنت کرتا ہے اور معاش چند سکوں یا کاغذ کے پرزوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان اشیا کے مجموعے کا نام ہے جنھیں وہ سکے دیکر خریدتا ہے اور اُن سے اپنی احتیاجات پوری کرتا ہے۔ محنت کے معاوضہ میں زر قبول کرنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ اُسے زر کی عام مقبولیت کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زر کے معاوضے میں وہ اپنی مطلوبہ چیزیں ہر وقت حاصل کر سکتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے زر کی عام مقبولیت پر لوگوں کو اعتماد نہ رہے تو پھر کوئی شخص اپنی محنت کا معاوضہ اُس زر کی شکل میں قبول نہ کریگا۔ مختصر یہ کہ ہر محنت کرنے والے کا اصلی مقصد کثیر سے کثیر ضروریات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مقدار زر سے اُسے کچھ سروکار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر زر کی تھوڑی سی مقدار سے زیادہ ضروریات حاصل ہوں تو مزدوروں کو کوئی شکایت نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس مقدار زر تو زیادہ ہو لیکن اُس سے جو ضروریات حاصل ہوسکیں وہ بہت کم مقدار ہوں تو مزدوروں کی مرفہ الحالی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

ہمیں معلوم ہوا کہ مزدوروں کے نقطۂ نظر سے دراصل جو چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے، وہ اجرت متعارفہ نہیں بلکہ اجرت صحیحہ ہے کیونکہ اسی پر ان کی خوشحالی کا تمامتر دارومدار ہوتا ہے۔ لہذا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ مزدوروں کی اجرتِ صحیحہ میں کیونکر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ اضافۂ اجرت صحیحہ کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ نرخ ضروریات معین رہے اور اجرت متعارفہ میں اضافہ ہو جائے۔ چونکہ زر کی پہلے سے زیادہ مقدار حاصل ہوتی ہے اور اشیا کی قیمتوں میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا لہذا اجرت صحیحہ کی مقدار بڑھنی یقینی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اجرت متعارفہ معین رہے اور نرخ ضروریات میں تخفیف واقع ہو۔ اگرچہ زر کی مقدار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تاہم ارزانی اشیا کی بدولت اسی مقدارِ زر کے معاوضہ میں ضروریات کی پہلے سے زیادہ مقدار حاصل ہوتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اجرت متعارفہ میں اضافہ اور نرخ ضروریات میں تخفیف، دونوں ساتھ ساتھ واقع ہوں۔ مزدوروں کے حق میں یہ صورت سب سے زیادہ فائدہ بخش ہے کیونکہ ایک طرف تو مقدار زر میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ارزانی اشیا کی وجہ سے اس زر کی ہر اکائی پہلے سے زیادہ مقدار ضروریات خرید سکتی ہے۔ گویا اجرت صحیحہ میں دوگونہ اضافہ واقع ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی حالت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک طرف تو اجرت متعارفہ میں برابر اضافہ جاری ہے اور دوسری طرف ضروریات روز بروز گراں ہوتی جا رہی ہیں گویا اجرت صحیحہ پر دو متضاد قوتیں اپنا اپنا اثر ڈال رہی ہیں جن میں سے

ایک یعنی اضافہ اجرتِ متعارفہ کا عمل مزدوروں کے موافق اور دوسری یعنی گرانی اشیاء کا عمل ان کے مخالف ہے۔ ایسی حالت میں جہاں جو اثر زیادہ قوی ہوگا وہاں اسی کے مطابق نتائج پیدا ہوں گے۔ اگر اجرت متعارفہ کا اضافہ گرانی اشیا سے نسبتاً زیادہ ہو تو اجرت صحیحہ میں اضافہ ہونے سے مزدور پر اس کا اچھا اثر پڑیگا۔ اس کے برعکس اگر اضافہ اجرت متعارفہ گرانی اشیا کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے پیچھے رہے تو مزدوروں کی مرفہ الحالی پر اس کا ناموافق اثر پڑنا بدیہی ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اجرت صحیحہ میں اضافہ کرنے یا مزدوروں کی زندگی کو خوشحال بنانے کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ملک میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کی بدولت نرخِ ضروریات میں تخفیف واقع ہو۔ اجرتِ متعارفہ میں اضافہ کرکے گرانی اشیا کے مضر اثرات کی روک تھام چنداں مؤثر ثابت نہیں ہوتی۔ سردست تو اسکی بدولت کچھ افاقہ مل جاتا ہے۔ لیکن مستقل طور پر مرض کا ازالہ نہیں ہونے پاتا۔ اس کی ترکیب صرف یہی ہے کہ نرخ ضروریات میں تخفیف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ اسی حالت میں ممکن ہے جبکہ تعلیم کے ذریعہ سے باشندگانِ ملک کی کثیر سے کثیر تعداد میں پیدا آوری کی صنعت پیدا کی جائے اور ان کی کارگزاری کو جہاں تک ممکن ہوسکے بڑھایا جائے۔ اگرچہ اضافۂ آبادی اور قانون تقلیل حاصل جیسے قوی عاملین ارزانی اشیا کی راہ میں بہت کچھ مزاحم ہوتے ہیں، تاہم زمانہ موجودہ میں انسان کو قدرت پر جو غیر معمولی تصرف حاصل ہوگیا ہے اُس کی بدولت

وہ عاملین قدرت کو اپنا مطیع بنا کر عجیب وغریب ایجادات کے ذریعے سے اپنی قوت پیدا آوری میں بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے، چنانچہ بہت سے کاروبار میں آج کل جو تکثیر حاصل کا عمل نظر آتا ہے وہ اسی ترقی کا نتیجہ ہے۔

یہ خیال کرنا کہ نرخ ضروریات کی تخفیف اگر ایک طرف مزدوروں کے حق میں مفید ہے تو دوسری طرف ضروریات پیدا کرنے والوں کے لیے مضر ہوگی صحیح نہیں ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ارزاں ہوتی ہے تو اسکی طلب بڑھ جاتی ہے اور جسقدر طلب میں اضافہ ہوتا ہے پیدائش بر پیمانہ کبیر اور قانون تکثیر حاصل کے فواید سے مستفید ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اور اگرچہ منافع فی شے کم ملتا ہے تاہم مجموعی منافع، جس سے دراصل سروکار ہوتا ہے، پہلے سے بہت زیادہ ملنے لگتا ہے۔ مزید براں اگر تخفیف نرخ سے ضروریات پیدا کرنے والوں کو کچھ نقصان ہو بھی جائے تو اسکی بہت کچھ تلافی اس طور پر ہو جاتی ہے کہ خود اُن کی ضرورت کی بے شمار چیزیں انھیں بہ مقابل بیشتر کے ارزاں ملنے لگتی ہیں۔ مختصر یہ کہ نرخ ضروریات کی تخفیف آبادی کے کسی طبقہ کے لیے مضر نہیں بلکہ سب کے لیے مفید ہے اور کسی قوم کی زندگی کو خوشحال بنانے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہی ہے کہ اُس کے افراد کی کارکردگی کا معیار جہاں تک ممکن ہو سکے بلند کیا جائے تاکہ محنت واصل کی پیدا آوری بڑھنے سے مختلف ضروریات کے مصارف پیدایش میں تخفیف ہو اور وہ ارزاں قیمتوں پر دستیاب ہونے لگیں۔

اجرت وقت۔ اجرت عمل۔ اجرت کارکردگی

اجرتِ وقت۔ اجرتِ عمل۔ اجرتِ کارکردگی

تعینِ شرح کے لحاظ سے بھی اجرت کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک اجرتِ وقت، دوسرے اجرتِ عمل۔ اجرتِ وقت سے مراد وہ اجرت ہے جس کی شرح کام کی میعاد کے لحاظ سے مقرر کی جائے مثلاً سو روپے ماہانہ یا دس روپے ہفتہ وار۔ اس کے برعکس جب مزدوروں کو کام کی مقدار کے مطابق اجرت ملے تو وہ اجرتِ عمل کہلائے گی مثلاً کاتبوں کو فی صفحہ چار آنے، مترجموں کو فی صفحہ پانچ روپے، پارچہ باف کو فی تھان تین روپے۔

واضح رہے کہ اجرت، خواہ وہ بہ لحاظِ وقت دی جائے یا بہ لحاظِ مقدارِ کار، ہمیشہ ہر مزدور کی کارکردگی کے مطابق ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ محنتی، سمجھدار، اور دیانتدار مزدور کو ہر کوئی زیادہ اجرت دیکر نوکر رکھ لیتا ہے اور اُس کے کاہل اور بددیانت ساتھیوں کو کبھی اسقدر اجرت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح جہاں مقدارِ کار کے لحاظ سے اجرت دیجاتی ہے، وہاں بھی وقت معینہ کے اندر ایک محنتی اور جفاکش مزدور جو اجرت کما لیتا ہے وہ ایک کاہل اور کام چور مزدور کو کبھی نصیب نہیں ہوسکتی۔ کارکردگی کے نقطۂ نظر سے جو اجرت دریافت کی جائے، وہ اصطلاح میں اجرتِ کارکردگی کہلاتی ہے۔ جہاں کہیں مزدوروں میں آزادانہ مقابلہ موجود ہوتا ہے، وہاں ان کی اجرتیں مساوات کی طرف مائل ہوتی ہیں اور مختلف مزدوروں کی اجرتوں میں بہت کم فرق رہتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسی حالت میں مساواتِ اجرت سے مراد اجرتِ کارکردگی کی مساوات ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مزدوروں میں آزادانہ مقابلہ

...ی رہے اور مختلف کارکردگی والے مزدور اجرتِ وقت یا اجرتِ عمل
مساوی شرح سے حاصل کریں آزادانہ مقابلے کا نتیجہ بلاشبہ مساوات اجرت
ہوتا ہے لیکن یہ اجرت، اجرتِ کارکردگی ہے نہ کہ اجرتِ وقت یا اجرتِ عمل

اجرتِ صحیحہ کا تخمینہ

اجرتِ صحیحہ کا تخمینہ۔ کسی مزدور یا طبقۂ مزدوراں کی اجرت
متعارفہ تو مقدار زر کے شمار سے بہ آسانی دریافت کی جاسکتی ہے لیکن اجرت
صحیحہ کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانا چنداں آسان نہیں۔ ذیل میں ہم وہ تمام
امور درج کرتے ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر اجرتِ صحیحہ کا ٹھیک تخمینہ نہیں کیا
جاسکتا :-

(۱) سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ جس زر کی شکل
میں اجرت متعارفہ ادا کی جاتی ہے، اُس کی قوتِ خرید کا حال معلوم کیا
جائے۔ اگر زر کی ایک معینہ مقدار کے عوض دوسری اشیا کی پہلے سے زیادہ
مقدار حاصل ہو تو کہا جائیگا کہ زر کی قوت خرید بڑھ گئی ہے اور اگر دوسری
اشیا کی پہلے سے کمتر مقدار ملے تو کہا جائیگا کہ زر کی قوت خرید گھٹ گئی ہے
چونکہ مزدور کو دراصل اپنی ضروریات سے سروکار ہوتا ہے لہذا محض اجرت
متعارفہ کی مقدار کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ مزدور خوشحال ہے یا
خستہ حال۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اُس اجرتِ متعارفہ کی قوت خرید دریافت
کی جائے۔ بہ الفاظ دیگر یہ معلوم کیا جائے کہ مزدور کو اُس کی محنت کے
معاوضے جو زر مل رہا ہے، اس سے وہ اپنی اشیائے مایحتاج کس مقدار
میں خرید سکتا ہے۔ اگر زر کی مقدار تو زیادہ ہو لیکن گرانی کے باعث

اُس سے جو ضروریات خریدی جاسکیں وہ کم مقدار ہوں تو ایسی حالت میں ممکن ہے کہ باوجود اضافۂ اجرتِ متعارفہ کے، اجرتِ صحیحہ میں کوئی زیادتی نہ ہوسکے بلکہ اگر کچھ تخفیف ہو جایے تو عجب نہیں۔ اس کے برعکس اگر اشیاے مایحتاج ارزاں ہو جائیں تو باوجود اجرتِ متعارفہ میں تخفیف ہونے کے اجرتِ صحیحہ کا اپنی سابقہ حالت پر قایم رہنا بلکہ بعض اوقات پہلے سے بھی بڑھ جانا ممکن ہے۔ ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ بعض روزمرہ ضروریات کی چیزیں دیہات میں بہ مقابل شہروں کے ارزاں ملتی ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دیہاتی مزدوروں کو بہ مقابل شہر کے مزدوروں کے اوسطاً کم اجرت ملتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم فی الفور یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ شہروں کے مزدور مقابلتاً زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ شہروں اور دیہات کی اجرتوں کے فرق کے ساتھ ساتھ زر کی قوتِ خرید کے اختلافات کا بھی لحاظ کریں۔ تب کہیں دونوں مقامات کے مزدوروں کی واقعی حالت کا پتا لگ سکتا ہے۔

(۲) بعض صورتوں میں اجرت صرف بہ شکل زر نہیں دی جاتی بلکہ اُس کے ساتھ مزدور کی ضروریات کا بھی کوئی جزو شامل کر دیا جاتا ہے۔ ہند کے اکثر مقامات میں خانگی ملازمین کو اسی طریقے پر اجرتیں ادا کی جاتی ہیں۔ باورچی نہ صرف تنخواہ پاتا ہے بلکہ اُسے روزانہ خوراک بھی ملتی ہے۔ سائیسوں کو اُن کی تنخواہ کے علاوہ بالعموم خوراک اور وردی دی جاتی ہے اور بسا اوقات رہنے کے لیے کچھ جگہ بھی دیدی جاتی ہے۔ ریلوے کمپنی کے

اپنی اور اپنے اہل وعیال کی گوناگوں احتیاجات پوری کر سکتے ہیں لیکن پھر بھی اگر ہم ان کی اجرت صحیحہ کا تخمینہ کرنے میں ان تمام اشیا کی حقیقی بازاری قیمت کو معیار قرار دیں گے تو ہمارا تخمینہ سراسر خلافِ واقعہ ثابت ہوگا۔ اگر سائیسوں کی اجرتوں میں یہ ضروریات شامل نہ ہوں بلکہ ان کے عوض انھیں کچھ زیادہ اجرت متعارفہ دے دی جائے تو وہ نہ ایسی عمدہ غذا کھا سکیں گے، نہ انہیں رہنے کے لیے پختہ کمرے نصیب ہو سکیں گے اور نہ پہننے کے لیے ایسی عمدہ وردیاں دستیاب ہوں گی۔ بلکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق نہایت ادنیٰ قسم کی خوراک کھائیں گے، کچے جھونپڑوں میں رہیں گے اور نہایت معمولی قسم کے کپڑے استعمال کریں گے۔ پس معلوم ہوا کہ سائیسوں کو ان ضروریات کے حاصل ہونے سے جو بچت ہو رہی ہے، وہ ہرگز ان ضروریات کی حقیقی قیمت کے مساوی نہیں بلکہ اُس سے بہت کم ہے۔ اور ان کا صحیح تخمینہ کرنے کے لیے صرف یہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ خود سائیسوں کی نظر میں ان اشیا کی کیا اہمیت ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان اشیا کے بہ طور اجرت نہ ملنے کی صورت میں سائیس انہی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنے طور پر اپنی آمدنی کا کس قدر حصہ خرچ کرتے۔

(۳) بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں خود مزدوروں یا اُن کے اہل وعیال کو مزید اجرت کمانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اجرت صحیحہ کے تخمینے میں اس واقعے کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سرکاری مدرسے کے مدرسین کو لیجیے۔ یہ مدرسے کے سوا دوسرے اوقات میں مستطیع اشخاص کے

بچوں کو خانگی طور پر درس دیکر اپنی مستقل تنخواہ کے علاوہ کافی آمدنی پیدا کر لیتے ہیں۔ بعض کارخانوں کے نجار علاوہ کارخانوں میں کام کرنے کے اپنی فرصت کے اوقات میں قسم قسم کا چوبی سامان بنا کر اپنی مقررہ آمدنی میں بہت کچھ اضافہ کر لیتے ہیں۔ بعض سرکاری عہدہ دار سفر خرچ اور بھتے کی آمدنی سے کچھ پس انداز کر لیتے ہیں اور بعض رشوتیں لیکر ناجایز طور پر اپنی جیبیں گرم کرتے رہتے ہیں۔ اجرت صحیحہ کے تخمینے میں یہ حالات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ بعض کاروبار اسقدر طاقت طلب ہوتے ہیں کہ اُن میں صرف مرد ہی حصہ لے سکتے ہیں، عورتیں اور بچے شریک نہیں ہوسکتے۔ مثلاً لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے کام لینے کی بہت کم گنجایش ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ مردوں کو اوسطاً زیادہ اجرتیں دینی پڑتی ہیں تاکہ تنہا اُن کی آمدنی سے اہل و عیال کی بسر اوقات ہوسکے۔ اس کے برعکس جس کاروبار میں عورتیں اور بچے بھی مردوں کے ساتھ شریک ہو کر کچھ نہ کچھ اجرت کما لیتے ہیں، وہاں سب کی اجرتوں کا اوسط مقابلتاً ادنی ہوتا ہے۔ ان ادنی اجرتوں کو دیکھ کر ہم فوراً یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ان مزدوروں کی اجرت صحیحہ بھی اسی مناسبت سے کم ہوگی۔ کیونکہ باوجود انفرادی طور پر اجرتیں کم ہونے کے بہ حیثیت مجموعی خاندانی آمدنی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات کچھ اضافہ ہی ہو جائے تو عجب نہیں

(۴) اجرت صحیحہ کے تخمینے میں چوتھی قابل لحاظ بات سلسلۂ ملازمت کا قیام ہے۔ ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ بعض کاروبار سال کے بارہ وں

مہینے جاری رہتے ہیں اور بعض خاص موسم کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ دھوبی، حجام، بہشتی، اور خاکروب کی ہر وقت ہی ضرورت ہے اور اس لیے ان اشخاص کی خدمات ہمیشہ مطلوب ہوتی ہیں اور انہیں کسی موسم میں کام نہ ہونے کی وجہ سے بیکار نہیں رہنا پڑتا۔ اس کے برعکس درزیوں اور معماروں کی حالت ہے کہ جنھیں خاص خاص موسموں میں تو خوب کام ملتا ہے، لیکن دوسرے موسموں میں کام کم ملنے کی وجہ سے انھیں کم و بیش بیکار رہنا پڑتا ہے۔ جن پیشوں میں کام سال بھر مستقل طور پر نہیں چلتا، ان میں اجرتوں کی شرح معمول سے زاید رہنا ضروری ہے تاکہ بیکاری کے زمانے میں کام نہ ملنے اور کوئی آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان لاحق ہوتا ہے، اس کی تلافی ہو جایے۔ ان پیشہ وروں کی اعلیٰ اجرتوں کو دیکھ کر یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں بہ مقابل دوسرے پیشہ وروں کے اجرت صحیحہ بھی اوسطاً زیادہ ملتی ہے۔

(۵) بعض پیشے اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ جب تک اُن کے لیے کوئی خاص اہتمام نہ کیا جایے کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ وکالت کی مثال نہایت موزوں ہے۔ وکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک باموقع اور خاص حیثیت کے مکان میں رہے، کاروبار کے لحاظ سے حسب ضرورت محرر ملازم رکھے، مطالعہ کے لیے قانونی کتابوں کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ مہیا کرے، اور حتی الوسع کوئی نہ کوئی باوقعت سواری کا انتظام کرے۔ مختصر یہ کہ اپنی ظاہری حیثیت کو اس طور پر قایم رکھے کہ موکلوں پر اس کا

مہیا کرسکے اور وہ آسے درحقیقت ایک لائق خوددار اور کامیاب وکیل خیال کرنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ اس اہتمام میں کچھ غیر معمولی مصارف لاحق ہوتے ہیں جو محض اس وجہ سے برداشت کرنے پڑتے ہیں کہ اُن کے بغیر وکالت کے پیشے میں کماحقہ کامیابی میسر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ یہی شخص اگر وکالت کی بجائے پولیس، فوج، عدالت، یا کسی اور سرکاری محکمے میں ملازمت کرلیتا یا طبیب یا انجنیر بنجاتا تو شاید اس آمدنی پر ایسا عمدہ مکان کرایہ پر لیتا، نہ کوئی مستقل سواری کا اہتمام کرتا، نہ اتنی تعداد میں نوکر چاکر رکھتا۔ مزید براں یہ امر بھی توجہ کا محتاج ہے کہ مختلف پیشوں کی قابلیت حاصل کرنے کے مصارف مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ زیادہ مصارف والے پیشوں میں اجرتوں کی اوسط شرح مقابلۃً زیادہ ہو لیکن ایسی اجرتوں کی زیادتی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان پیشوں میں اجرت صحیحہ کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ڈاکٹروں کو بمقابل مدرسین کے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فرق کئی اسباب کا نتیجہ ہے منجملہ ان کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ڈاکٹروں کی تعلیم پر مقابلۃً زیادہ وقت اور سرمایہ صرف ہوا ہے۔ پس ڈاکٹروں اور مدرسین کی اجرت صحیحہ کا موازنہ کرتے وقت اس امر کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

(۶) مزدوروں کی عام صحت اور طاقت پر بعض کاموں کا نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً کان کنی کے پیشے میں یہ خصوصیت بدرجۂ اولیٰ نظر آتی ہے۔ گہری گہری کانوں کے اندر جہاں روشنی اور ہوا کا گذر نہ ہو،

روزانہ کئی کئی گھنٹے سخت جسمانی محنت کرنے سے کان کنوں کی صحت بہت جلد خراب ہو جاتی ہے اور وہ چند سال بعد محنت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ بعض کاروبار میں مزدوروں کو ہر وقت حادثہ پیش آنے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ ان حادثوں کی وجہ سے یا تو مزدور بالکل ہلاک ہو جاتے ہیں یا اس طرح زخمی ہو جاتے ہیں کہ آئندہ کام کے قابل نہیں رہتے۔ ظاہر ہے کہ ان پیشوں کی اجرتیں اسی سطح کے دوسرے پیشوں کی اجرتوں سے اوسطاً بہت زیادہ ہونی چاہئیں تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آنے سے مزدور ناکارہ ہو جائے تو اس طور پر اس نقصان کی ایک حد تک تلافی ہو سکے مختصر یہ کہ تعداد اموات اور پیشے کی نوعیت کا باہمی تعلق اب تحقیقی طور پر ثابت ہو گیا ہے چنانچہ انگلستان کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ "دہاں" یا دربوں میں تعداد اموات سب سے کم پائی جاتی ہے۔ اُن کی تعداد اموات سو فرض کر کے نسبتاً تعداد اموات کاشتکاروں میں صرف ۱۱۴، قانون پیشہ لوگوں میں ۱۵۲، شراب بنانے والوں میں ۲۴۵، شراب فروشوں میں ۲۷۴، [illegible] میں ۳۱۴، اور کان کھودنے والوں میں ۳۳۱ تخمینہ کی گئی ہے" (از علم المعیشت)

(۷) مناسبت شوق و مذاق۔ کسی مزدور کی اجرت صحیحہ کے تخمینے میں یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ آیا جو کام اُس سے لیا جاتا ہے وہ اس کے شوق و مذاق کے مطابق ہے یا اُس کے خلاف اس میں شک نہیں کہ اکثر اشخاص بلا کسی خاص میلان طبع کے محض اتفاقی طور پر کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اجرت صحیحہ کے تخمینے میں شوق

مذاق کی مناسبت کا لحاظ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن ہر مقام پر ایسے لوگ بھی کثیر تعداد میں موجود ہوتے ہیں جنھیں بعض مشاغل سے دلچسپی اور بعض دیگر مشاغل سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ انھیں کسب معاش کا کوئی ایسا ذریعہ ملے جو اُن کے مذاق کے مطابق ہو خواہ انھیں کچھ کم آمدنی پر اکتفا کرنا پڑے۔ اور وہ کوئی ایسا کام کرنے پر مجبور نہ ہوں جس سے انھیں طبعاً تنفر ہے، خواہ اُس میں کچھ زیادہ آمدنی ملنے کا قرینہ ہو۔ چنانچہ جو لوگ علمی مشاغل سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ کسی جامعہ کی پروفیسری کو دوسری ملازمتوں پر ترجیح دیتے اور اپنا اکثر و بیشتر وقت درس تدریس مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں۔ جو لوگ حکومت و اقتدار کے شائق ہوتے ہیں وہ مال، پولیس یا عدالت جیسے سررشتوں کی عہدہ داری کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو لوگ ملازمت کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں وہ ڈاکٹری، ٹھیکہ داری، یا تجارت و صناعی جیسے آزاد پیشوں میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ جن اشخاص کو سیاسیات میں حصہ لینا کا شوق ہوتا ہے، وہ بالعموم وکالت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو حصول معاش کے لیے کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس سے اسے طبعاً دلچسپی ہے تو ہمیں چاہیے کہ اُس کی اجرت صحیح کے تخمینے میں اُس حظ و لطف کو بھی شامل کریں جو اسے اپنے شوق کا کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ معاش کی خاطر کوئی

ایسا کام کرنے پر مجبور ہو جس سے اُسے طبعی طور پر تنفر ہے تو لازم ہے کہ اُس کی اجرت صحیحہ کے تخمینے میں اُس تکلیف و کوفت کا بھی لحاظ کیا جائے جو اُسے خلاف طبیعت کام کرنے سے محسوس ہو گی۔ فرض کرو کہ دو شخصوں کو مصوری سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ ان میں سے ایک کو تو کسی فوٹو گرافی کے کارخانے میں ملازمت ملجاتی ہے لیکن دوسرے کو باوجود تلاش و کوشش کے مصوری کا کام نہیں ملتا اور وہ حصول معاش کی مجبوری کسی دفتر میں محرری کی خدمت قبول کرلیتا ہے۔ اب خواہ دونوں کی اجرت متعارفہ اور دیگر تمام حالات یکساں ہوں، تاہم بہ لحاظ اجرت صحیحہ کے پہلا شخص دوسرے سے بہتر تصور کیا جائیگا کیونکہ اسے نہ صرف ماہانہ تنخواہ ملتی ہے بلکہ اپنے شوق و مذاق کا کام کرنے سے ایک طرح کا حظ و لطف بھی حاصل ہوتا ہے جس سے دوسرا شخص محروم ہے۔

فوایدِ خالص

فوایدِ خالص:۔ یہ ایک ظاہر بات ہے کہ ہر شخص کو حصول معاش کی خاطر کچھ نہ کچھ محنت کرنا ضروری ہے*۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں

* زمیندار اور سرمایہ دار اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ خود کچھ محنت کیے بغیر دوسروں کی محنت کی پیداوار میں حصہ بانٹیں کیونکہ وہ پیدایش دولت کے دو ناگزیر عامل یعنی زمین اور اصل پر قابض ہیں۔ لیکن اس استثنا کی اہمیت اب بہ تدریج کم ہوتی جارہی ہے اول تو ہر ملک میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی تعداد بہ مقابل مزدوروں کے یونہی بہت کم ہوتی ہے۔ دوسرے دور جدید کا رجحان اس امر کی طرف روز بروز قوی ہو رہا ہے کہ زمین اور اصل کی خانگی ملکیت کے طریق کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر جملہ ذرایع پیدایش حکومت کی ملک قرار پائیں اور ملک کے تمام باشندے سرکاری کھیتوں اور سرکاری کارخانوں میں محنت کرکے وسائل معاش حاصل کریں۔

مختلف لوگ مختلف پیشے اختیار کرتے اور اُن کی آمدنی سے اپنی زندگی کی ضروریات حاصل کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کسبِ معاش کے لیے کوئی نہ کوئی پیشہ منتخب کرنے میں بالعموم کون سے اصول لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے معاشی اصطلاح "فوایدِ خالص" کی تشریح کرنا ضروری ہے۔

واضح رہے کہ بجز ان کاموں کے جو محض شوق اور تفریح کی خاطر کیے جاتے ہیں، انسان کو ہر کام میں کم و بیش تکلیف اٹھانی اور تکان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تفریحی مشاغل میں بھی بسا اوقات بہت کچھ مشقت اٹھانی پڑتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ خود محنت کرنے والے کی خواہش اور شوق کا نتیجہ، اور کلیتاً اس کے زیرِ اختیار ہے۔ حصولِ معاش کے لیے جسقدر کام کیے جاتے ہیں، وہ اس طور پر انسان کے اختیاری نہیں ہیں۔ یعنی ہر شخص اس بات پر مجبور ہے کہ وہ چار و ناچار کوئی نہ کوئی کام کرے، خواہ اس میں کتنی ہی مشقت اُٹھانی پڑے۔ جب تک وہ اسطرح محنت نہ کریگا، اُسے کوئی اجرت ملے گی اور نہ وہ اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے وسائلِ معاش مہیا کرسکیگا۔ پس معلوم ہوا کہ ہر کام کے، جو حصولِ معاش کی خاطر کیا جاتا ہے دو پہلو ہوا کرتے ہیں، ایک تو اس کا ناخوشگوار پہلو ہے جس کی بدیہی مثال وہ محنت و تکان ہے جو کام کرنے میں لاحق ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا خوشگوار پہلو ہے جس کی نمایاں مثال وہ معاوضۂ محنت ہے جو بشکلِ زر حاصل ہوتا ہے۔ گویا اجرت حاصل کرنے کے لیے انسان تکان برداشت کرنے پر

آمادہ ہوجاتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر کام میں تکان سے علاوہ اور بھی بہت سی ناخوشگوار باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اسی طرح ہر کام میں مقدار زر کے علاوہ اور بھی بہت سی خوشگوار باتیں حاصل ہوجاتی ہیں پس ہر قسم کی محنت کا اصلی معاوضہ معلوم کرنے کی یہ صورت ہے کہ ایک طرف تو اس کی جملہ خوشگوار باتیں شمار کی جائیں اور دوسری طرف اس کی جملہ ناخوشگوار خصوصیات دریافت کی جائیں اور پھر دونوں مجموعوں کی مالیت بہ شکل زر تحقیق کر کے خوشگوار امور کی قدر زر سے ناخوشگوار امور کی قدر زر منہا کردی جائے۔ جو کچھ اس طور پر بچ رہے وہی گویا اس محنت کا حقیقی معاوضہ ہے اور اسی کو اصطلاح معیشت میں "خالص فواید" کہا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مزدور اسی کام کو معاش کا ذریعہ بنائیگا جس میں اسے اپنے حالات کے مطابق خالص فواید کی مقدار زیادہ معلوم ہوگی اور جن کاموں میں اسے خالص فواید کم نظر آئیں گے اُن سے وہ حتی الوسع بچنے کی کوشش کریگا جب کسی پیشے میں خالص فواید کی مقدار اسی سطح کے دوسرے پیشوں سے زیادہ ہوتی ہے تو لوگوں کا اُس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے اور ہر شخص وہی پیشہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ تعداد بہت زیادہ بڑھ جانے سے اجرتیں گھٹنے لگتی ہیں اور بتدریج اُس کے فواید خالص کی مقدار بھی گھٹ کر دوسرے پیشوں کے فواید خالص کے برابر آ لگتی ہے۔ اس کے برعکس جس پیشے میں فواید خالص کی مقدار اُسی سطح کے دوسرے پیشوں سے کم ہوجاتی ہے، لوگ اُس کو ترک کرنے لگتے ہیں حتی کہ تعداد کم ہونے ہوتے

نوبت پہنچتی ہے کہ بغیر اجرتوں میں اضافہ کیے اُس کام کے لیے مزدوروں کا دستیاب ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اضافۂ اجرت کے ذریعہ پھر فواید خالص کی مقدار دوسرے پیشوں کے فواید خالص کے برابر ہو جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر پیشے میں محنت کی رسد بہت کچھ اُس کے خالص فواید سے وابستہ ہوتی ہے

فرق اجرت کے اسباب

فرقِ اجرت کے اسباب۔ تشریحِ اجرت کے عنوان میں ہم اجرت اور قانون طلب و رسد کا تعلق بخوبی واضح کر چکے ہیں۔ اب ہم اسی خیال کی کچھ مزید تفصیل خاصکر اس غرض سے کرنا چاہتے ہیں کہ جو اسباب طلب ورسد کے توسط سے عمل پیرا ہو کر مزدوروں کے مختلف طبقوں میں فرقِ اجرت کا باعث ہوتے ہیں، ان کی کیفیت معلوم ہو جایے۔

جہانتک طلب کا تعلق ہے، اس فرق کا سبب نہایت بدیہی ہے چونکہ محنت ہر چیز کی پیدائش کے لیے ناگزیر ہے لھذا جسقدر کسی چیز کی طلب کم یا زیادہ ہوگی، اُسی قدر اُس چیز کے بنانے والے بھی کم یا زیادہ تعداد میں درکار ہوں گے۔ دکن میں لوگ بالعموم فرش پر سونے کے عادی ہیں۔ فرض کرو کہ کسی وجہ سے یہ عادت متروک ہو جاتی ہے اور پلنگوں پر سونے کا رواج پھیلتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں پلنگوں کی طلب بڑھیگی پلنگ بنانے والے بھی زیادہ تعداد میں درکار ہوں گے۔ اسی طرح فرض کرو کہ لوگ کسی وجہ سے سیندھی پینا ترک کر دیتے ہیں۔ سیندھی کی طلب گھٹنے سے سیندھی نکالنے اور فروخت کرنے والوں کی بھی پہلے سے کم تعداد مطلوب ہوگی۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کی محنت کی طلب اُن اشیا کی طلب سے جن کے

بنانے میں وہ کام آئے، وابستہ ہوتی ہے۔

اب اگر محنت کی رسد سراسر اُس کی طلب کی پیرو ہوتی تو پھر فرق اجرت کے مزید اسباب پیدا نہ ہوتے۔ لیکن صورتِ حال درحقیقت اس طور پر واقع نہیں ہوی ہے۔ محنت کی رسد میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں جس کی وجہ سے طلب کا عمل پورے طور پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ ترقی پذیر محنت کی مقدار میں کمی واقع ہوتی ہے اور مزدوروں میں اعلیٰ اور ادنی طبقے نمودار ہوجاتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان ہی رکاوٹوں کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہیں:۔

فطری استعداد

(ا) قدرتی مناسبت و استعداد:۔ ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ قدرت کی طرف سے دماغی وجسمانی قابلیتوں، اور ذہانت و استعداد جیسی قوتوں کی تقسیم مساوی طور پر نہیں ہوئی ہے۔ فوجی خدمات کے لیے وہی اشخاص موزوں ہوسکتے ہیں جن کے قویٰ مضبوط، اور جن کے دل قوی ہوں اور جو سخت سے سخت جسمانی مشقتوں کے متحمل ہوسکتے ہوں بنک کے پیچیدہ کاروبار میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس سے کوئی طبعی مناسبت نہ ہو۔ تجارت وصنعت میں سرسبز ہونے کے لیے جداگانہ خصوصیات درکار ہیں۔ یہی حال کم وبیش دوسرے پیشوں کا ہے۔ وکالت، طب، تعلیمات، تعمیرات، اخبار نویسی، ٹھیکہ داری ان میں سے ہر ایک کے لیے ہر شخص موزوں نہیں ہوسکتا۔ خود تعلیم کا فایدہ بھی اُسی وقت پورے طور پر حاصل ہوسکتا ہے جبکہ پہلے سے کچھ

قدرتی مناسبت واستعداد موجود ہو۔ شاعری، موسیقی، مصوری، جیسے فنون لطیفہ کے لیے تو ذاتی استعداد وطبعی موزونیت کی ضرورت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبعی میلان وفطری مناسبت تقریباً ہر کاروبار میں حصول کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ چنانچہ اس کی موجودگی و عدم موجودگی کا اثر تقریباً ہر پیشے میں بعضوں کی کامیابی اور بعضوں کی ناکامی کی شکل میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ قدرتی مناسبت واستعداد کی غیر مساوی تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر خاص خاص پیشوں میں زیادہ محنت مطلوب ہو تو اُس کی بہم رسانی کے لیے کافی مزدور نہیں ملتے۔ کیونکہ قدرت ہی نے ایسی قابلیتیں بہت کم پیدا کی ہیں۔ اعلیٰ درجے کے گانے والے ایک ایک گھنٹے میں کئی کئی ہزار روپے کما لیتے ہیں، اعلیٰ درجے کے وکیل ایک ایک پیشی کی کئی کئی ہزار روپے فیس لیتے ہیں، عمدہ طبیبوں کو گھر بیٹھے ہزاروں کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ قانون طلب ورسد کے مطابق ان غیر معمولی آمدنیوں کا یہ اثر ہونا چاہئے تھا کہ سب لوگ یہی پیشے اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ قدرتی مناسبت واستعداد کی کمیابی اس قانون کے عمل میں مزاحم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے رسد افزونی طلب کا ساتھ نہیں دے سکتی اور مختلف مزدوروں کی اجرتوں میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتے ہیں۔

(ب) یہ بھی ایک عام مشاہدہ ہے کہ محض قدرتی استعداد کسی پیشے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ قدرتی استعداد سے

کما حقہ فایدہ حاصل کرنے کے لیے خاص قسم کی تعلیم و تربیت لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہوتا بلکہ جہاں تعلیم صرف چند خاص طبقوں کا حق سمجھی جاتی ہے اور ملک کے عام باشندے تعلیم پانے کے مواقع سے محروم رکھے جاتے ہیں، وہاں قدرتی استعداد کی کمیابی کے علاوہ محنت کی رسد میں ایک اور مزاحمت بھی سدِ راہ ہوتی ہے اول تو ہر شخص اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ دوسرے جن لوگوں کو قدرت کی طرف سے یہ استعداد عطا ہوی ہے، اُن میں نہ معلوم کتنی تعداد ایسے اشخاص کی ہے جو ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے کثیر مصارف برداشت نہ کرنے کے باعث اپنی استعداد کو کام میں نہیں لاسکتے۔ پس فرقِ اجرت کا ایک سبب اکتسابِ قابلیت کی دقتیں اور اس کے مصارف بھی ہیں۔

(ج) مذہبی اعتقاد، ملکی قوانین، اور رسم و رواج بھی بسا اوقات محنت کی رسد میں مزاحم ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلمان شراب سازی اور اس کے متعلقہ تمام کاروبار کو حرام سمجھتے ہیں۔ اکثر ہنود گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے اور چرمی سامان بنانے اور فروخت کرنے میں حصہ نہیں لیتے۔ ہند میں طریق ذات پات کی وجہ سے ہر شخص صرف اپنا آبائی پیشہ ہی اختیار کرسکتا ہے، خواہ اُسے اس پیشے سے کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو اور خواہ بہ لحاظِ آمدنی اس کی کیسی ہی ناگفتہ بہ حالت ہو۔ مزدوروں کی فلاح و بہبودی کے خیال سے حکومت کی جانب سے جو قوانین کارخانہ جات نافذ کیے جاتے ہیں، ان کا رجحان بھی محنت کی رسد کو محدود کرنے کی طرف

ہوتا ہے۔ بسا اوقات خود مزدور اپنی انجمنیں قایم کرلیتے ہیں اور باہمی سمجھوتہ سے اپنی محنت کی رسد میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی جدوجہد سے مختلف پیشوں کی اجرتوں میں فرق پیدا ہونا لازمی ہے۔

اضافۂ اجرت کے نتایج

اضافۂ اجرت کے نتایج۔ اوپر ہم اس واقعے کی تشریح کر چکے ہیں کہ اجرتیں طلب ورسد کے زیر اثر معین ہوتی ہیں اور چونکہ خود محنت کی طلب ورسد کے حالات ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اجرتوں میں بھی وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ جہاں تک اجرتوں کی تخفیف کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ وہ مزدوروں کے لیے کسی حالت میں خوشگوار نہیں ہوسکتی۔ مزدوروں کی کارکردگی پر اس کا کم وبیش برا اثر پڑنا یقینی ہے۔ لیکن اضافۂ اجرت کی حالت اسقدر سادہ اور اس کے نتایج اسقدر بدیہی نہیں ہوتے۔ بعض صورتوں میں اضافۂ اجرت مزدوروں کے حق میں مفید ہوتا ہے تو بعض صورتوں میں مضر، اور بعض حالات میں اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ذیل میں ہم انہی مختلف حالات کی تشریح کرنا چاہتے ہیں:

مزدور پر اضافۂ اجرت کا اثر معلوم کرنے کے لیے ہمیں اولاً یہ دریافت کرنا چاہیے کہ وہ اپنی مزید اجرت کس قسم کی احتیاجات پر صرف کرتا ہے کیونکہ اسی پر اضافۂ اجرت کے اچھے یا برے نتایج کا انحصار ہے۔ غور کرنے سے ہم انسانی احتیاجات کو تین مختلف عنوانوں میں منقسم پاتے ہیں! ایک تو وہ ضروریات ہیں جن کی تکمیل بقائے حیات کے لیے اگزیر ہے

مثلاً خوراک، لباس، مکان۔ دوسرے وہ ضروریات ہیں جنکی تکمیل کارکردگی قایم رکھنے یا اُس میں اضافہ کرنے کے لیے لازمی ہے مثلاً مقوی غذا حسب ضرورت لباس و مکان، عمدہ آب و ہوا، آرام و تفریح کے مواقع وغیرہ تیسرے وہ تعیشات ہیں جو نہ تو بقائے حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور نہ قیام کارکردگی کے لیے ضروری، بلکہ جو بسا اوقات مزدوروں کے اخلاق و عادات اور ان کی صحت جسمانی و دماغی کو خراب کرکے اُن کی کارکردگی کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

اب اگر مزدور صرف ضروریات زندگی پر قانع رہیں اور باوجود اضافہ اجرت کے ضروریات کارکردگی کی طرف متوجہ نہ ہوں تو ایسی حالت میں اضافۂ اجرت کا نتیجہ تخفیفِ محنت کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ پہلے جو اجرت سات روز کی محنت کے بعد میسر ہوتی تھی، اگر وہ صرف چار روز کی محنت سے حاصل ہونے لگے تو ایسے مزدور بجائے اِس کے کہ حسب سابق برابر سات روز کام کرکے مقدار اجرت میں اضافہ کریں، صرف چار روز کام کرینگے اور بقیہ تین روز آرام طلبی میں گذار دیں گے۔ چنانچہ گرم ممالک میں جہاں لوگ بالعموم سخت محنت کے عادی نہیں ہوتے، ایسے مزدوروں کی مثالیں بہ کثرت دستیاب ہوتی ہیں۔ ہند کے کثیر التعداد مزدوروں کی کم و بیش یہی حالت ہے۔ ملک کے لیے بہ حیثیت مجموعی یہ کوئی خوشگوار صورت نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں باشندوں کا معیار زندگی ادنیٰ ترین سطح سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اُس کی وجہ سے حوصلے پست

رہتے ہیں، اُمنگیں مٹ جاتی ہیں، ہر قسم کی ترقی کا خیال محو ہو جاتا ہے اور ادنیٰ کارکردگی کی وجہ سے خود پیدائش دولت کے کاروبار میں ایک طرح کا جمود جاری رہتا ہے۔ تعلیم کی عام اشاعت اور اس کے ذریعے سے مزدوروں میں خود اُن کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا اس ناخوشگوار صورتِ حال کو رفع کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اضافۂ اجرت کے بہترین نتائج نہ صرف اجرت پانے والوں کے حق میں بلکہ بحیثیت مجموعی تمام ملک کے لیے اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ مزدور اپنی مزید اجرت ضروریات کارکردگی کی تکمیل پر صرف کریں۔ یورپ و امریکہ کے مزدوروں کا رجحان بالعموم اسی جانب پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی مزید اجرت سے کارکردگی بڑھانے والی طرح طرح کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اور جوں جوں کارکردگی بڑھتی جاتی ہے، مزید اضافہ اجرت کے لیے موافق حالات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ خوشگوار سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ یورپ و امریکہ کے مزدور بالعموم نہایت بلند حوصلہ، اعلیٰ درجہ کے کارگزار، اور ہمیشہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور خوشگوار بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ بعض ممالک میں بہت کچھ سیاسی اقتدار حاصل کر چکے ہیں اور سرمایہ دار طبقوں کو مغلوب کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔

اس کے برعکس اگر اضافۂ اجرت کی وجہ سے مزدور تعیشات میں

مبتلا ہو جائیں تو یہ صورت نہ صرف مزدوروں کے حق میں بلکہ بسا اوقات سارے ملک کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔ تعیشات کی وجہ سے کارکردگی خراب ہو جاتی ہے، اور کارکردگی کی خرابی سے اجرتوں میں تخفیف واقع ہوتی ہے۔ جہاں کہیں یہ صورت پیدا ہو جائے وہاں حکومت اور رہنمایانِ ملک کا فرض ہے کہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوں اور اصلاح کی ضروری تدبیریں اختیار کریں۔ ورنہ تخفیف کارکردگی و تخفیف اجرت، ایک دوسرے کا باری باری سے باعث و نتیجہ بنکر ساری قوم کو معاشی تباہی اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا کر دیں گے۔

قیام مزدوراں

ترقیاتِ مزدوراں۔ ہم ابھی یہ کہہ آئے ہیں کہ بعض ممالک میں مزدوروں نے اسقدر ترقی کر لی ہے کہ وہ اپنی جدوجہد نہ صرف اضافہ اجرت، تخفیف اوقات کار، اور اسی نوعیت کے دوسرے مطالبات تک محدود رکھتے ہیں بلکہ اپنے اپنے ملک کی حکومت پر قابض ہونے کی فکر میں لگے رہتے ہیں مثلاً برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ میں مزدور جماعت ایک نہایت قوی عنصر تصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ انتخابات میں وہ برسرِ اقتدار آ چکی ہے اور دوبارہ اپنے ملک کی حکومت پر قابض ہے۔ یہی حال یورپ کے دوسرے ممالک کا ہے جہاں مزدوروں کی باقاعدہ منظم جماعتیں قایم ہیں جو اپنے اپنے ملک کی حکومت میں کم و بیش حصہ لیتی اور مزید اختیارات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ اس کے برعکس ایشیا اور آفریقہ کے ممالک میں مزدوروں کی نہ ایسی تنظیم یافتہ جماعتیں ہیں اور نہ اُن کے اسقدر بلند حوصلے ہیں

مزدور بالعموم منتشر، جاہل، پست حوصلہ، اور مفلس نظر آتے ہیں اور اُن کی معاش کا مدار خاصکر ایسے کاروبار ہیں جو پیدائش بر پیمانہ کبیر پر چلتے ہیں محض آجروں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے البتہ ان ممالک کے مزدوروں میں بھی کچھ بے چینی اور ہلچل پیدا ہو چلی ہے جو امید ہے کہ آئندہ چلکر مزدوروں کی ترقی اور بہبودی کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ بہرحال بہر صورت مشرق ومغرب کے مزدوروں میں بہ لحاظ اُن کی خوشحالی اور عام ترقی کے زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ واضح رہے کہ خود مغربی ممالک کے مزدوروں کی ترقی بھی کچھ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ سو ڈیڑھ سو برس قبل وہ بھی ایشیائی مزدوروں سے اگر بدتر نہیں تو کسی طرح بہتر بھی نہیں تھے اس عنوان میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان اسباب کی ماہیت پر غور کرنا چاہتے ہیں جن سے ایک طرف تو ایشیائی مزدوروں کی موجودہ پستی اور دوسری طرف مغربی ممالک کے مزدوروں کی غیر معمولی ترقی، دونوں کی کافی توضیح ہوجاتی ہے۔

سابقہ عنوانوں میں ہم اس واقعے کی مفصل تشریح کر چکے ہیں کہ قیمت کی طرح اجرت بھی طلب ورسد کے زیر اثر معین ہوتی ہے۔ لیکن محنت کی طلب ورسد کے حالات خاصکر پسماندہ ممالک میں کچھ اس طور پر واقع ہوتے ہیں کہ خریداروں اور فروشندوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ خریداروں یعنی آجروں کے حق میں مفید اور فروشندوں یعنی مزدوروں کے حق میں سخت مضر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم ان حالات کی مختصر تشریح کرتے ہیں :-

(۱) آجروں اور مزدوروں کی حالت کا ایک نمایاں فرق ان دونوں طبقوں کی تعداد میں مضمر ہے۔ ہر ملک کی آبادی کا اکثر و بیشتر حصہ مزدوروں پر مشتمل ہوتا ہے اور ان سے کام لینے والے یعنی آجر ہر جگہ مقابلۃً بہت کم ہوتے ہیں۔ پیدائش دولت کے جدید طریقوں کی بدولت اس فرق تعداد کے مضر اثرات اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ مزدور اپنے طور پر چھوٹے چھوٹے کاروبار تو آجکل جاری نہیں کر سکتے کیونکہ یہ دور ہی پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا ہے۔ لہذا اُن کی معاش کا مدار اس بات پر ہے کہ بڑے بڑے کاروبار والے اُن کے لیے کام مہیا کریں۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو چند بڑے بڑے کارخانے آجروں کی ایک محدود تعداد کے قبضے میں رہتے ہیں اور دوسری طرف روزگار تلاش کرنے والے مزدوروں کا ایک انبوہ کثیر ان کارخانوں میں ملازمت کے لیے کوشاں نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں آجر جو اجرت پیش کرے، مزدور اُسے قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ زیادہ اجرت طلب کرتا ہے تو اُس کی جگہ کم اجرت پر کام کرنے کے لیے بیسیوں مزدور نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں آجر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اجرتوں میں اضافہ کرے۔

(۲) آجروں اور مزدوروں کی حالت میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ آجر نہایت دولتمند اور ہر طرح سے خوشحال ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے انھیں کاروبار بند کرنا پڑے، تب بھی وہ یکایک مفلس نہیں ہو جاتے اُن کے پاس بچھلا پس انداز اسقدر موجود ہوتا ہے کہ وہ بہ آسانی اپنی

گذر اوقات کرسکتے ہیں۔ مزدوروں کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ بہت کم صاحبِ دولت ہوتے ہیں اور اُن کے پاس کوئی قابلِ لحاظ پس انداز نہیں ہوتا۔ روزانہ یا ہفتہ وار جو کچھ اجرت ملتی ہے، اس پر اُن کی اور اُن کے سارے کنبے کی پرورش کا انحصار ہے۔ اگر کسی روز کام نہ ملے تو فاقہ کشی کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس حالت میں کوئی مزدور کیونکر اپنی طرف سے کام چھوڑنے کی ہمت کرسکتا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ آجر جو اجرت پیش کرے، جتنی دیر کام لے، اور جس حالت میں کام لے، سب بلا چون و چرا قبول کرے۔

(iii) آجروں اور مزدوروں کا ایک اور بڑا فرق ان دونوں طبقوں کی تعلیمی حالت سے متعلق ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تعلیم سے انسانوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اُن کی ہمتیں بلند اور حوصلے اعلیٰ ہو جاتے ہیں۔ مصائب کا مقابلہ کرنے اور بالآخر ان پر غالب آنے کی اُن میں زیادہ قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ زبردست حربہ بھی زیادہ تر آجروں اور سرمایہ داروں کے قبضے میں رہتا ہے اور مزدور اپنی بے بضاعتی کے سبب اس سے بالعموم محروم رہتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ آجروں اور مزدوروں کے باہمی تعلقات میں قوت و استحکام کے جسقدر اسباب ہیں، وہ آجروں یا سرمایہ داروں کے طبقے کو حاصل ہیں اور ضعف و احتیاج کے جسقدر حالات ہیں، وہ مزدوروں کے حصے میں آئے ہیں۔ شرحِ اجرت اور دوسرے مسائل متعلقہ پر اس صورتِ حال کا جو

اثر پڑنا چاہئے وہ محتاج بیان نہیں۔

دور جدید میں پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے مطابق سب سے پہلے جس ملک نے نمایاں ترقی کی، وہ انگلستان ہے چنانچہ سب سے پہلے انگلستان ہی میں مزدور کے مسائل نے زیادہ اہمیت حاصل کی اور بہ حیثیت مزدوروں کے وہیں سے اُن کی ترقی کا آغاز ہوا۔ اوّل اوّل عام جہالت کے باعث انھیں خود اپنے طبقے سے رہنما نہیں مل سکے اور دوسرے طبقوں کے ہمدرد افراد سے مدد حاصل کرنی پڑی لیکن بعد کو ابتدائی جبری تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ کمزوری بھی رفع ہوگئی۔ اور اب تو مزدوروں کی جماعت میں ایسے ایسے لائق افراد پیدا ہوتے ہیں جو بڑی بڑی سلطنتوں کو سنبھالنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

ہم ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ فقدانِ تعلیم کے علاوہ مزدوروں میں دو نہایت زبردست کمزوریاں اور تھیں جو انھیں آجروں کے مقابلہ میں سر اٹھانے نہیں دیتی تھیں۔ ایک انکا انتشار، دوسرے اُن کا افلاس۔ لہٰذا جب اصلاح کی تحریک شروع ہوی تو سب سے پہلے انہیں نقایص کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جہاں تک انتشار کا تعلق ہے ایک ہی قسم کا کام کرنے والے مزدوروں نے آپس میں اتحاد کرکے ہر مقام پر اپنی ایک ایک انجمن قایم کردی۔ چنانچہ ٹریڈ یونین یا انجمن اتحاد مزدوراں سے ایسی ہی انجمنیں مراد ہیں۔ ان انجمنوں کی ترقی، ان کے کاروبار کی تفصیل، اور اُن کی بین الاقوامی اہمیت پر بحث کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ یہاں صرف

یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ ان کی بدولت مزدوروں نے آجروں کے ساتھ فرداً فرداً اپنے معاملات طے کرنا چھوڑ دیا بلکہ اجتماعی طور پر اپنی ملازمت کے شرائط طے کرنے لگے۔ انجمن کی طرف سے شرحِ اجرت، اوقاتِ کار، اور دیگر تمام حالات معین کر دیے جاتے ہیں اور کوئی مزدور جو انجمن کا رکن ہو ان شرائط کے خلاف آجر کے ہاں ملازمت نہیں کر سکتا اور چونکہ ہر مقام کے کم و بیش تمام مزدور وہاں کی انجمن میں شامل ہوتے ہیں لہٰذا اگر آجر شرحِ اجرت کم کر دے یا کام کا وقت بڑھا دے یا مزدوروں کے خلاف کوئی اور تدبیر اختیار کرے تو اُس مقام کے سارے مزدور مالک کا کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس حالت کو اصطلاح میں اسٹرائک یا ہڑتال کہا جاتا ہے۔ اب آجر کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مزدوروں کے مطالبات کم و بیش پورے کر دے یا کاروبار بند کر کے اس سے بھی زیادہ خسارہ اٹھائے۔ بہرصورت یہ کیفیت تو نہیں رہی کہ اگر ایک مزدور کام چھوڑ دے تو اُس کی جگہ دس اور مزدور کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

مزدوروں کا انتشار تو اس ترکیب سے بہت بڑی حد تک رفع ہو گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اُن کو اسٹرائک کے قابل کس طرح بنایا جائے۔ جب تک چند روز یا چند ہفتے بلا کسی اجرت کے بسر اوقات کرنے کی اُن میں قابلیت نہ ہو، وہ کیونکر اسٹرائک کی ہمت کر سکتے ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انجمنیں اپنے اراکین سے

ہفتہ وار یا ماہانہ کچھ چندہ وصول کرتی ہیں جو بہ طور ذخیرۂ محفوظ کے جمع ہوتا رہتا ہے اور جب کبھی اسٹرائک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بیکار مزدوروں کی امداد میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے مزدوروں کی دوسری بنیادی کمزوری یعنی کچھ پس انداز کا نہ ہونا اگر پورے طور پر نہیں تو پھر بھی ایک بڑی حد تک رفع ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو ہم نے انجمہائے اتحاد مزدوروں کی جدوجہد کے صرف دو ابتدائی شعبے بیان کیے ہیں لیکن درحقیقت یہ انجمنیں اپنے اراکین کی حالت سنبھالنے اور آجروں کا مقابلہ کرنے میں ہر ممکنہ طریقہ سے مدد دیتی ہیں۔ تخفیف اوقات، اضافۂ اجرت، معاوضۂ حوادث، جبری بیمۂ شرکت منافع، وغیرہ ان کی جدوجہد کے چند اور شعبے ہیں جن کی تفصیل سے یورپ کی مختلف زبانوں میں سیکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں۔

موجودہ زمانے میں مزدوروں کی ترقی کا ایک اور دلچسپ نتیجہ یہ ہے کہ وہی حکومتیں جو آج سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے قانون کی مدد سے لیکر مزدوروں کو ہر ممکنہ طریقہ سے دبایا کرتی تھیں، اب ان کی حمایت میں طرح طرح کے قوانین نافذ کرتی ہیں۔ جن ممالک میں صنعت و حرفت نے ذرا بھی ترقی کی ہے، وہاں کم و بیش مکمل قوانین کار خانجات نافذ ہیں جنکا منشاء یہ ہے کہ مزدوروں کو کارخانہ داروں کی زیادتیوں سے محفوظ رکھا جائے اور ان کے واجبی حقوق محض سرمایہ داروں کی

زبردستی سے پامال نہ ہونے پائیں۔ ہندوستان میں بھی جو بہ لحاظ صنعت و حرفت کے ایک نہایت ہی پسماندہ ملک خیال کیا جاتا ہے قوانین کارخانہ جات ایک مدت سے نافذ ہیں اور اُن میں حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً ترمیم ہوتی رہتی ہے۔

موجودہ زمانے میں مزدوروں نے اپنا دائرۂ عمل صرف اپنے اپنے ملک تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وہ دوسرے ممالک کے مزدوروں کے حالات معلوم کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ عملی طور پر اظہارِ ہمدردی کرتے رہتے ہیں۔ مختلف ممالک کے مزدور اپنے اپنے نمایندوں کے ذریعے سے بین الاقوامی کانفرنسوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنی حالت کی اصلاح اور ترقی کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچتے ہیں۔

سُود

پیدائشِ دولت میں اصل یا سرمایے کی غیر معمولی اہمیت کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ کر چکے ہیں۔ معاشی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ سرمایے کو یہ غیر معمولی اہمیت ازمنۂ قدیم یا قرونِ وسطیٰ میں میسر نہیں تھی۔ ازمنۂ قدیم میں پیدائشِ دولت کا مدار بیشتر زمین پر تھا محنت اگرچہ ناگزیر تھی لیکن اس کی جد و جہد کا میدان بہت تنگ تھا

اور ہر ملک کے باشندوں کی خوشحالی سراسر وہاں کے قدرتی عطیات
منحصر تھی۔ قرون وسطی میں انسانی معلومات کی ترقی کی بدولت پیدائش
دولت میں محنت کا دخل بہت بڑھ گیا۔ اگرچہ قدرتی وسائل کی احتیاج
اب بھی باقی تھی اور غالباً ہمیشہ باقی رہے گی تاہم انسان اب اس قابل
ہوگیا تھا کہ محدود قدرتی وسائل سے مقابلتہً زیادہ دولت پیدا کرسکے۔
لیکن موجودہ زمانے میں سائنس کے انکشافات اور عجیب و غریب
ایجادات نے پیدائش دولت کے لیے سرمایے کو اسقدر ناگزیر بنا دیا
کہ اب قدرتی وسائل اور انسان کی محنت، دونوں اس کے تابع نظر
آتے ہیں۔ عطیات قدرت کی فراوانی اور آبادی کی کثرت آج کل
کسی ملک کو معاشی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ
اُن دونوں سے کام لینے کے لیے کافی سرمایہ میسر نہ ہو۔ مزدوروں
کی لاچاری اور سرمایہ داروں کی چیرہ دستی کا راز درحقیقت اسی
احتیاج میں مضمر ہے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کو "دور اصل شاہی"
دور کہا جاتا ہے۔

سود کی ماہیت

سود کی ماہیت۔ سود کس بات کا معاوضہ ہے اور وہ
کیونکر پیدا ہوتا ہے، اِن سوالات کا جواب دینا ہی گویا سود کی ماہیت
معلوم کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسپر ابتدا ہی سے سخت اختلاف
رائے جاری ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ماہیت سود
کے متعلق مختلف نظریے نمودار ہوتے گئے اور تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد

زید تحقیق کی روشنی میں یا تو سراسر غلط ثابت ہوئے یا بہت کچھ ترمیم طلب بن گئے۔ یہاں ان تمام نظریوں کی تحقیق و تنقید نہ صرف غیر ضروری بلکہ حیران کن ثابت ہوگی لھذا ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ صرف انہی امور کی تشریح کریں گے جو اس بارے میں تحقیق جدید کا نتیجہ اور مقابلۃً سب سے زیادہ مسلم ہیں۔

پیدائش دولت کے سلسلے میں ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اجتماع اصل کے لیے پس اندازی ایک لازمی شرط ہے۔ اگر کوئی شخص جسقدر کمائے اسے ساتھ ساتھ خرچ کرتا چلا جائے تو اس کے پاس کبھی کوئی دولت جمع نہیں ہوگی یہی وجہ ہے کہ جس ملک کے باشندوں کی کثیر تعداد اپنی آمدنی کا کوئی جزو پس انداز نہ کرے یا نہ کر سکے، وہاں کاروبار کے لیے اصل بہ مشکل دستیاب ہوگا۔ بہر حال یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی ملک میں اصل جمع نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے باشندوں میں پس اندازی کی عادت نہ ہو۔ لیکن جہاں تک خود پس اندازی کا تعلق ہے، اس کی کیفیت مختلف باشندوں کے نزدیک مختلف ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے پس انداز کرنے والے تین مختلف گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں:

(۱) ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو دولت کے بڑے بڑے ذخیروں کے مالک ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی جملہ احتیاجات دل کھول کر پوری کرنے پر بھی ان کے پاس بہت کچھ دولت بچ رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دولت کو پس انداز کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر مالکان دولت

شغل اصل کے ذرائع موجود نہ ہوں تو کیا عجب ہے کہ یہ لوگ بجائے سود طلب کرنے کے دوسروں کو اپنی دولت کی حفاظت کا معاوضہ ادا کریں۔

(ii) دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو آئندہ لاحق ہونے والی اہم احتیاجات کو پیش نظر رکھ کر بعض موجودہ احتیاجات کو ملتوی یا ترک کر دیتے ہیں اور اسطرح اپنی آمدنی کا ایک جزو پس انداز کرتے ہیں۔ اس گروہ کی پس اندازی کا باعث دولت کی افراط نہیں بلکہ آئندہ احتیاجات کی فکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی دولت بہ حفاظت رکھنے کا دوسروں کو معاوضہ دیں۔

(iii) تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو نہ خاصکر آئندہ احتیاجات کے خیال سے پس انداز کرتے ہیں اور نہ دولت کی افراط کی وجہ سے، بلکہ جنکی پس اندازی کا باعث محض مزید آمدنی کی توقع ہوتی ہے۔ یہ لوگ بسا اوقات اپنی ضروری احتیاجات کو دبا کر اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ بچا سکتے ہیں تاکہ اُسے دوسرون کو قرض دیکر مزید آمدنی پیدا کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو درحقیقت اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر دوسروں کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی کل آمدنی موجودہ ضروریات پر خرچ کر دیتے اور اس طرح خود کو تکلیف میں نہ ڈالتے لیکن چونکہ پس انداز کرنے سے کچھ زیادہ آمدنی ملنے کی توقع ہے، اس لیے وہ اپنی موجودہ ضرریات کو آئندہ کے لیے

ترک کر دیتے ہیں۔ انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ فوری لطف اندوزی کو مستقبل پر ترجیح دیتا ہے۔ التوائے لطف اسے گران گزرتا ہے۔ چنانچہ اسی سے معاشیات کا یہ مشہور کلیہ اخذ کیا گیا ہے کہ "بحالت احتیاج کسی چیز کے ملنے کے وقت میں جسقدر بعد ہوگا اسی قدر موجودہ معیار کے مطابق اُس کی قدر گھٹ جائے گی"۔ اصطلاح معیشت میں اسی کو خاصۂ انتظار کشی کہتے ہیں۔ جب پیدائش اصل وشغل اصل دونوں کا مدار انتظار کشی پر ٹھہرا تو کوئی وجہ نہیں کہ جو لوگ انتظار کشی کی تکلیف اٹھا کر دوسروں کے لیے اُن کی مطلوبہ چیز مہیا کر دیتے ہیں، وہ اپنی اس خدمت یا ایثار کا کوئی معاوضہ نہ پائیں۔

لیکن یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو لوگ گروہ اول اور گروہِ دوم کے افراد کی طرح بلا انتظار کشی کی تکلیف کے اور خود اپنی غرض کے لیے پس انداز کرتے ہیں وہ بھی بلا تکلف اسی طرح اپنے اصل کا معاوضہ پاتے اور اپنے آپ کو اسکا مستحق سمجھتے ہیں جس طرح کہ تیسرے گروہ والے۔ ایسی صورت میں یہ نظریہ کہ انتظار کشی سود کا باعث ہے، برقرار نہیں رہ سکتا۔ واضح ہو کہ اگر گروہِ اول و دوم کی پس انداز کی ہوی دولت سے اصل کی کل طلب پوری ہو سکے تو ممکن ہے کہ لوگوں کو ان کا مطلوبہ اصل بلا معاوضہ مل جائے کیونکہ ایسی حالت میں دولت کی پس اندازی، انتظار کشی کا نتیجہ نہیں ہوتی اور اسی لیے اصلدار بھی سود کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ لیکن کاروباری ضروریات کے لیے

اصل کی طلب خاصکر موجودہ زمانے میں اسقدر زیادہ ہے کہ جب تک تیسرے گروہ کے اندوختے بھی حاصل نہ کیے جائیں کام نہیں چلسکتا اور چونکہ تیسرے گروہ کے اندوختے سراسر انتظارکشی کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے جب تک کہ سود کا لالچ نہ ہو، اُن کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ بازار میں اصل کی جسقدر رسد موجود ہے، اس کا ایک حصہ تو بلاکسی انتظارکشی کے پس انداز ہوا ہے اور بقیہ حصہ محض انتظارکشی کا نتیجہ ہے۔ لیکن کاروباری ضروریات میں جس طرح انتظارکشی والا اصل کام کرتا ہے اُسی طرح وہ اصل بھی کام دیتا ہے جو انتظارکشی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ پیدائش دولت کے لیے ان دونوں کی کارگزاری میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ عملی طور پر بازار میں ہر جداگانہ مقدار اصل کی پیدائش کا حال دریافت کیا جائے اور بہ لحاظ انتظارکشی و عدم انتظارکشی کسی پر سود ادا کیا جاے اور کسی پر نہ ادا کیا جایے۔

یہاں تک تو ہم نے ماہیت سود کے متعلق صرف ایک سوال کا جواب دیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اجتماع اصل اکثر و بیشتر انتظارکشی کے ساتھ وابستہ ہے لہذا جب تک کہ انتظارکشی کا کافی صلہ نہ ملے، حسب ضرورت اصل کی رسد حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ سود پیدا کیونکر ہوتا ہے۔ لوگ طرح طرح کی ضروریات کے لیے قرض لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک مقررہ میعاد کے بعد

انھیں نہ صرف اپنا قرضہ واپس کرنا پڑیگا۔ بلکہ کچھ مزید رقم بطور سود کے ادا کرنی پڑے گی۔ باوجود اس کے وہ خوشی خوشی قرض لیتے ہیں اور اگر اس کے ملنے میں کچھ دقتیں نظر آتی ہیں تو اعلیٰ شرح سے سود ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لھذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں اس طرح سود ادا کرنے کی قابلیت کیسے پیدا ہوتی ہے آخر انھیں اصل سے کیا فایدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی کا ایک جزو خوشی خوشی دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ اصل منجملہ اور عاملین پیدایش کے ایک عامل ہے۔ پیدایش دولت میں اصل کی کارگزاری کا حال ہم نہایت تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے ہیں۔ اگر آج دنیا اصل سے کام لینا چھوڑ دے تو انسان بہ لحاظ اپنی تہذیب و تمدن کے ہزار ہا سال پیچھے ہٹ جائے۔ ارتقاء تمدن اور اصل کا روز افزوں استعمال گویا لازم و ملزوم ہیں۔ عملی طور پر اصل کی کارگزاری کی بیسیوں مثالیں روزانہ ہماری نظر کے سامنے گزرتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر دو درزیوں کا مقابلہ کیجیے جن میں سے ایک صرف ہاتھ سے سلائی کرتا ہے اور دوسرا مشین سے کام لیتا ہے۔ اگرچہ پہلا درزی بھی کچھ نہ کچھ اصل استعمال کرنے پر مجبور ہے تاہم بہ لحاظ مقدار و کارگزاری دونوں میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے۔ اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ہاتھ سے سلائی کرنے والا درزی ایک روز میں جسقدر کام کر سکتا ہے، مشین والا درزی اس سے کئی گنا

زیادہ کام کرتا ہے۔ پھر کام کی خوبی اور مصارف کی کمی کا فرق علٰحدہ ہے۔
فرض کرو کہ ایک درزی ایک روپیہ کماتا ہے تو دوسرے کو زیادہ اور اچھا
کام کرنے کی وجہ سے روزانہ ساڑھے تین روپیوں تک آمدنی ہو جاتی ہے
دفعتاً فوقتاً مشین کی مرمت، اُس کی فرسودگی، اور دوسرے متعلقہ مصارف
کے لیے اگر روزانہ آٹھ آنے وضع کرلیے جائیں، تب بھی دوسرے درزی
روزانہ دو روپے مقابلتہً زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مزید آمدنی
محض مشین کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اب اگر کسی درزی کو مشین خریدنے
کے لیے روپیہ قرض لینا پڑے اور قرض دہندہ اپنی رقم پر روزانہ چار
بلکہ آٹھ آنے تک سود طلب کرے، تب بھی اس درزی کو روزانہ پونے دو
یا کم از کم ڈیڑھ روپیہ مقابلتہً زیادہ پیدا کرنے کی توقع رہتی ہے۔ جب ایک
معمولی ہاتھ سے چلنے والی مشین کی کارگزاری کا یہ حال ہے تو پھر برقی
بخار سے چلنے والی عظیم الشان مشینوں کی پیداآوری کا کیا ٹھکانا جو
وقت واحد میں کئی کئی ہزار گھوڑوں کی طاقت کے برابر کام کرتی ہیں
پس معلوم ہوا کہ لوگ جو اسقدر اشتیاق کے ساتھ کاروبار کے لیے روپیہ
قرض لینے کی خواہش کرتے ہیں اور اس کے عوض کثیر مقدار میں سود
ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اُس کا راز درحقیقت اصل
کی پیداآوری میں پوشیدہ ہے۔ قرض لی ہوئی رقم پر وہ جسقدر سود
ادا کرتے ہیں اس سے کئی گنی زیادہ آمدنی انھیں اپنے کاروبار سے
حاصل ہو جاتی ہے۔

سود کیوں ادا ہوتا ہے

انتظار + طلب اصل

مختصر یہ کہ اصل میں پیداآوری کی صفت موجود ہے جس کی وجہ سے لوگ اُسے طلب کرتے ہیں لیکن چونکہ اکثر وبیشتر اصل کی رسد انتظار کشی بغیر ممکن نہیں اس لیے اس پر سود ادا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اسی عنوان میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ بعض صورتوں میں اصل کی رسد انتظار کشی کا نتیجہ نہیں ہوتی مگر طلب کی زیادتی کی وجہ اُس پر بھی بازاری شرح کے مطابق سود وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض حالات میں اصل سے پیداآوری کی صفت مفقود ہو جاتی ہے لیکن تنگی قرض گیر سود ادا کرنے پر مجبور رہتا ہے۔ جو لوگ اپنے افلاس کی وجہ سے مجبوراً قرض لیتے ہیں یا جو امیرزادے محض تعیشات میں روپیہ اڑانے کے لیے قرض لیتے رہتے ہیں، وہ اس روپے سے کوئی مزید آمدنی پیدا نہیں کرتے اور اسی وجہ سے اُن کے حق میں سود کی ادائی نہایت گراں ثابت ہوتی ہے یہی وہ صورتیں ہیں جن کی بناء پر سود اخلاقاً و مذہباً ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے بیسیوں معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر چونکہ قرض دہندہ کی طرف سے انتظار کشی موجود ہے اس لیے وہ اپنے سود سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

سود کی قسمیں

سود کی قسمیں:- جو لوگ دوسروں کو رقمیں قرض دیتے ہیں، عام ازیں کہ وہ بڑے بڑے بنک ہوں یا کم حیثیت ساہوکار، انھیں اپنا کاروبار چلانے کے لیے بہت کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی رقمیں عارضی طور پر دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں بلکہ اپنے اپنے کاروبار

کی وسعت کے لحاظ سے مناسب موقعہ محل پر جہاں قرض لینے والے ان سے
بہ آسانی مل سکیں کوئی مکان تعمیر کرتے یا کرایے پر لیتے ہیں۔ معمولی کاروبار
تو خود دکان پر بیٹھتے اور اپنے گاہکوں سے معاملات طے کرتے ہیں لیکن
بنک اپنی اپنی ضروریات کے مطابق کئی کئی ملازم نوکر رکھتے اور انھیں
حسب مدارج تنخواہیں دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ حسابات لکھنے کے لیے
خاص قسم کے رجسٹر تیار کرنے پڑتے ہیں۔ گاہکوں کے زیور جو ضمانت میں
دیے جائیں اور خود اپنی رقوم بہ حفاظت رکھنے کے لیے مضبوط تجوریاں
بنوانی پڑتی ہیں۔ ظاہری آرائش اور ضروری فرنیچر پر بھی کافی روپیہ
خرچ کرنا پڑتا ہے۔ غرض ایک قرض کے لین دین کا کام چلانے کے لیے
بیسیوں قسم کے انتظامات کرنے پڑتے ہیں جن میں بہت کچھ مصارف
لاحق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مصارف کا بار خود بنک یا ساہوکار
برداشت نہیں کریگا بلکہ وہ اُن لوگوں پر ڈالا جائیگا جن کی خاطر
یہ سب اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرض گیرندہ سے جو سود لیا جاتا ہے وہ سب کا
سب استعمالِ اصل کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک جزو اِن تمام
انتظامات کے معاوضے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی جزو کو اصطلاح میں
مطالبات تنظیم کہا جاتا ہے۔

قرضے کے کاروبار کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ خرید و فروخت
کے معاملات کی طرح اُسی وقت ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک مدت تک جاری
رہتا ہے۔ قرض لینے والا یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ قرضے کی رقم ایک معینہ میعاد

کے بعد ادا کریگا۔ اب اگر یہ مدت ختم ہونے سے قبل قرض گیرندہ فوت ہو جائے
یا اُس کا دیوالہ نکل جائے، یا وہ بد دیانت ثابت ہو تو بہت ممکن ہے کہ
قرض دہندہ اپنی کل رقم یا اس کا کوئی جزو واپس نہ پا سکے۔ چنانچہ ایسی
مثالیں وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ضمانت کے ذریعے سے
حتی الوسع اس اندیشے کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم یہ ایک
یقینی امر ہے کہ قرضے کے ہر کاروبار میں رقم ڈوبنے کا خطرہ کم و بیش ضرور
لگا رہتا ہے اور ہر قرض دہندہ کو کبھی کبھی اس قسم کا نقصان برداشت
کرنا ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے قرض لینے
والوں کو اپنے اپنے ساکھ یا اعتبار کے مطابق کچھ کچھ رقم ادا کرنی پڑتی ہے
جو مطالبات تنظیم کی طرح سود کا ایک جزو قرار پاتی اور اصطلاح میں
مطالبات خطر کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

رقم ڈوبنے کے خطرے کا معاوضہ بطور ضمانت

پس معلوم ہوا کہ عام طور پر ہم جس چیز کو سود کہتے ہیں وہ صرف استعمال
اصل کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بالعموم دو چیزیں اور شامل ہوتی ہیں
جن کے اصطلاحی نام مطالبات خطر اور مطالبات تنظیم ہیں۔ چنانچہ اسی
بنا پر معاشیین نے سود کی دو قسمیں قرار دی ہیں: ایک **سود خالص**
جو محض استعمال اصل کا معاوضہ ہوتا ہے اور دوسرے **سود خام** جس میں
سود خالص کے علاوہ مطالبات تنظیم اور مطالبات خطر بھی شامل ہوتے ہیں

فرق

مطالبات تنظیم کا مدار کاروبار کی وسعت پر ہوتا ہے۔ جس طرح پیدائش
بہ پیمانہ کبیر میں مصارف پیدائش کا اوسط فی شے کم ہوتا ہے، اس طرح

قرضے کے کاروبار کی بھی حالت ہے۔ جسقدر بڑے پیمانہ پر کاروبار کیا جائیگا اُسی قدر گو مجموعی مصارف پیدائش بہت زیادہ نظر آئیں، تاہم فرداً فرداً ہر معاملے کے مصارف انتظام بہت کم ہوں گے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے کم حیثیت ساہوکار بہ مقابل بڑے بڑے بنکوں کے زیادہ سود وصول کرتے ہیں۔ رہے مطالبات خطر سو اُن کی مقدار ہر ہر قرض گیرندہ کے لیے مختلف اور خاصکر تین چیزوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ایک کاروبار کی حالت، دوسرے قرض گیر کا ساکھ، تیسرے ضمانت کی نوعیت، بعض کاروبار کی کامیابی کم و بیش یقینی ہوتی ہے تو بعض میں نقصان کا احتمال مقابلۃً زیادہ رہتا ہے۔ بعض قرض لینے والے دیانتدار اور قابل اعتبار ہوتے ہیں تو بعض بددیانت اور ناقابل اعتبار، بعض لوگ زمین، مکان، زیور، یا قسم قسم کے تمسکات ضمانت میں مہیا کرسکتے ہیں تو بعض اس طرح کی کوئی ضمانت پیش نہیں کرسکتے غرض ان اختلافات کی وجہ سے رقم واپس نہ ملنے کا خطرہ بھی مختلف صورتوں میں یکساں نہیں بلکہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے اور اسی کمی بیشی کے مطابق مطالبات خطر کی مقدار بھی گھٹتی بڑھتی ہے۔

نوٹ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بطور قرض سرمایہ کا لین دین اور اشیار کی خرید و فروخت، یہ دونوں کاروبار اپنی اصلیت میں ایک دوسرے سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ فرق ہے تو صرف اسقدر کہ جونہی قیمت ادا ہوگئی، خرید و فروخت کا معاملہ بالکل ختم ہوجاتا ہے

لیکن قرضے کا معاملہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ رقم قرضہ حسب معاہدہ مع سود واپس نہ کر دی جائے۔ اگر اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر قیمت اور سود میں کوئی بنیادی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ قیمت وہ معاوضہ ہے جو کسی چیز کے بدلے میں خریدار فروشندے کو ادا کرتا ہے۔ اور سود وہ معاوضہ ہے جو سرمایہ استعمال کرنے کے بدلے میں قرض گیر زرِ دہندہ کو ادا کرتا ہے۔ لیکن باوجود اس قریبی مشابہت کے ہمیں سود اور قیمت میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے جس کی اصلیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قیمت کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وقتِ واحد میں ایک بازار کے اندر ایک ہی قسم کی چیزیں مختلف قیمتوں پر فروخت نہیں ہو سکتیں۔ مساواتِ قیمت معاشی بازار کا لازمی خاصہ ہے۔ لیکن سود کی حالت بالکل اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ وقتِ واحد میں زر کے ایک ہی بازار کے اندر مختلف اشخاص قرض لیتے ہیں لیکن کسی کو صرف تین فی صدی سود پر رقم مل جاتی ہے تو کوئی پانچ، چھ بلکہ سات فیصد سود ادا کرتا ہے اور کسی کو دس پندرہ فیصد ادا کرنے پر بھی قرض نہیں ملتا۔ بازار تو بازار صرف کسی ایک ساہوکار کے بہی کھاتوں پر نظر ڈالیے، اُن میں بھی شرحِ سود کے عجیب عجیب اختلافات نظر آتے ہیں۔ جب سود دراصل سرمایہ استعمال کرنے کی قیمت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ دوسری اشیاء کی قیمتوں کی طرح وقتِ واحد میں ایک بازار کے

قیمت اور سود

فرق

ایک بازار میں ایک قیمت

لیکن سود کا مختلف بازار

اندر ایک نہ ہو۔ اس سوال کا جواب بآسانی سمجھ میں آجائیگا اگر ہم سود خالص اور سود خام کا مذکورہ بالا فرق اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ عام طور پر سود کی جو شرحیں بیان کی جاتیں یا اخباروں میں درج ہوتی ہیں، وہ سود خالص کی نہیں بلکہ سود خام کی شرحیں ہوتی ہیں اور سود خام چونکہ مطالبات تنظیم و مطالبات خطر جیسے متغیر ہونے والے اجزا کا مجموعہ ہے اس لیے سود خام کی شرحیں بھی مختلف اشخاص کے لیے مختلف ہوتی ہیں۔ جہاں تک محض سرمایہ استعمال کرنے کے معاوضے یعنی سود خالص کا تعلق ہے، اُس کی شرح البتہ وقت واحد میں ایک بازار کے اندر ایک ہی ہوتی ہے۔

شرح سود

شرح سود۔ سود کیا ہے؟ دوسرے کا سرمایہ استعمال کرنے کی قیمت۔ لہٰذا جس طرح اور اشیا کی قیمتیں طلب و رسد کے حالات سے متاثر ہوتی ہیں اسی طرح سرمایہ استعمال کرنے کی قیمت یعنی سود بھی سرمایے کی طلب و رسد کے زیر اثر معین ہوتا ہے۔ اگر کسی بازار میں کسی وقت سرمایے کی مقدار زیادہ ہو جو بہ طور قرض حاصل کیا جا سکے لیکن قرض لینے والے بہت کم تو ظاہر ہے کہ سود کی شرح بہت گر جائے گی۔ ہر ایک سرمایہ دار کی یہ کوشش ہوگی کہ کسی طرح اس کی رقم قرض پر نکل جائے خواہ اسے سود بمقابل پیشتر کے کم ملے۔ اگر وہ زیادہ سود کی امید پر اپنی رقم روک رکھیگا تو اندیشہ ہے کہ کوئی اس سے قرض نہ لے اور جو تھوڑا بہت سود مل سکتا تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل جایے۔ اس کے

برعکس اگر سرمایہ کی مقدار تو بہت کم لیکن قرضوں کے خواہشمندوں کی تعداد بہت زیادہ، تو شرح سود کا بہت اعلیٰ ہو جانا بالکل بدیہی ہے اب ہر قرض لینے والے کی یہ کوشش ہو گی کہ اُسے اپنی مطلوبہ رقم کسی نہ کسی شرح ضرور مل جائے خواہ اُسے بمقابل پیشتر کے کچھ زیادہ سود ادا کرنا پڑے۔ اگر وہ ادنیٰ شرح کی امید پر قرض لینے میں تساہل کرے گا تو تھوڑی دیر میں سارا سرمایہ نکل جائے گا اور اُسے اپنے کاروبار کے لیے رقم نہ مل سکے گی۔

پس معلوم ہوا کہ شرح سود کا مدار سراسر اصل کی طلب و رسد پر ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ خود اصل کی طلب و رسد کن خاص حالات کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہم ابھی سود کی ماہیت کے عنوان میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ اصل کی طلب کا باعث اُس کی پیدا آوری کا خاصہ ہے جو لوگ پیدائش دولت میں اصل سے کام لیتے ہیں، وہ اُس کے ذریعہ سے کثیر مقدار میں مزید دولت پیدا کرتے ہیں جس کا ایک جزو وہ بطور سود کے اصلدار کو ادا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اصل کی طلب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک میں اس سے کام لینے کے مواقع بہ کثرت موجود ہوں۔ جسقدر کسی ملک میں اس قسم کے زیادہ مواقع موجود ہوں گے، اُسی قدر اصل کی طلب میں بھی اضافہ ہوگا۔ جو قومیں اپنے معاشی وسائل ضائع نہیں ہونے دیتیں وہ اپنے اپنے علاقوں میں زراعت، صنعت، تجارت، باربرداری، غرض ہر قسم کے ذرائع معاش کو ترقی

اصل کی طلب کا مدار پیدائش دولت کے ذرائع

دینے اور اُن سے کماحقہٗ فایدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے ممالک میں کاروبار نہایت درجے فروغ پاتا ہے، ہر طرف لوگ پیدایش دولت کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں، شغلی عمل کے نئے نئے راستے کھلتے جاتے ہیں، اور عمل کی طلب میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جن ممالک میں پیدایش دولت کے مختلف کاروبار ادنیٰ حالت میں رہتے ہیں اور معاشی وسائل سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی وہاں نہ عمل سے کام لینے کی زیادہ گنجایش ہوتی ہے اور نہ لوگوں کو عمل حاصل کرنے کی چنداں جستجو۔

جس طرح عمل کی طلب کے لیے خاص حالات کا موجود ہونا ضروری ہے اُسی طرح عمل کی رسد بھی چند خاص شرایط کی پابند ہے جن کی مفصل کیفیت ہم پیدایش دولت کے تحت "اجتماع عمل کے ذرایع" کے عنوان میں معلوم کر چکے ہیں۔ لہذا دوبارہ انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اسقدر جان لینا کافی ہے کہ شرح مزد عمل کی طلب و رسد کے باہمی عمل سے مقرر ہوتی ہے۔ کسی ملک میں عمل کی طلب وہاں کی زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، اور عام کاروباری حالت پر منحصر ہے اور اُس کی رسد امن و امان، عام بیداری اور معاشی ترقیات جیسے اسباب کے ساتھ وابستہ ہے۔

لوٹ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آجکل دنیا میں دو متضاد

اگر عمل ... انحصار ... امن و امان، ... ذرایع ... تعلیم و ترغیب

قسم کے اسباب شرح سود پر اپنا اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ ایک طرف
تقسیم عمل کی انتہائی ترقی، مشین کا روز افزوں استعمال نئی نئی عجیب
وغریب ایجادات، وسائل آمد و رفت کی غیر معمولی سہولت و ارزانی،
وسائل قدرت پر انسان کا روز افزوں تصرف، یہ اور اسی قسم کے
دوسرے متعدد اسباب شغل اصل کی گنجائش کو برابر بڑھاتے جا رہے ہیں
جس کی وجہ سے ہر طرف لوگ اصل کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ان حالات کا
لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اصلدار اپنے اصل کا خوب بڑھا کر
معاوضہ طلب کرتے اور عام طور پر سود کی شرح بہت اعلیٰ ہو جاتی۔
لیکن واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ چند سال سے شرح سود بجائے اعلیٰ ہونے
کے اور گرتی جا رہی ہے۔ زیادہ معاوضہ طلب کرنا تو کجا اصلدار خود
اس بات کے لیے بے چین نظر آتے ہیں کہ کسی طرح اُن کا سرمایہ
قرض پر نکل جائے یا کسی نہ کسی کاروبار میں لگ جائے تاکہ بجائے
بیکار پڑا رہنے کے اُس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ملتا رہے۔ یہ صورت حال جو
بظاہر ناقابل توجیہ معلوم ہوتی ہے درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا
کہ گذشتہ چند سال کے اندر اضافۂ اصل کے اسباب کا عمل بھی انتہا
درجے قوی رہا ہے۔ باشندگان یورپ و امریکہ کی عام بیداری اُن
کی حیرت انگیز معاشی ترقیاں اور ان کی غیر معمولی خوشحالی نے گذشتہ
سال کے اندر انھیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ بلا کسی تکلیف کے اپنی آمدنی کا
ایک کثیر حصہ بچا سکتے اور بچاتے ہیں لھذا وہ ہر وقت اس بات کے لیے

کوشاں رہتے ہیں کہ اُن کا سرمایہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہے تاکہ انھیں اُس سے کچھ آمدنی حاصل ہوتی رہے۔ پسماندہ ممالک میں جہاں معاشی ترقی کا ابھی آغاز ہوا ہو، شغل اصل کی بہت زیادہ گنجایش ہوتی ہے لهذا یورپ کے سرمایہ دار ہمیشہ اِس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ایسے ممالک میں انہیں اپنا سرمایہ لگانے کے مواقع حاصل ہوں۔ اسی کوشش میں وہ اپنی اپنی حکومتوں کے ذریعے سے پسماندہ ممالک پر تسلط حاصل کرتے ہیں اور اگر پہلے سے تسلط حاصل ہو تو اس کو ہمیشہ قایم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے مختلف ممالک میں آجکل جو اسباب جنگ و جدال کا باعث ہوتے ہیں اُن میں شغل اصل کے مواقع کا حاصل کرنا بھی ایک نہایت اہم سبب ہے۔

مختصر یہ کہ آج کل اگر طلب اصل کے اسباب نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں تو دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ اصل کی رسد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ گزشتہ چند سال سے شرح سود برابر تخفیف کی طرف مائل ہے۔

شرح سود کی اس متواتر تخفیف کو دیکھ کر بعض ماہرین نے ایک بہت ہی دلچسپ دعوی کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ایک وقت ایسا آئیگا جب کہ اصل کی رسد اُس کی طلب سے بڑھ جائے گی اور سود بالکل ناپید ہو جائے گا۔ جب مشرقی ممالک بھی ترقی کرتے کرتے

یورپ و امریکہ کی حالت پر پہنچ جائیں گے تو پھر اصلداروں کی تعداد اور ان کے اندوختوں کی مقدار تو بہت بڑھ جائے گی لیکن اصل سے کام لینے کے مواقع نسبتاً گھٹ جائیں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سود گھٹتے گھٹتے بالکل ناپید ہو جائے گا۔

اس خیال کے مخالفین کا یہ دعویٰ ہے کہ ایسی صورت حال کبھی پیدا نہ ہوگی۔ انسان کی قوت ایجاد اور قدرتی وسائل پر اس کے تصرف کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ مشرقی ممالک میں اشاعت تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سی قابلیتیں جو اب تک بیکار ضایع ہوتی تھیں وہ بھی کام کرنے لگیں گی اور ان کی مدد سے قدرت پر انسان کا تصرف اور بھی بڑھ جائیگا اور برابر بڑھتا رہیگا۔ مزید براں مشرقی اقوام کا معیار زندگی بلند ہونے سے مختلف اشیا کی طلب میں غیر معمولی اضافہ ہونا لازمی ہے لہذا اشتغال اصل کے مواقع پر عملاً کوئی حد عاید نہیں کی جاسکتی۔

آیندہ کیا صورت پیش آنے والی ہے اس کا صحیح علم تو سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ البتہ واقعات گذشتہ اور حالات حاضرہ کو پیش نظر رکھتے ہوے ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آیندہ سالہا سال تک سود کا لین دین جاری رہے گا۔

قیمتوں کے تغیرات اور قرضے کا کاروبار

قیمتوں کے تغیرات اور قرضے کا کاروبار۔

ایک بدیہی واقعہ ہے کہ گوناگوں اسباب کی وجہ سے اشیا کی قیمتوں میں ہمیشہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ہر زمانے میں بعض چیزوں کی قیمتیں بڑھ

جاتی ہیں تو بعض کی گھٹ جاتی ہیں اور بعض کی قریب قریب ایک حالت پر رہتی ہیں۔ یہ دریافت کرنا کہ آیا بہ حیثیت مجموعی اشیا کی قیمتیں مقابل سابق کے گھٹ گئی ہیں یا بڑھ گئی ہیں، ایک نہایت دشوار کام ہے جس کا تعلق فن اعداد و شمار سے ہے۔ اعداد و شمار کے ماہر انڈکس نمبر کے ذریعے سے عام قیمتوں کی کمی بیشی کے متعلق قریب قریب صحیح نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ ان امور پر ہم آیندہ مبادلہ دولت کے باب میں حسب گنجایش روشنی ڈالیں گے۔ یہاں صرف یہ دریافت کرنا مقصود ہے کہ عام طور پر اشیا کی قیمتیں جو وقتاً فوقتاً گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں، اُس کا قرضے کے کاروبار پر کیا اثر پڑتا ہے۔

پہلے ہم قیمت کی کمی بیشی کا مفہوم ایک خاص سکے یعنی روپے کی مثال لیکر واضح کریں گے۔ فرض کرو کہ کل تک گیہوں روپیہ کو آٹھ سیر مل رہے تھے۔ آج وہ روپیہ کو صرف چار سیر ملتے ہیں۔ اس واقعے کو ہم دو طرح پر بیان کر سکتے ہیں: ایک یہ کہ گیہوں پچاس فیصدی گراں ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گیہوں کی نسبت سے روپیہ کی قدر پچاس فیصدی گھٹ گئی ہے۔ گویا جو روپیہ کل تک آٹھ سیر گیہوں خرید سکتا تھا، آج وہ صرف چار سیر خرید کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آج گیہوں سولہ سیر بکنے لگیں تو کہا جائے گا کہ گیہوں پچاس فیصدی ارزاں ہو گئے ہیں یا روپیہ کی قدر گیہوں کے حساب سے پچاس فیصدی بڑھ گئی ہے۔ گویا کل کے مقابل آج کا روپیہ کم از کم گیہوں کی

حد تک نئی گنی قدر رکھتا ہے۔

اب اگر بہ حیثیت مجموعی اشیا کی قیمتیں پہلے سے بڑھ جائیں تو یہ صورت گویا اس بات کے مرادف ہے کہ روپیہ کی قدر میں تخفیف ہوگئی ہے اس کے برعکس قیمتوں کی تخفیف روپیہ کی قدر میں اضافے کے مرادف ہے فرض کرو کہ زید ایکہزار روپے پانچ فیصدی سود پر دو سال کے لیے بکر سے قرض لیتا ہے قبل اس کے بکر کو اپنی رقم مع سود کے واپس ملے عام طور پر اشیاء کی قیمتیں ۲۰ فیصدی چڑھ جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بکر کو جو روپیہ واپس ملے گا وہ بہ لحاظ اپنی قدر کے اس روپیہ سے ۲۰ فیصدی گھٹا ہوا ہوگا جو اس نے دو سال قبل زید کو قرض دیا تھا۔ کیونکہ یہی روپیہ دو سال قبل جس قدر مال خرید سکتا تھا، اب اس سے ۲۰ فیصدی کم مال خرید کر سکتا ہے گویا اُس وقت اسی روپیوں سے جو مال خریدا جاسکتا تھا وہ آج سو روپیوں سے کم میں نہیں مل سکتا۔ بہ ظاہر تو زید وہی ایک ہزار روپے ادا ان کا تھوڑا سود ادا کریگا لیکن اشیاء کی ۲۰ فیصدی گرانی اور روپیہ کی قدر میں اتنی ہی تخفیف ہو جانے سے یہ ہزار روپے درحقیقت دو سال پہلے کے آٹھ سو روپیوں کے برابر ہیں جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ اب ان ہزار روپیوں سے صرف اسقدر مال ملے گا جسقدر کہ دو سال قبل آٹھ سو روپیوں سے ملتا تھا۔

اس کے برعکس اگر اشیاء کی قیمتیں ان دو سال کے اندر ۲۰

فیصدی گر جائیں تو یہ صورت بکر کے لیے مفید اور زید کے حق میں مضر ہو گی۔ روپے کی قدر میں ۲۰ فیصدی اضافہ ہو جانے سے اس وقت کے سو روپے دو سال پہلے کے ایک سو بیس روپیوں کے مساوی ہوں گے۔ بہ الفاظ دیگر جس قدر مال دو سال پہلے ایک سو بیس روپیوں میں ملتا تھا، وہ آج صرف ایک سو روپیوں میں دستیاب ہو گا۔ بہ ظاہر تو بکر کو وہی ایک ہزار روپے مع مقررہ سود کے واپس ملیں گے لیکن درحقیقتہً دو سال پہلے کے بارہ سو روپیوں کے مساوی ہوں گے۔

مختصر یہ کہ قیمتوں کے تغیرات کا قرض لینے اور دینے والوں پر خاص اثر پڑتا ہے۔ گرانی اشیاء قرض گیر کے حق میں مفید اور قرض دہندہ کے حق میں مضر ہوتی ہے اور ارزانی اشیاء کا اثر اس کے برعکس ہوتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے بعد یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ عملی طور پر قرضے کے کاروبار میں قیمت کے ان تغیرات کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ قرضے کے لین دین میں دونوں فریق اس بارے میں بالکل مطمئن رہتے ہیں کہ روپے کی قدر میں کوئی قابل لحاظ تغیر واقع نہ ہو گا۔ اور ہوتا بھی دراصل یہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تغیرات تو ہمیشہ جاری رہتے ہیں لیکن ایسی عظیم الشان تبدیلیاں کہ جن کا نمایاں اثر قرضے کے لین دین پر پڑے، سالہا سال میں نمودار ہوتی ہیں اور بالعموم اس طور پر نمودار ہوتی ہیں کہ عوام اسے مشکل ہی سے

مطالبات فرسودگی

محسوس کر سکتے ہیں۔

مطالبات فرسودگی۔ ہم اس سے قبل یہ معلوم کر چکے ہیں کہ بلحاظ استعمال اصل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اصل دایر جو عمل پیدائش میں صرف ایک ہی مرتبہ استعمال ہو کر اپنا کام ختم کر دیتا ہے جیسے روئی، کوئلہ یا کوئی اور خام پیداوار۔ دوسرے اصل قایم جو ایک مرتبہ سے زاید استعمال میں آتا ہے جیسے مشین، مکان، آلات و اوزار وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں پیدائش دولت کا کوئی کاروبار چل نہیں سکتا جب تک کہ اس میں دونوں قسم کے اصل سے کم و بیش کام نہ لیا جائے۔ اصل قایم جب ایک مرتبہ فراہم کر لیا جاتا ہے تو پھر ایک مدت تک اسے بدلنے کی ضرورت بالعموم پیش نہیں آتی۔ لیکن اصل دایر جیسے جیسے خرچ ہوتا ہے اس کی نئی نئی مقداریں مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً کسی پارچہ بافی کے کارخانے میں روئی، کوئلہ، مزدوروں کی اجرت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں تو ہر وقت خرچ ہوتی نظر آتی ہیں لیکن کارخانے کی عمارت، کپڑا بننے کی مشینیں اور دوسرے آلات و اوزار ان میں کسی قسم کی تخفیف دکھائی نہیں دیتی۔ مثلاً ململ کے سو تھان تیار کرنے کے بعد یہ تو بہ آسانی بتایا جا سکتا ہے کہ ان میں کسقدر روئی یا دھاگا کا خرچ ہوا ہے، کتنا کوئلہ کام میں آیا ہے، اور کتنی اجرت ادا کرنی پڑی ہے۔ چنانچہ مصارف پیدائش میں ان سب چیزوں کا شمار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ پتا لگانا کہ سو تھان ململ تیار کرنے میں

کوئی مشین کس قدر خرچ ہوی ہے یا مختلف آلات واوزار کسقدر گھٹ گئے ہیں ایک انتہادرجے مشکل کام ہے۔ ہزاروں تھان تیار کرڈالیے پھربھی مشینوں اور آلات واوزار میں بظاہر کوئی فرق نظرنہیں آتا ایسی صورت میں کیا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ململ کے تھان تیار کرنے میں روئی، کوئلہ اور دوسری خام پیداواریں تو خرچ ہوتی ہیں لیکن مشینیں اور آلات واوزار صرف نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ واقعات کے مطابق نہیں ہے۔ ململ کی تیاری میں جس طرح روئی یا دھاگا خرچ ہوتا ہے ٹھیک اُسی طرح کپڑا بننے کی مشین بھی خرچ ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ہم خرچ شدہ روئی اور دھاگے کی مقدار تو معلوم کرسکتے ہیں لیکن مشین کے متعلق ایسی کوئی بات معلوم نہیں کرسکتے۔ البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ پانچ سات سال کام دینے کے بعد مشین ازکاررفتہ ہوجائے گی اور اسوقت کاروبار جاری رکھنے کے لیے نئی مشین خریدنا اُسی طرح ضروری ہوگا جس طرح کہ وقتاً فوقتاً نئی روئی یا نیا دھاگا خریدنا پڑتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم روئی یا دھاگے کا خرچ ہونا تو تسلیم کریں اور مشین یا آلات واوزار کے صرف ہونے میں شبہہ کریں۔

پس معلوم ہوا کہ مختلف اشیا کی تیاری میں اصل قایم بھی اصل دایر کی طرح خرچ ہوتا رہتا ہے اور ان کے مصارف پیدایش میں جس طرح اصل دایر کی قیمت کا شمار کیا جاتا ہے، اُسی طرح اصل قایم کا معاوضہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اور اسی معاوضے کو اصطلاح میں

مطالبات فرسودگی کہتے ہیں۔ جب کبھی کوئی کارخانہ دار اپنے کاروبار کے مصارف کا حساب کرتا ہے تو وہ کچھ رقم اصل قائم کے مطالبات فرسودگی کے نام سے علیحدہ کر دیتا ہے اور جو مشینیں یا آلات و اوزار فرسودہ ہوتے ہوئے ازکاررفتہ ہو جاتے ہیں ان کی جگہ دوسری مشینیں یا دوسرے آلات و اوزار اسی رقم سے خرید لیے جاتے ہیں۔

منافع

تنظیم کی اہمیت

تنظیم کی اہمیت۔ پیدائش دولت کے طریقوں میں جو عظیم الشان تبدیلیاں گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر واقع ہوئی ہیں اُن کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مختلف عاملین پیدائش جداگانہ گروہوں کے ہاتھوں میں محدود ہو گئے ہیں۔ قدیم طریق پیدائش کے تحت جملہ عاملین پیدائش ایک ہی شخص کی ذات میں جمع رہتے تھے دستکاروں کی حیثیت محض اجرت پانے والے مزدوروں کی نہیں تھی بلکہ وہ خود ہی حسب ضرورت آلات واوزار اور خام پیداوار مہیا کر کے اپنے اپنے گھروں پر چیزیں تیار کرتے اور خود ہی انھیں خریداروں کے ہاتھ فروخت بھی کرتے تھے۔ کاروبار چونکہ چھوٹے پیمانے پر چلتے تھے اس لیے یہ طریقہ بآسانی کام دیتا تھا۔ لیکن جب سے پیدائش بہ پیمانۂ کبیر کا طریقہ چل نکلا ہے، مختلف عاملین پیدائش جدا جدا گروہوں کی ملک ہو گئے ہیں۔ زمینداروں کا طبقہ تو عرصے سے موجود ہی ہے اب اُن کے علاوہ ایک طبقہ اصلداروں کا نکل آیا ہے جو سرمایے کے مالک ہوتے ہیں اور دوسرا طبقہ مزدوروں کا ہے جن کے پاس نہ زمین ہوتی ہے اور نہ سرمایہ بلکہ صرف خدا کے دیے ہوئے ہاتھ پاؤں ہیں جن سے محنت

کریں اور روٹی کمائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک میں بکثرت
ایسے اشخاص موجود ہیں جو نہ صرف زمین کے مالک ہوتے ہیں بلکہ جو
اچھا خاصہ سرمایہ بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ہی محنت کرکے بھی آمدنی پیدا
کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی باوجود اس ظاہری اجتماع کے اپنی
تینوں حیثیتوں کو بالکل ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتے ہیں زمینداروں
کی حیثیت سے وہ لگان وصول کرتے ہیں اصلداروں کی حیثیت سے
سود کے مستحق سمجھے جاتے ہیں اور مزدوروں کی حیثیت سے اجرتیں
پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک دستکار جو معمولی آلات و اوزار لیکر اپنے
گھر پر کام کرتا ہے اور چیزیں تیار کرکے خریداروں کے ہاتھ فروخت
کرتا ہے، وہ اپنی آمدنی کی تقسیم ان مختلف حیثیتوں سے نہیں کرتا۔

مختصر یہ کہ جدید معاشی نظام کی بدولت مختلف عاملین پیدائش
میں نمایاں تفریق نمودار ہوگئی ہے اور وہ مختلف گروہوں کی ملک
تصور کیے جاتے ہیں۔ اس تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک چوتھے عامل
پیدائش یعنی تنظیم کی ضرورت روزافزوں محسوس ہونے لگی۔ زمین
محنت، اصل خواہ کتنی ہی افراط سے موجود ہوں جب تک کہ ان تینوں
عاملین کو اُن کے مالکوں سے حاصل کرکے ایک جگہ جمع نہ کیا جائے اور
اُن سے خاص خاص اصولوں کے مطابق کام نہ لیا جائے، دولت
پیدا نہیں ہوسکتی۔ معاشیات میں تنظیم کی قابلیت بہم پہنچانے والوں کو
آجر اور اُس کے معاوضے کو منافع کہا جاتا ہے۔

منافع کی ماہیت

منافع کی ماہیت۔ اگر کسی شخص کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہو تو وہ اس سے دو طرح پر کام لے سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ کچھ مدت کے لیے اپنا سرمایہ دوسروں کو قرض دیدے اور خود گھر بیٹھے اطمینان سے سود حاصل کیا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس سرمایے سے خود ہی کوئی کاروبار جاری کرے اور اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنائے۔ فرض کرو کہ اسے دونوں صورتوں میں ایک ہی شرح سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ حصول آمدنی کی کون سی ترکیب زیادہ پسند کرے گا۔ ظاہر ہے کہ حالات مفروضہ میں ہر شخص بجائے خود کاروبار کرنے کے دوسروں کو قرض دیکر آمدنی حاصل کرنا زیادہ پسند کریگا۔ جب دونوں صورتوں میں معاوضہ برابر ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ کوئی شخص قرضہ دیکر سود حاصل کرنے کا سیدھا سادھا اور اطمینان بخش طریقہ چھوڑ کر خود کاروبار کے جنجال میں پھنسے اور کہیں اتفاق سے نقصان ہو تو اپنا سرمایہ بھی کھو بیٹھے۔ ہاں اگر خود کاروبار کرنے سے کچھ زیادہ معاوضہ ملنے کی توقع ہو تو ممکن ہے کہ حوصلہ مند اشخاص زیادہ آمدنی کے لالچ سے اپنے اپنے طور پر کاروبار جاری کریں۔ اسی طرح اگر کسی شخص میں تنظیم کی قابلیت موجود ہے تو وہ بھی یا تو خود کاروبار جاری کرکے اپنی قابلیت سے کام لے سکتا ہے یا کسی دوسرے شخص کے کارخانے میں بہ حیثیت مینجر کے ملازمت کرسکتا ہے۔ پہلی صورت میں کاروبار کی کامیابی اور ناکامی کی ساری ذمہ داری

اسی پر ہو گی اور دوسری صورت میں صرف چند مفوضہ فرائض اُن کے ذمے ہوں گے۔ کاروبار کی کامیابی و ناکامی سے وہ براہ راست چنداں متاثر نہ ہوگا۔ اب اگر متوقعہ آمدنی ان دونوں صورتوں میں بھی برابر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ خود کاروبار جاری کرنے سے دوسرے کے یا منیجر بننے کو ترجیح دیگا۔

پس معلوم ہوا کہ کوئی شخص بجائے دوسروں کو سرمایہ قرض دینے کے اُسے بہ طور خود کاروبار میں لگانا اور بجائے تنخواہ دار منیجر بننے کے خود آجر بننا صرف اُس وقت پسند کریگا جب کہ ایسا کرنے سے اسے نسبتاً زیادہ آمدنی کی توقع ہو۔ یہی زیادہ آمدنی درحقیقت منافع خالص ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ زیادہ آمدنی پیدا کیسے ہوتی ہے، اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ آجر کے حسنِ انتظام کا نتیجہ ہے۔ تقسیم عمل اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے طریقوں پر عامل ہوکر، سائنس کے انکشافات اور نئی نئی ایجادات سے کام لیکر وہ اپنے ذرائع پیدائش کو اس طور پر کام میں لاتا ہے کہ ان سے کثیر دولت پیدا ہو سکے۔ اگر آجر کا انتظام اور اُس کی دیکھ بھال شامل نہ ہو تو منافع حاصل ہونا تو ایک طرف، خود مزدوروں کو اتنی اجرت اور اصلداروں کو اتنا سود نہ مل سکے جتنا کہ اس خاص تنظیم بدولت کثرت پیدائش کی وجہ سے دستیاب ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم کسی فرضی کارخانے کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا حساب

درج کرتے ہیں جس سے منافع کا مفہوم سمجھنے میں بہت سہولت ہوگی اور منافع خام اور منافع خالص کا فرق بھی اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا :-

قیمت پیداوار		۵۰۰۰۰
اشیائے خام کی قیمت	۱۴۰۰۰	
اصل مستعار کا سود	۵۰۰	
دوسرے کی زمین کا کرایہ	۱۰۰۰	
مزدوروں کی اجرت	۲۰۰۰۰	
جو رقمیں حسب تفصیل بالا دوسروں کو ادا کی گئی		۴۰۰۰۰
منافع خام		۱۰۰۰۰
اجرت تنظیم	۴۰۰۰	
ذاتی اصل کا سود	۲۰۰۰	
ذاتی زمین کا کرایہ	۵۰۰	
اصل قایم کے مطالبات فرسودگی و خطر	۱۵۰۰	
جو رقمیں حسب تفصیل بالا اپنی جیب میں رہیں		۸۰۰۰
منافع خالص۔		۲۰۰۰

نوٹ :۔ واضح رہے کہ ہر کارخانے میں مصارفِ پیدائش کی مندرجہ بالا تمام مدون کا موجود ہونا لازمی نہیں ہے ۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ کسی کارخانے میں اصل و زمین کا کوئی جزو مستعار نہو

ایسی حالت میں صرف اشیائے خام کی قیمت اور مزدوروں کی اجرت قیمت پیداوار سے مہیا کرنے کے بعد جو بچ رہے، وہ منافع خام ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کل اصل و زمین مستعار ہو تو منافع خام سے صرف اجرت تنظیم اور مطالبات فرسودگی و خطر مہیا کرنے کے بعد جو بچ رہے وہ منافع خالص ہوگا۔

نوٹ :- مندرجۂ بالا مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ آجر کو منافع خالص ہر حالت میں ملنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے طلب کم ہو جائے اور قیمت پیداوار بجائے پچاس ہزار کے صرف اڑتالیس ہزار وصول ہو تو منافع خالص بالکل غائب ہو جائیگا اور آجر کو صرف منافع خام پر اکتفا کرنا پڑیگا۔ بسا اوقات مختلف کارخانوں میں سخت مقابلہ آپڑتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو شکست دینے کی غرض سے اپنے مال کی قیمت بہت گھٹا دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں آجروں کو منافع خام بھی پورا پورا وصول نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حالت زیادہ مدت تک قایم نہیں رہ سکتی۔ مقابل حریفوں میں سے چند تو شکست کھاکر ختم ہو جائیں گے اور جو فتحیاب ہوں گے وہ اپنے پچھلے نقصانات کی تلافی کی فکر کریں گے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جسقدر کسی کارخانے کے خام منافع کی مقدار زیادہ ہوگی، وہ اپنے مال کی قیمت میں نسبتاً زیادہ تخفیف کرسکیگا اور اس وجہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے حریفوں کا مقابلہ کرسکے گا۔ اس کے برعکس

جہاں منافع خام کی مقدار کم یا بالفاظ دیگر دوسروں کو ادا ہونے والی رقوم کی مقدار زیادہ ہوگی، وہاں نہ تخفیف قیمت کی زیادہ گنجائش ہوگی اور نہ اس وجہ سے مقابلے کی زیادہ قوت ۔ منافع خام کو اسی بنا پر مقابلے کا آلہ کہا جاتا ہے ۔

مختصر یہ کہ اگر کوئی کاروبار صرف کسی ایک کارخانے کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور دوسروں کو اس قسم کا کاروبار کرنے کی اجازت نہ ہو یا صرف چند کارخانوں کو اس کی اجازت ہو اور وہ آپس میں متحد ہو کر اپنے منشار کے مطابق قیمتیں معین کر سکیں، بہ الفاظ دیگر اگر کارخانے کو کسی نہ کسی قسم کا اجارہ حاصل ہو تو منافع خالص کا ملنا کم و بیش یقینی ہے ۔ لیکن اگر کاروبار مسابقت کی حالت میں چل رہا ہو تو منافع خالص کم ہوتے ہوتے اگر بالکل غائب ہو جائے تو عجب نہیں ۔

مبادلہ کی

مبادلہ کی ضرورت ۔ معاشیات کے مباحث کی تقسیم کے
عنوان میں ہم مبادلۂ دولت کی ضرورت کی طرف مختصراً اشارہ کر چکے
ہیں۔ یہاں اسقدر اور بیان لینا کافی ہے کہ وجود انسانی کے ابتدائی
مدارج میں نہ مبادلۂ دولت کی کوئی ضرورت تھی اور نہ اس کے مسائل
کے پیدا ہونے کا کوئی امکان۔ لوگوں کا طرز زندگی ہی کچھ ایسا تھا کہ
وہاں تبادلہ اشیا یا خرید و فروخت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ انسانی
جماعتیں چھوٹے چھوٹے منتشر دیہات میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ ہر
خاندان اپنے افراد کی جملہ ضروریات کا خود کفیل تھا۔ احتیاجات بالکل
گنی چنی اور انھیں پورا کرنے کے ذرایع نہایت محدود تھے۔ جب
ہر شخص یا ہر خاندان اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود ہی مہیا کر لیتا تھا تو
ظاہر ہے کہ پھر چیزوں کے باہمی مبادلے کا کوئی موقع نہ تھا۔ لیکن
جب انسان نے اس ابتدائی حالت سے آگے قدم بڑھایا اور بتدریج

تقسیم عمل کا رواج شروع ہوا تو ساتھ ہی مبادلۂ دولت کا وجود میں آنا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ تقسیم عمل کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر شخص بجائے ہر کام کرنے کے صرف ایک یا چند کام اپنے اپنے ذمے لے لے۔ مثلاً کسی گاؤں میں بجائے اس کے ہر خاندان زراعت بھی کرے، کپڑا بھی بنے، برتن بھی بنائے اور مکانات بھی تعمیر کرے، مناسب یہ ہے کہ کچھ لوگ کپڑا بننے کے لیے مخصوص ہو جائیں، کچھ برتن بنانے کے لیے، کچھ مکانات تعمیر کرنے کے لیے اور کچھ اسی قسم کے دوسرے ضروری کاموں کے لیے اس طریق کار اور اُس کے فوائد کی مفصل کیفیت تو ہم اس سے قبل معلوم کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ جتلانا مقصود ہے کہ اس طریق کے مطابق جو چیزیں تیار ہوں گی، اُن میں رفع احتیاجات کی صلاحیت اس وقت تک مکمل نہ ہو گی جب تک کہ وہ تیار کرنے والوں کے ہاتھوں سے نکل کر استعمال کرنے والوں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائیں۔ اشیا کے اس طرح ہاتھوں ہاتھ بدلنے ہی کو اصطلاح میں مبادلہ دولت کہتے ہیں۔

اب انسان کے معلومات اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تقسیم عمل میں بھی برابر ترقی ہوتی ہو گئی اور جسقدر تقسیم عمل کو ترقی ہوئی مبادلۂ دولت کے کاروبار بھی برابر پھیلتے اور پیچیدہ ہوتے گئے۔ اول اول تو لوگ اپنی اپنی چیزوں کا براہ راست دوسروں کی چیزوں سے مبادلہ کرتے تھے چنانچہ انگریزی لفظ بارٹر (Barter) سے اسی قسم کا مبادلہ مراد ہے۔ لیکن جب تقسیم عمل کی روز افزوں

توسیع کی بدولت مختلف اشیا کی باہمی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہو گیا تو مبادلے کی آسانی کے لیے ایک تیسری چیز بہ طور واسطے کے مستعمل ہونے لگی جسے اصطلاح میں زر کہتے ہیں۔ زر کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کوئی چیز براہ راست دوسری چیزوں سے نہیں بدلی جاتی بلکہ ہر چیز سب سے پہلے زر کے ساتھ بدلی جاتی ہے اور یہ زر بعد ازاں دوسری چیزوں سے بدلا جاتا ہے۔ گویا زر کی بدولت بارٹر کا طریقہ موقوف اور مبادلہ دو جداگانہ افعال میں منقسم ہو گیا جنہیں سے ایک کو خرید اور دوسرے کو فروخت کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی چیز دوسرے کو دیکر اس سے معاوضے میں زر لے تو اس کا یہ فعل فروخت کہلاتا ہے اور جب کوئی شخص دوسرے کو زر دیکر معاوضہ میں اُس کی کوئی چیز حاصل کرے تو یہ خرید ہے۔

موجودہ زمانے میں تقسیم عمل کی ترقی جس انتہائی نقطے پر پہنچ گئی ہے اُس سے ہم واقف ہو چکے ہیں چنانچہ ہر ملک کی تجارت داخلہ اور دنیا کی عظیم الشان تجارت خارجہ کا سارا مدار اسی پر ہے۔ اسی ترقی کا یہ نتیجہ ہے کہ زر کی بھی وہی قدیم اور سیدھی سادی حیثیت برقرار نہیں رہی بلکہ اس میں وقتاً فوقتاً طرح طرح کی جدتیں کرنی پڑیں جن کے بغیر تقسیم عمل کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ زر، بنک، اعتبار اور مبادلاتِ خارجہ کے مسائل دراصل انہی جدتوں کی تشریح ہیں۔ آگے چلکر ہم بھی ان میں سے بعض مسائل

کی کیفیت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے ۔ سر دست ہمیں جس بحث کی طرف متوجہ ہونا ہے، وہ معاشیات کا معرکۃ الآرا مسئلہ نظریۂ قیمت ہے ۔ لیکن نظریۂ قیمت کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ "بازار" کا مفہوم، اس کی وسعت کے اسباب اور "قدر و قیمت" کا فرق اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے ۔ لہذا ہم اولاً انہی امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

بازار کا مفہوم

بازار کا مفہوم :۔ روزمرہ استعمال میں بازار سے مراد کوئی ایسا مقام ہے جہاں کچھ لوگ جمع ہو کر کسی چیز کی خرید و فروخت کریں ۔ دیہات، قصبات اور شہروں میں اس قسم کے چھوٹے بڑے بازار بہ کثرت نظر آتے ہیں ۔ شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں جہاں لوگ بہ کثرت آباد ہوتے ہیں مستقل بازار موجود ہوتے ہیں جہاں صبح سے شام تک انواع و اقسام کی چیزیں خریدی اور بیچی جاتی ہیں ۔ دیہات کی آبادی چونکہ مقابلتہً کم ہوتی ہے اس لیے وہاں اتنا کاروبار نہیں ہوتا جس کے لیے مستقل دکانیں قائم کرنی پڑیں ۔ ایسے مقامات پر ہر آٹھویں یا پندرھویں روز بازار لگتا ہے ۔ جہاں فروشندے اپنی اپنی چیزیں فروخت کے لیے لے آتے ہیں اور خریدار آیندہ ہفتے یا دو ہفتوں کی ضروریات خرید لیتے ہیں ۔ بعض مقامات پر مستقل دکانوں کے علاوہ ہر سال یا دو سال کے بعد خاص اہتمام سے نمائشیں قائم کی جاتی ہیں، بڑے بڑے بازار لگتے ہیں، کثرت سے

لوگ جمع ہوتے ہیں اور خوب مال فروخت ہوتا ہے۔ ان تمام بازاروں میں جو بات نمایاں طور پر مشترک نظر آتی ہے، وہ کسی خاص مقام پر دکانوں کا قائم ہونا اور خریداروں اور فروشندوں کا ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ لیکن معاشی بازار کے لیے نہ دکانوں کی ضرورت ہے اور نہ خریدنے اور بیچنے والوں کی باہمی ملاقات کی حاجت۔ اس کے لیے دراصل جو شرط لازمی ہے، وہ قیمت کی یکسانیت ہے۔ اگر کسی مقام پر کوئی چیز ایک ہی وقت میں مختلف قیمتوں پر فروخت ہو تو ایسا مقام معاشی نقطۂ نظر سے ایک بازار نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس اگر کوئی چیز مختلف مقامات میں ایک ہی قیمت پر فروخت ہو تو یہ سب مقامات ایک ہی بازار میں شامل سمجھے جائیں گے۔ لہٰذا اصطلاح معیشت میں بازار سے مراد وہ کل خطہ ہے جس کے اندر ایک وقت میں ایک چیز کی قیمت ہر جگہ برابر ہو۔ اگر کچھ فرق ہو تو یہ بمقدار مصارف آمد و رفت ہو اور بس۔ گویا قیمت کی یکسانیت، نہ کہ دکانوں کا قیام، معاشی بازار کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بلحاظ اس کی اس اصطلاحی تعریف کے مطابق دنیا کے مختلف ممالک باوجود ہزارہا میل کے فاصلے کے ایک ہی بازار میں شامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ سونا، چاندی، گیہوں، روئی وغیرہ کے بازار کم و بیش ساری دنیا پر محیط ہیں۔ اس کے برعکس ایک ہی ملک کے مختلف مقامات باوجود ایک دوسرے سے بہت قریب ہونے کے بہ وجہ عدم مساواتِ قیمت مختلف بازار

بازار کی تعریف

شمار ہو سکتے ہیں۔

بازار کا اصطلاحی مفہوم معلوم کرنے کے بعد اب ان امور کا جاننا ضروری ہے جن پر مختلف اشیا کے بازاروں کی وسعت یا تنگی کا انحصار ہے۔ لھذا ہم ذیل میں بازار کی وسعت کے شرایط درج کرتے ہیں:

(۱) آزادیِ مقابلہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فروشندے اور خریدار اپنے کاروبار کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں۔ جسقدر یہ واقفیت مکمل ہوگی اُسی قدر خریدار کم سے کم قیمت دینے اور فروشندے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس مقابلے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمت ایک خاص سطح پر قایم ہو جاتی ہے اور اُس سے بہت زیادہ دور نہیں ہٹنے پاتی۔ اس کے برعکس اگر فریقین کو طلب و رسد کی موجودہ حالت اور آیندہ قرائن کا ٹھیک اندازہ نہ ہو، یا طلب و رسد پر طرح طرح کے مقامی اور بیرونی اسباب کا جو اثر پڑتا ہے، اُس پر کما حقہ عبور نہ ہو مختصر یہ کہ اگر انہیں اپنے کاروبار کے مختلف پہلوؤں سے پوری پوری واقفیت نہ ہو تو پھر کسی ایک قیمت کا برقرار رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہت سے خریدار اپنی ناواقفیت کی وجہ سے دوسروں سے گراں خریدتے رہتے ہیں اور بہت سے فروشندے اپنے ناقص معلومات کے باعث دوسروں سے ارزاں فروخت کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں عالمگیر امن و امان اور وسائلِ آمد و رفت کی غیر معمولی سہولت

وارزانی کی وجہ سے مختلف ممالک کے کاروباری حالات سے واقف
ہونا بہت آسان ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جوں جوں یہ واقفیت زیادہ
مکمل ہوتی ... مقابلے کا اثر بھی زیادہ وسیع اور قوی ہوتا جاتا
ہے یہی ... ج ہم بعض چیزوں کے لیے ساری دنیا کو ایک
بازار ہے

لیکن باوجود دورِ جدید کے ان رجحانات کے یہ ایک بدیہی
واقعہ ہے کہ بہت سی چیزوں کے بازار انتہا درجے محدود ہوتے ہیں
جیسے دودھ، دہی، یا میووں کے بازار۔ اور اکثر و بیشتر اشیا
ایسی ہیں جن کے بازار نہ تو سونے کے بازار کی طرح سارے عالم پر
محیط ہیں اور نہ دودھ کے بازار کی طرح صرف ایک قصبے تک محدود
ہیں بلکہ وہ ان انتہائی حدود کے بین بین ہیں۔ لہٰذا دریافت طلب
یہ امر ہے کہ کس قسم کی چیزوں کے بازار وسیع ہوتے ہیں۔ بالفاظ
دیگر نوعیت اشیا کے لحاظ سے وسعتِ بازار کے کیا شرائط ہیں ذیل
میں ہم انہی شرائط کا حال بیان کرتے ہیں:

عمومیت طلب

(۴) عمومیت طلب۔ یہ ایک بدیہی واقعہ ہے کہ اشیا کی
طلب پر رسم و رواج، آب و ہوا، اور عام خوشحالی جیسے اسباب کا
بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ جن مقامات میں پلنگ پر سونے کا رواج
نہ ہو وہاں پلنگوں کی طلب بہت کم ہوگی۔ یا جہاں لوگ فرش پر
اٹھنے بیٹھنے کے عادی ہوں وہاں میز کرسی کی بہت کم ضرورت ہوگی

سرد ممالک میں ادنی کپڑوں کی جسقدر طلب ہوتی ہے، وہ گرم ممالک میں نہیں پائی جاتی۔ دکن میں املی جس کثرت سے استعمال ہوتی ہے اُس کی مثال شاید کہیں اور مل سکے۔ ... ولایتی جوتے، گھڑیاں، اور دوسری بے شمار چیز ... کی طلب شہروں اور بڑے بڑے قصبات تک محدود ... جہاں خوش باش لوگ بالعموم رہتے بستے ہیں۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جن کی طلب اس طرح خاص خاص مقامات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ جو ہر ملک اور ہر آب و ہوا میں عام طور پر طلب کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جسقدر کسی چیز کی طلب میں زیادہ عمومیت پائی جائے گی اُسی قدر اُس کا بازار وسیع ہوگا۔ سونا، چاندی، گیہوں، روئی، عام طلب والی چیزوں کی چند مثالیں ہیں۔

(۳) شناخت پذیری۔ بعض چیزوں کی نہایت تھوڑی مقدار دیکھ کر کل مقدار کی خوبی کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے سونا اور چاندی جن چیزوں میں یہ صفت پائی جاتی ہے ان کے بازار نسبتاً زیادہ وسیع ہوتے ہیں کیونکہ لوگ نمونہ دیکھکر دور دراز مقامات سے مال منگا سکتے ہیں۔ سونے اور چاندی میں تو یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے لیکن موجودہ زمانے میں کاروباری اشخاص نے طرح طرح کی ترکیبوں سے بہت سی دوسری چیزوں میں بھی شناخت پذیری کی صفت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ گیہوں اور روئی کی وسیع تجارت کا

شناخت پذیری
sample.

انحصار بہت کچھ اسی شناخت پذیری پر ہے۔ مشہور کارخانے جو تیار کرتے ہیں، وہ ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بطور نمونوں کے نہایت احتیاط کے ساتھ دور دور دراز ممالک میں بھیجتے رہتے ہیں۔ لوگ ان نمونوں اور ان کی قیمتوں کو دیکھ کر حسب دلخواہ فرمائش بھیجتے اور گھر بیٹھے مال وصول کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جن چیزوں کی خوبی میں اس طور پر یکسانیت نہیں پائی جاتی اُن کے نہ تو مختلف مدارج قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ اِن مدارج کے مطابق نمونے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ ایسی چیزوں کی خرید و فروخت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ کل مقدار قبل از قبل خریداروں کی نظر سے گذر چکے۔

(۴) انتقال پذیری۔ کسی چیز میں انتقال پذیری کی صفت دو خاص شرائط کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے: ایک اُس کی دیرپائی دوسرے وزن و جسامت کے مقابلے میں اس کی قیمت کی زیادتی جو چیزیں سریع الزوال ہوتی ہیں جیسے پھول، میوے، گوشت، ترکاریاں، وہ دور دراز مقامات تک نہیں پہنچائی جا سکتیں کیونکہ وہ اثنائے راہ میں سڑ گل کر بیکار ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی چیزیں بالعموم انہی مقامات میں صرف ہو جاتی ہیں جن کے قرب و جوار میں وہ پیدا ہوتی ہیں۔ انتقال پذیری کی دوسری شرط یہ ہے کہ شئے متعلقہ کی جسامت یا اُس کا وزن قیمت کا لحاظ کرتے ہوئے بہت زیادہ نہ ہو۔ شاہ آباد کا پتھر جو حیدرآباد کے حدود میں اس

Portability
انتقال پذیری

سے استعمال ہوتا ہے، دوسرے مقامات میں دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ شمالی ہند کی اینٹیں حیدر آباد میں مطلق استعمال نہیں ہوتیں۔ یہ چیزیں اگر دور دراز مقامات کو روانہ کی جائینگی تو مصارف نقل وحمل ان کی اصلی قیمتوں سے کئی گنے زیادہ ہو جائیں گے۔

قدر اور قیمت کا فرق

قدر اور قیمت کا فرق ۔۔ مبادلہ دولت کی ضرورت میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیونکر تقسیم عمل کی ترقی اور تجارت کی توسیع کی بدولت بارٹر یعنی مبادلہ اشیا بہ اشیا کا طریقہ موقوف ہوکر خرید و فروخت کا رواج پھیل گیا ہے۔ ان دونوں طریقوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک میں بغیر کسی تیسری چیز کے واسطے کے مختلف اشیا کا براہ راست مبادلہ ہوتا ہے۔ جیسے چاول دیکر کپڑا لینا، لکڑی دیکر مچھلی لینا، دودھ دیکر روئی لینا۔ مبادلے کا ہر ایک فریق اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز پیش کرتا ہے جس سے دوسرے فریق کی کوئی خاص احتیاج رفع ہوسکے۔ لیکن مبادلۂ دولت کا جو طریقہ اس زمانے میں رائج ہے، وہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس طریقے کے مطابق ایک فریق تو دوسرے کی کوئی نہ کوئی مطلوبہ چیز مہیا کردیتا ہے لیکن دوسرا فریق ہمیشہ ایک ہی قسم کی چیز پیش کرتا ہے جسے اصطلاح میں زر کہا جاتا ہے۔ پہلے فریق کو فروشندہ اور دوسرے کو خریدار کہتے ہیں۔ مبادلے کے ان دونوں طریقوں کا فرق ذہن نشین کرلینے کے بعد ہم قدر اور قیمت کا فرق بہ آسانی

قدر و قیمت بلحاظ زر

سمجھ سکتے ہیں۔ کسی چیز کی وہ مقدار جو کسی دوسری چیز کی ایک خاص مقدار کے عوض حاصل ہو سکے اُس کی قدر کہلاتی ہے مثلاً اگر چار سیر چاول کے عوض دو گز کپڑا ملے تو دو گز کپڑا چار سیر چاول کی قدر ہوگی اور چار سیر چاول دو گز کپڑے کی قدر ہوگی۔ لیکن زر کی وہ مقدار جو کسی چیز کی ایک خاص مقدار کے عوض حاصل ہو اس کی قیمت کہلاتی ہے مثلاً اگر چار سیر چاول کے عوض ایک روپیہ ملے تو چار سیر چاول تو ایک روپیہ کی قدر ہوگی لیکن ایک روپیہ چار سیر چاول کی قیمت ہوگی گویا قیمت وہ قدر ہے جو بہ شکل زر بیان کی جائے۔

قیمت

یہ تو ہم معلوم کر چکے کہ آج کل معاوضۂ اشیا بہ اشیا کا طریقہ موقوف ہو کر مبادلۂ اشیا بہ زر کا طریق بہت زیادہ رائج ہو گیا ہے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک تیسری قسم کا مبادلہ اور پیدا ہو گیا ہے جو خاصکر تجارت بین الاقوام میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری مراد مبادلۂ زر بہ زر، یا زر کی مختلف قسموں کے باہمی مبادلے سے ہے مثلاً روپیہ دیکر پیسے لینا یا اشرفی دیکر روپے لینا۔ حیدر آباد میں حالی اور کلدار روپیوں کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ بھی اسی مبادلے کی ایک مثال ہے۔ موجودہ زمانے میں تجارت بین الاقوام کا سارا مدار اسی مبادلے پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک کا زر صرف اُسی ملک کے اندر چل سکتا ہے۔ دوسرے ممالک اسے قبول نہیں کرتے۔ مثلاً ہند کا روپیہ صرف ہند میں چلتا ہے

انگلستان میں اسے کوئی نہیں قبول کرتا۔ لہذا جو ہندی تاجر انگلستان سے مال منگاتے ہیں، انھیں اپنے مال کی قیمت انگلستان کے زر یعنی پونڈ میں ادا کرنی ہوگی۔ اسی طرح انگلستان کے جو تاجر ہند سے مال منگاتے ہیں انھیں اُس کی قیمت روپیے کے ذریعے سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر ہند اور انگلستان دونوں ملکوں میں روپے اور پونڈ کا باہمی مبادلہ بہ کثرت ہوتا رہتا ہے۔ یہ تو ہم نے صرف دو ملکوں کی مثال پیش کی ہے۔ درحقیقت دنیا کے تمام ممالک ایک دوسرے کے ساتھ کم و بیش تجارتی تعلقات رکھتے ہیں اور اپنی تعلقات کی مناسبت سے ہر ایک کے زر کا دوسرے کے زر سے مبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ہمیں ایک اور اصطلاح یعنی "قیمت زر" کا مفہوم بھی جان لینا چاہیئے۔ "قیمت زر" بظاہر ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ قیمت خود زر کی وہ مقدار ہے جو کسی دوسری چیز کے عوض دی جائے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بہت سی چیزیں نہ صرف فروخت ہوتی ہیں بلکہ دوسروں کو عارضی طور پر استعمال کے لیے بھی دی جاتی ہیں مثلاً مکانات فروخت بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو کسی خاص مدت تک رہنے کے لیے بھی دے جاتے ہیں۔ فروخت ہونے کی صورت میں جو معاوضہ بشکل زر دیا جاتا ہے وہ مکان کی قیمت ہے لیکن اُس کے عارضی استعمال کا جو معاوضہ

ادا کیا جاتا ہے وہ اُس کا کرایہ ہے۔ اسی طرح مشینیں، برتن، باجے حتی کہ بعض اوقات پہننے کے کپڑے بھی کرایہ پر دیے جاتے ہیں زر کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں روزانہ لاکھوں کروڑوں کا لین دین ہوتا ہے۔ بڑے بڑے عظیم الشان بنکوں سے لیکر چھوٹے کم حیثیت ساہوکار تک سب اسی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ لوگ مختلف ضرورتوں کے لیے زر مستعار لیتے ہیں اور یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ایک مدت معینہ کے بعد اُسے واپس کردیں گے اور ساتھ ہی اس کے استعمال کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔ یہی معاوضہ در اصل زر کی قیمت ہے اور جیسا کہ ہم تقسیم دولت میں معلوم کرچکے ہیں اسی کو معاشیات کی اصطلاح میں سود کہا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زر کے بڑے بڑے باقاعدہ بازار موجود ہیں۔ اُس کے خریدار کو قرض گیر اور فروشندے کو قرض دہندہ کہتے ہیں اور اس کے استعمال کی قیمت سود کہلاتی ہے۔ جب زر کی رسد اُس کی طلب کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے تو زر ارزان ہوجاتا ہے یعنی شرح سود گرجاتی ہے۔ اس کی برعکس صورت میں زر گراں ہوجاتا ہے اور سود کی شرح چڑھ جاتی ہے۔

نظریۂ قیمت

نظریۂ قیمت۔ نظریۂ قیمت کی تشریح کے لیے ہمیں دو سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے: ایک یہ کہ قیمت کیوں ادا کی جاتی ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کیونکر معین ہوتی ہے؟ اولاً ہم پہلے

سوال کو لیتے ہیں ۔

اس کتاب کے مقدمہ میں ہم نہایت تفصیل کے ساتھ یہ بتا چکے ہیں کہ جب تک کسی چیز میں چند خاص شرائط موجود نہ ہوں اس کا مبادلہ نہیں ہو سکتا ۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چیز ہماری کسی نہ کسی احتیاج کو رفع کر سکے یعنی اس میں افادہ ہو دوسرے یہ کہ لوگ اس افادے سے واقف ہوں ۔ تیسرے وہ انسان کی دسترس سے باہر نہ ہو ۔ چوتھے اُس کی مقدار محدود ہو تاکہ وہ کسی خاص شخص یا جماعت کی مِلک شمار ہو سکے ۔ اگر کسی چیز میں ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی کم ہوگی تو ایسی چیز کا مبادلہ نہ ہو سکے گا ۔ ہمیں اس موقع پر صرف چوتھی یعنی تعین مقدار والی شرط سے سروکار ہے ۔

تعین مقدار کا مفہوم سمجھنے کے لیے ہند کے مشہور دریا گنگا کے پانی کی مثال نہایت موزوں ہے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہنود اس دریا کو مقدس مانتے اور اس کے پانی کو ایک طرح کا تبرک سمجھتے ہیں ۔ باوجود اس کے جتنے شہر اس دریا کے کنارے پر واقع ہیں وہاں نہ اُس کے پانی کا مبادلہ ہوتا ہے اور نہ اُس کی کوئی قدر و قیمت ہوتی ہے ۔ لیکن یہی پانی دوسرے مقامات میں پہنچکر نہایت قابل قدر بنجاتا ہے اور اس کی ذرا ذرا سی مقدار کے لیے خوش عقیدہ ہندو دل کھول کر قیمت ادا کرتے ہیں ۔ اس فرق کی وجہ یہی تعین مقدار کی صفت ہے ۔ پہلی صورت میں پانی کی اسقدر افراط ہے کہ ہر شخص اسے جسقدر چاہے

بلامعاوضہ حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ گنگا کے پانی کی مقدار تھوڑی اور اس کے خواہشمندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ گویا تعین مقدار کی صفت جو پہلی صورت میں مفقود تھی، دوسری صورت میں پیدا ہوگئی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کسی چیز کی قلت یعنی اس کا بہ مقدار طلب دستیاب نہ ہونا، یا بالفاظ دیگر مقدار مطلوبہ کے مقابلے میں مقدار رسد کم ہونا، ہی دراصل تعین مقدار کا مفہوم ہے۔ جب تک کہ کسی چیز کی مقدار معین نہ ہو یعنی اس میں قلت کی صفت موجود نہ ہو، اس کا قطعًا مبادلہ نہیں ہوسکتا اور جب تک کہ کسی چیز کا مبادلہ نہ ہو اس کی قیمت کیونکر ادا کی جاسکتی ہے۔ لہذا معاشیات کا یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "قیمت کا مدار قلت پر ہے"۔ اور یہی دراصل ہمارے پہلے سوال کا جواب ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جسقدر کسی چیز میں قلت کی صفت زیادہ ہوگی اسی قدر اس کی قیمت بھی زیادہ ہوگی۔

نوٹ۔ اس موقع پر قلت اور ندرت کا فرق بتادینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جب ہم کسی چیز کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کی بہت قلت ہے تو ہمارے ذہن میں فورًا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اس چیز کی بہت تھوڑی مقدار میسر ہے۔ حالانکہ دراصل ضروری نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی چیز کثیر مقدار میں موجود ہو اور پھر بھی اس کی قلت محسوس ہو۔ حیدرآباد میں روزانہ سیکڑوں بکرے ذبح

ہوتے ہیں لیکن پھر بھی کثیر التعداد لوگ اپنی کم استطاعتی کی وجہ سے گوشت نہیں خرید سکتے بلکہ سستی دالوں اور ترکاریوں سے کام چلاتے ہیں۔ فی نفسہ تو گوشت کی مقدار بہت زیادہ ہے لیکن چونکہ طلب کے مقابلے میں اُس کی رسد ناکافی ہے اس لیے اس میں قلت کی صفت موجود ہے اور اسی وجہ سے گوشت کی قیمت ادا کی جاتی ہے اگر کہیں گوشت کی رسد اُس کی طلب سے زیادہ ہوتی تو پھر نہ گوشت کی قلت ہوتی اور نہ کوئی شخص اُس کی قیمت ادا کرتا۔ بلکہ ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص جتنا گوشت چاہتا، حاصل کر لیتا۔ پس معلوم ہوا کہ قلت سے مراد کسی چیز کی فی نفسہ کمی نہیں بلکہ اس کا بمقدار طلب دستیاب نہ ہونا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی چیز نہایت تھوڑی مقدار میں موجود ہو اور پھر بھی کوئی طالب یا خواہشمند نہ ہونے سے وہ فروخت نہ ہو سکے یا اگر ہو بھی تو نہایت ارزاں قیمت پر۔ گویا باوجود کم مقدار ہونے کے اس کی رسد بہ مقابل طلب کے زیادہ ہے چنانچہ قدیم سکوں اور تصویروں کی یہی حالت ہے۔ اگر ان کا کوئی قدردان مل گیا تب تو منھ مانگی قیمت وصول ہو گئی۔ ورنہ وہی چیزیں ناقدرشناسوں کے ہاتھوں میں کوڑیوں کے مول فروخت ہو جائیں تو عجب نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ندرت کو مقدار طلب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ اس سے کسی چیز کی فی نفسہ کمی مراد ہے۔ ندرت کی ضد عموم ہے۔ اور قلت کی ضد کثرت ہے۔ قیمت کے لیے ندرت ضروری نہیں البتہ

قلت سراسر ناگزیر ہے۔

یہاں تک تو ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کسی چیز کی قیمت کیوں ادا کی جاتی ہے۔ اب ہم نظریہ قیمت کے دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ قیمت کیونکر معین ہوتی ہے یا بہ الفاظ دیگر تعین شرح قیمت کے اصول کیا ہیں۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر مبادلے میں دو فریق ہوتے ہیں: ایک خریدار، دوسرا فروشندہ۔ خریدار اپنی مطلوبہ چیز جسقدر کم قیمت پر مل سکے، لینے کی کوشش کرتا ہے اور فروشندہ اپنے مال کی جسقدر زیادہ قیمت مل سکے، وصول کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ لہذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ خریدار کی زیادہ سے زیادہ قیمت اور فروشندہ کی کم سے کم قیمت، یہ دونوں کس اصول کے مطابق معین ہوتی ہیں۔ واضح ہو کہ خریدار کی طرف سے جو انتہائی قیمت پیش کی جائے اُسے اصطلاح میں قیمت طلب کہتے ہیں اور فروشندہ جو کمترین قیمت قبول کرنے پر آمادہ ہو اسے قیمت رسد کہتے ہیں۔ اب اگر کسی چیز کی قیمت طلب اس کی قیمت رسد سے کم ہو تو ایسی چیز کا فروخت ہونا محال ہے۔ کیونکہ خریدار زیادہ سے زیادہ جو قیمت دے سکتا ہے، وہ اس ادنیٰ ترین قیمت سے بھی کم ہے جس کو فروشندہ قبول کر سکے۔ لہذا سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قیمت طلب قیمت رسد سے بڑھی ہوئی ہو۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی چیز صرف اس لیے طلب کی جاتی ہے کہ اس میں رفع احتیاجات کی قابلیت ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ کوئی احتیاج پوری ہوسکے، شئے مطلوبہ کی قیمت ادا ہونا ضروری ہے۔ لھذا خریدار ایک طرف تو اس افادے کو پیش نظر رکھتا ہے جو اُسے شئے مطلوبہ کے استعمال سے حاصل ہوگا اور دوسری طرف اُس افادے کا خیال کرتا ہے جو فریق ثانی کی مطلوبہ قیمت ادا کرنے سے اُسے چھوڑنا پڑیگا۔ اب اگر اُس کی نظر مین پہلا افادہ دوسرے افادے سے کم ہے تو وہ ہرگز چیز خریدنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر پہلا افادہ دوسرے افادے کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو پھر جسقدر وہ زیادہ ہوگا اسی قدر خریدار چیز خریدنے کا خواہشمند ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سب لوگون کی احتیاجات ایک سی نہیں ہوتین اور نہ ان کو رفع کرنے کے ذرائع سب کے پاس برابر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی چیز کا افادہ مختلف اشخاص کی نظرون مین مختلف اور زیادہ تر ہر شخص کی مالی حیثیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ قانون تقلیل افادہ کے مطابق جوں جوں کسی چیز کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے مزید مقداروں کا افادہ گھٹتا جاتا ہے۔ لہذا اگر کسی شخص کے پاس پہلے سے کسی چیز کی کافی مقدار موجود ہے تو وہ مزید مقدار متقابلتہ ادنی قیمت پر خریدنا چاہے گا۔ لیکن اگر پہلے سے کوئی مقدار موجود نہ ہو اور مزید مقدار کا افادہ اس کی نظر میں سر دست بہت زیادہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ مقابلتہً زیادہ قیمت دینے کو تیار ہو جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ "خریدار کسی

شے کے خریدنے میں قانون تقلیل افادہ کا پیرو ہوتا ہے اور قیمت طلب اس مقدار کے افادہ مختتم سے کم یا اس کے مساوی ہوتی ہے۔"

اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ فروشندہ اپنی چیز کے لیے کم سے کم جو قیمت مانگتا ہے یعنی قیمت رسد، وہ کن اسباب کے زیر اثر معین ہوتی ہے؟ سب سے پہلے ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ فروشندہ ایک کاروباری شخص ہے جو اس لیے مال تیار نہیں کرتا کہ خود اس کے افادے سے مستفید ہو بلکہ اس لیے تیار کرتا ہے کہ اسے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر کے کچھ آمدنی پیدا کرے۔ اسے تو بہرصورت اپنا مال علیحدہ کرنا ہے لیکن وہ نقصان اٹھا کر مال علیحدہ نہیں کرے گا۔ اسے مال تیار کرنے میں بہت سے اخراجات لاحق ہوتے ہیں جنھیں ہم اصطلاح میں مصارف پیدائش کہتے ہیں۔ چنانچہ عمارتوں کی تعمیر و مرمت، مشینوں اور آلات و اوزار کی خریدی، پیداوار خام کی بہم رسانی، مزدوروں کی اجرتیں، اور منتظمین کی تنخواہیں، یہ سب مصارف پیدائش میں شامل ہیں۔ اگر وہ خود مال تیار نہیں کرتا بلکہ کارخانوں سے مال لیکر خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، یعنی اگر وہ کارخانہ دار نہیں بلکہ تاجر ہے، تب بھی اسے اپنے خرید کردہ مال کی قیمت ادا کرنی اور اپنا کاروبار چلانے کے اخراجات برداشت کرنے ضروری ہیں۔ مزید براں خواہ وہ کارخانہ دار ہو یا تاجر، دونوں صورتوں میں وہ کاروبار متعلقہ کی خاطر اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کرتا اور اپنی مہارت اور جد و جہد سے اسے فایدہ پہنچانے کی کوشش

کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اپنے مال کی جو کمترین قیمت قبول کر سکتا ہے وہ لازمی طور پر اس بات کے لیے کافی ہونی چاہیے کہ اُس سے مذکورۂ بالا تمام مصارف نکلکر خود اس کے لیے کچھ آمدنی بچ رہے۔ ایسی قیمت بالعموم "قیمت مصارف" کہلاتی ہے اور وہی فروشندہ کی جانب سے کمترین قیمت ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ "قیمتِ رسد مصارفِ پیدائش کے مساوی ہوتی ہے، کم نہیں ہو سکتی"۔

قیمت رسد کے متعلق یہ کلیہ کہ وہ مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہے، کم نہیں ہو سکتی، بہ حیثیت مجموعی تو بالکل صحیح ہے لیکن بعض خاص صورتوں میں جن کا شمار مستثنیات میں ہے، اس کلیے کے خلاف بھی عمل ہوتا ہے یعنی قیمت رسد مصارف پیدائش سے بالکل بے تعلق اور اُن سے کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہے (۱) مثلاً جب کوئی چیز پیدا نہ کی جا سکے یعنی اُس کی موجودہ مقدار میں اضافہ و تخفیف ممکن نہ ہو تو ایسی حالت میں مصارف پیدائش کا سوال بالکل خارج از بحث اور قیمت کا مدار محض خریداروں کی خواہش پر ہوتا ہے۔ نایاب کتابوں کے قلمی نسخے، قدیم استادوں کی کھینچی ہوئی تصویریں، پرانے زمانے کے سکے، اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اِن چیزوں کے مصارفِ پیدائش کا کوئی کیسے اندازہ کر سکتا ہے لہٰذا ان کی قیمت رسد نہیں بتائی جا سکتی۔ اُن کی قیمت کا تمام تر مدار محض قیمتِ طلب پر ہوتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان چیزوں کے شوقین اور قدر شناس نکل آئے تو وہ اچھی

قیمت دیکر انھیں خرید لیں گے ورنہ جو قیمت بھی خریدار دینے پر رضامند ہو، وہ فروشندہ کو مجبوراً قبول کرنا پڑیگا۔ (۲) دوسری صورت جس میں کہ اس کلیئے کے مطابق عمل نہیں ہوتا، اُس طریق پیدائش سے متعلق ہے جسے معاشیات کی اصطلاح میں اجارہ کہتے ہیں۔ آگے چلکر ہم اجارے اور مقابلے کا فرق اور ہر ایک کے فواید و نقصانات تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ جب کوئی ایک یا چند کارخانے کسی چیز کی تیاری کے لیے اس طور پر مخصوص ہو جائیں کہ ان کے سوا کوئی دوسرا وہی چیز تیار نہ کر سکے تو ایسی حالت کو اجارہ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی کاروبار میں اس قسم کی کوئی روک ٹوک نہ ہو اور ہر شخص اسے اختیار کرنے کا مجاز ہو تو یہ مقابلے کی حالت ہوگی۔ اجارے کی حالت میں مقدار پیداوار کم و بیش پورے طور پر خود مال تیار کرنے والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جسقدر وہ چاہیں مال تیار کریں اور جسقدر چاہیں اس میں تخفیف کر دیں۔ کوئی حریف ان کے مقابلے کے لیے موجود نہیں ہوتا جس کا انھیں خوف ہو۔ مقدار پیداوار پر اس طرح قابو پالنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فروشندے اپنے مال کی قیمت مقرر کرنے میں مصارف پیدائش کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ مصارف پیدائش سے کم پر تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوں گے اور نہ رسد پر پورا قابو رکھتے ہوئے انھیں اس طرح راضی ہونے کی کوئی ضرورت

وہ جو قیمت مقرر کرتے ہیں اُس میں صرف ایک بات ان کے پیش نظر رہتی ہے ۔ وہ یہ کہ بہ حیثیت مجموعی انھیں اپنے کاروبار سے کثیر سے کثیر منافع حاصل ہو۔ جس قیمت پر مال فروخت کرنے سے اُنھیں بالآخر کثیر ترین منافع حاصل ہوگا بس وہی قیمت مقرر ہو جائے گی خواہ وہ مصارف پیدائش سے کتنی ہی زاید کیوں نہ ہو۔ ایسی قیمت کو اصطلاح میں "قیمت اجارہ" کہتے ہیں اور وہ مصارف پیدائش سے بالعموم بہت زیادہ ہوتی ہے ۔

قیمت رسد کے مذکورہ بالا کلیئے کے متعلق ایک اور بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے ۔ بلاشبہہ قیمت رسد مصارف پیدائش کے مساوی ہوگی، کم نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ اگر قیمت سے مصارف پیدائش بھی نہ ملیں گے تو فروشندے سردست اپنا مال روک لیں گے اور اگر ضرورت ہو تو آئندہ بھی اُس کی پیداوار میں کمی کر دیں گے ۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر چیزیں زیادہ مدت تک روکی نہیں جا سکتیں اور بہت سی چیزوں کی پیداوار میں فی الفور کوئی اضافہ یا تخفیف نہیں ہو سکتی ۔ مثال کے طور پر تازہ پھل پھول اور ترکاریوں کو لیجیے ۔ اگر طلب کی کمی سے قیمت اسقدر گھٹ جائے کہ اُس سے مصارف پیدائش بھی نہ نکل سکیں تب بھی فروشندے اپنا مال روک نہیں سکتے ۔ کیونکہ اس کے سڑنے گلنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے ۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ سارا مال خراب کیا جائے یہی مناسب ہے کہ خریدار جو قیمت بھی دینے کے لیے آمادہ ہوں وہ

قبول کرلی جایے۔ اسی طرح اگر کسی وقت ان چیزوں کی طلب بہت بڑھ جائے تو فروشندے زیادہ قیمت کے لالچ میں اپنے مال کی مقدار نہیں بڑھا سکتے کیونکہ ان چیزوں کی پیدائش کے لیے کچھ مدت درکار ہوتی ہے لہذا موجودہ مقدار ہی پر جو کچھ منافع مل سکے، اسی پر اکتفا کرنا پڑے گا پس معلوم ہوا کہ سریع الزوال چیزوں کی طلب میں اگر یکایک کوئی تغیر واقع ہو تو ان کی قیمت مصارفِ پیدائش سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ طلب بڑھتی دیکھ کر نہ پیداوار فوراً بڑھائی جاسکتی ہے اور نہ طلب گھٹتی دیکھ کر پیداوار فوراً گھٹائی جاسکتی ہے۔ قیمت کا مدار محض طلب پر رہ جاتا ہے۔ اور ایسی قیمت اصطلاح میں "بازاری قیمت" کہلاتی ہے۔ کیونکہ وہ محض بازار کے وقتی حالات کی بنا پر قرار پاتی ہے۔

بازاری قیمت سراسر قیمتِ طلب کے تابع ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اس میں وقتاً فوقتاً بہت زیادہ کمی بیشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن باوجود ان کمی بیشیوں کے اگر بازاری قیمت کا اوسط نکالا جایے تو وہ یقیناً قیمت رسد یعنی مصارفِ پیدائش کے مساوی ہوگا۔ کیونکہ اگر وہ مصارفِ پیدائش سے کم ہوگا تو کچھ لوگ وہ چیز تیار کرنا چھوڑ دیں گے اور کچھ اپنی اپنی پیداوار میں کمی کردیں گے۔ اور اس طرح رسد کی مقدار بتدریج گھٹکر قیمت پھر مصارفِ پیدائش تک پہنچ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر بازاری قیمت کا اوسط مصارفِ پیدائش سے زیادہ ہوگا تو جو لوگ پہلے سے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنی اپنی مقدار پیداوار بڑھا

دیں گے اور اُن کی خوشحالی دیکھ کر دوسرے لوگ بھی وہی کاروبار شروع کرنے لگیں گے حتیٰ کہ مقدار رسد میں بہ تدریج اضافہ ہو کر قیمت پھر مصارف پیدائش کے برابر آ لگے گی۔

یہاں تک تو ہم نے سریع الزوال چیزوں کی قیمت کا حال معلوم کیا اب جو چیزیں زیادہ دیرپا ہوتی ہیں اُن کی قیمت مصارفِ پیدائش سے اس طرح بے تعلق نہیں رہتی۔ اگر وہ ایک طرف قیمت طلب کے "تابع ہوتی ہے تو دوسری طرف قیمت رسد بھی اس کو اپنے اثر سے نکلنے نہیں دیتی۔ کیونکہ اگر طلب کی غیر معمولی تخفیف سے قیمت اس قدر گھٹ جائے کہ مصارف پیدائش کا ملنا دشوار ہو جائے تو فروشندے مال فروخت کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ وہ اس بات پر قادر ہیں کہ کچھ مدت تک اپنے مال کے ذخیرے بہ حفاظت رکھ سکیں۔ سریع الزوال چیزوں کی طرح مال کے سڑنے گلنے کا انہیں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ فوراً مقدار رسد گھٹا دیتے ہیں جس کی وجہ سے قیمت خودبخود بلند ہو کر مصارفِ پیدائش کے برابر پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیرپا چیزوں کی قیمتوں میں بار بار بڑے بڑے تغیرات واقع نہیں ہوتے اور جو کچھ تغیرات واقع ہوتے ہیں وہ اول تو طلب و رسد دونوں کے تغیرات و انقلابات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ اس قدر تدریجی طور پر نمودار ہوتے ہیں کہ تھوڑی مدت کے اندر انہیں کوئی مشکل ہی سے محسوس کر سکتا ہے۔" ایسی قیمت جس کی تبدیلیاں مختصر حدود کے

اندر اندر ہیں اور جس میں کوئی بڑی تبدیلی مدتوں کے بعد نمودار ہوتی ہو'' اسے اصطلاح میں ''**معمولی قیمت**'' کہتے ہیں۔

یہاں تک تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ جو چیزیں سریع الزوال ہوتی ہیں یا جن کی مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی، وہ سراسر قیمت طلب کی دست نگر ہوتی ہیں اور ان کی قیمت ''بازاری قیمت'' کہلاتی ہے اس کے برعکس جو چیزیں دیرپا ہوتی ہیں یا جنکی مقدار میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے وہ قیمت طلب و قیمت رسد دونوں سے متاثر ہوتی ہیں اور ان کی قیمت ''معمولی قیمت'' کہلاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کم و بیش ہونے والی اشیا کی پیدائش یا تو قانون تقلیل حاصل کے تابع ہوگی یا تکثیرِ حاصل کے یا استقرار حاصل کے۔ لہذا ہم ذیل میں قیمت رسد پر ان مختلف قوانین کا اثر نہایت اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں :-

(ا) قانون تقلیل حاصل :- جوں جوں مقدار پیداوار بڑھے گی Cost of Increase مصارف پیدائش فی شے زیادہ ہوں گے اور قیمت رسد میں اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس جوں جوں مقدار پیداوار گھٹے گی مصارف پیدائش فی شے بھی گھٹیں گے اور قیمت رسد میں تخفیف ہوگی۔

(اا) قانون تکثیر حاصل : مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدائش فی شے گھٹتے جاتے ہیں اور قیمت رسد میں تخفیف ہوتی ہے اس کے برعکس مقدار پیداوار گھٹنے سے مصارف پیدائش فی شے بڑھتے

جاتے ہیں اور قیمت رسد میں اضافہ ہوتا ہے۔

(iii) قانون استقرار حاصل: مقدار دار پیداوار کے بڑھنے یا گھٹنے کا مصارفِ پیدائش فی شے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لہٰذا قیمت رسد میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا بیان سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معمولی حالات کے اندر کسی چیز کی قیمت نہ قیمتِ طلب سے زیادہ ہوسکتی ہے اور نہ قیمت رسد سے کم۔ لازم ہے کہ وہ معمولاً انہی انتہائی حدود کے بین بین رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ان حدود کے اندر ٹھیک کسی ایک نقطے پر کیونکر قایم ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ اس خاص نقطے کا مدار سراسر خریداروں اور فروشندوں کی باہمی کشمکش پر ہے۔ ہر ایک اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ دوسرے پر اس کی حقیقی حالت نہ ظاہر ہونے پائے۔ خریدار کو شے متعلقہ کی خواہ کتنی ہی سخت ضرورت ہو، وہ حتی الوسع اُسے چھپانے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح فروشندہ مال فروخت کرنے کے لیے خواہ کتنا ہی بے چین ہو، وہ جہاں تک ممکن ہوسکے اپنی لاپروائی ظاہر کرے گا۔ مگر چونکہ درحقیقت دونوں ضرورتمند ہوتے ہیں لہٰذا ہر ایک کی شدتِ ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی قیمت طے پا جاتی ہے جو کبھی خریدار کے حق میں خفیف سی مفید ہوتی ہے تو کبھی فروشندہ کے حق میں۔ ذیل کی مثال (ماخوذ از علم المعیشت) سے اس بیان کی مزید توضیح ہوجایے گی:-

قیمت طلب فی من	گیہوں کی مقدار	قیمت رسد فی من
۲ روپے	۱۲۰۰	۴ روپے
۲½ "	۱۰۰۰	۳½ "
۳ "	۷۰۰	۳ "
۴ "	۵۰۰	۲½ "
۵ "	۳۰۰	۲ "

جوں جوں گیہوں کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے ایک طرف تو قانونِ تقلیلِ افادہ کے مطابق قیمت طلب گھٹتی جاتی ہے اور دوسری طرف قانون تقلیلِ حاصل کے اثر سے (کیونکہ گیہوں ایک زرعی پیداوار ہے) قیمت رسد بڑھتی جاتی ہے۔ سات سو من پر پہنچکر گیہوں کی مطلوبہ اور پیش کردہ مقدار اور قیمت طلب قیمت رسد برابر ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت کو اصطلاح میں **توازنِ طلب و رسد** کہتے ہیں۔ جس قیمت پر طلب اور رسد دونوں کی مقدار مساوی ہو وہ **قیمت متوازن** کہلاتی ہے۔ اور جس مقدار پر قیمتِ طلب اور قیمت رسد ایک دوسرے کے برابر ہو جائیں وہ **مقدار متوازنہ** ہے۔

نوٹ ۔ "واضح ہو کہ کامل توازن طلب و رسد بہت کم ممکن ہے۔ اگر کبھی نمودار بھی ہوتا ہے تو محض اتفاقی طور پر اور بہت جلد زائل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسد سات سو من کے اور قیمت تین روپے کے قریب رہتی ہے۔ کبھی کچھ زیادہ اور کبھی کچھ کم" (علم المعیشت)

مصارف مقدم و مصارف تقسیمی

مصارف مقدم و مصارف تقسیمی۔ فرض کرو کہ چند سرمایہ دار مل کر ایک پارچہ بافی کا کارخانہ قایم کرنا چاہتے ہیں۔ اس غرض سے انھیں جو اہتمام کرنا پڑیگا اس پر نظر ڈالنے سے ہم مصارف مقدم و تقسیمی کا فرق بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے کسی مناسب موقع و محل پر زمین حاصل کر کے ضروری عمارتیں بنوانی پڑیں گی۔ بعدازاں بڑی چھوٹی ہر قسم کی مشینیں اور دیگر آلات و اوزار جو پارچہ بافی کے لیے درکار ہوں خرید کر ہر مشین کو اس کی مناسب جگہہ پر نصب کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کاروبار کی وسعت کے لحاظ سے ایک یا اس سے زاید منیجر و نگراں کار، محرر و محاسب چپراسی و چوکیدار نوکر رکھنے پڑیں گے۔ جب یہ سب مستقل انتظامات مکمل ہو چلیں گے تب روئی، اون، یا ریشم اور دوسری ضروری خام پیداوار فراہم کی جائیں گی۔ مشینوں کو چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی قوت محرکہ مہیا کی جائیگی اور مزدوروں کو نوکر رکھ کر کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس طول طویل اہتمام کے بعد جو کپڑا تیار ہو کر نکلے گا، لازم ہے کہ اُس کی قیمت سے مذکورۂ بالا تمام مدوں کے مصارف نکل آئیں۔ چنانچہ شرح قیمت کے تعین میں مصارف پیدائش اور قیمت رسد کی اہمیت کا حال ہم نظریۂ قیمت کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھہ معلوم کر چکے ہیں۔

اب اگر ہم کپڑے کی کوئی خاص مقدار لیکر یہ معلوم کرنا چاہیں کہ صرف اس مقدار کی تیاری میں کتنی اجرت صرف ہوی ہے، قوت محرکہ کا کیا خرچ ہے، خام پیداوار کتنی لگی ہے، منیجروں، محرروں، اور چپراسیوں وغیرہ

کیا کیا تنخواہیں دی گئی ہیں، مزید براں کون کون سے مشین اور آلات
و اوزار اس مقدار کی تیاری میں کس کس قدر فرسودہ ہوئے ہیں اور
کارخانے کی عمارت پر کیا اثر پڑا ہے، تو ہم مکمل طور پر ایسی تفریق نہیں کر سکتے
اجرت، قوت محرکہ اور خام پیداواروں کی حد تک تو ہم کپڑے کی ہر جداگانہ
مقدار کے مصارف بتا سکتے ہیں لیکن جہاں تک اصل قائم کی فرسودگی
انجینئروں اور انتظامی عملے کی تنخواہوں کا تعلق ہے ہم اس طرح پر
ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ مصارف بھی کپڑے کی تیاری
کے لیے ناگزیر ہیں تاہم کسی خاص مقدار کے لیے ان کا ٹھیک ٹھیک
اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ململ کا ایک تھان لیا۔ ہم یہ تو بتا سکتے
ہیں کہ اس میں کتنی روئی لگی ہے اور کتنی اجرت صرف ہوئی ہے لیکن
یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کی وجہ سے منیجر کو کیا تنخواہ دینی پڑی اور
اس کے بننے میں کس قدر مشینیں فرسودہ ہوئیں۔ چنانچہ اسی فرق کی بنا پر
مصارف کی دو قسمیں کی گئی ہیں، ایک مصارفِ مقدم، دوسرے
مصارفِ تقسیمی۔

کسی چیز کے مصارف مقدم سے مراد ایسے مصارف ہیں جو محض
چیز کی اسی مقدار کی وجہ سے لاحق ہوئے ہوں مثلاً خام پیداوار
کی لاگت، مزدوروں کی اجرت، قوت محرکہ کا خرچ وغیرہ اس کے
برعکس مصارفِ تقسیمی سے وہ مصارف مراد ہیں جو شے متعلقہ کی اسی
خاص مقدار کی خاطر برداشت نہیں کیے جاتے بلکہ اس کے بغیر بھی لاحق ہوتے

ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً اصل قایم کے مطالبات فرسودگی، مینیجروں اور عملے کی تنخواہیں، اشتہارات کا خرچ وغیرہ۔ مصارفِ مقدم گویا روز کے مصارف ہیں جو اُسی وقت اور اُسی مناسبت سے لاحق ہوتے ہیں جبکہ مال تیار ہوتا رہے۔ لیکن مصارفِ تقضیمی وہ مستقل مصارف ہیں جو بلالحاظ مال کی تیاری اور اس کی مقدار کے برابر پیش آتے رہتے ہیں۔ مصارفِ مقدم اور مصارفِ تقضیمی دونوں کے مجموعے کو مصارف کُلّی کہتے ہیں۔

بعض اوقات سرد بازاری کی وجہ سے مال فروخت نہیں ہوتا تو کارخانہ دار مصارفِ تقضیمی یا اس کا کوئی جزو عارضی طور پر چھوڑ دیتے اور صرف مصارفِ مقدم پر اکتفا کرتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ عمارتوں اور مشینوں میں جو کچھ سرمایہ لگنا تھا وہ تو لگ چکا۔ اب اگر قیمت کم ہوتی دیکھ کر کارخانہ دار مال تیار کرنا چھوڑ دے تو سارا اصل قایم بیکار پڑا رہیگا اور اس میں جو کچھ سرمایہ لگ چکا ہے، وہ سراسر ضایع جائے گا۔ لہذا اگر قیمت سے صرف مصارفِ مقدم بھی نکل آئیں تو کچھ مدت کے لیے کاروبار ضرور جاری رکھا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے کارخانے کو دو طرح پر فایدہ پہنچنے کا قرینہ ہے: ایک تو یہ کہ اصل قایم ضایع ہونے سے بچ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ سرد بازاری کی حالت میں حسبِ سابق کاروبار جاری رکھنے سے کارخانے کا ساکھ یا اعتبار بہت بڑھ جائےگا اور آیندہ مال کی دوبارہ طلب بڑھنے پر کارخانہ اپنے سابقہ نقصان

ی زیادہ آسانی کے ساتھ تلافی کرسکیگا۔ یہی وجہ ہے کہ جن کارخانوں میں اصل قایم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، وہ ناموافق حالات کو زیادہ دیر تک برداشت کرسکتے ہیں کیونکہ ان کے مصارفِ مقدم بمقابل مصارفِ تقسیمی کے بہت کم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جن کارخانوں میں اصل دایر زیادہ ہوتا ہے یعنی جن کے مصارفِ متغیر کی مقدار مقابلۃً زیادہ ہوتی ہے، وہ ناموافق حالات کی بہت کم تاب لاسکتے ہیں۔ لیکن اس بیان سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ بڑے کارخانے اپنے مصارفِ تقسیمی سے ہمیشہ کے لیے یا بہت طویل مدت تک دست بردار ہوسکتے ہیں۔ کوئی کارخانہ خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، بالآخر اپنے تمام مصارف وصول کرنے کی کوشش کریگا۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑی مدت کے لیے تو کسی چیز کی قیمت صرف مصارفِ مقدم کے مساوی ہوسکتی ہے لیکن اگر ایک طویل مدت پیش نظر رکھی جائے تو جو اوسط قیمت دریافت ہوگی وہ یقیناً مصارفِ کلی کے برابر ہوگی۔

چند اصطلاحات:۔ دنیا میں انسان کو جتنی چیزیں مطلوب ہیں انھیں ہم ایک خاص نقطۂ نظر سے دو قسموں میں منقسم کرسکتے ہیں: کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو براہِ راست انسان کی کوئی نہ کوئی احتیاج پوری کرتی ہیں جیسے غذا، لباس، پانی، مکان، قلم، کتاب، وغیرہ۔ ان کے علاوہ اکثر و بیشتر چیزیں ایسی ہیں جن سے

براہِ راست تو کوئی احتیاج پوری نہیں ہوتی۔ لیکن وہ ایسی اشیا کی تیاری میں کام آتی ہیں جو براہ راست کوئی نہ کوئی احتیاج پوری کرسکیں جیسے آٹا، روئی، نل، اینٹ، لکڑی، کاغذ وغیرہ پہلی قسم کی چیزوں کی طلب کو اصطلاح میں طلب بلاواسطہ کہتے ہیں اور دوسری قسم کی چیزوں کی طلب کو طلب بالواسطہ واضح رہے کہ معاشیات کے اکثر اصطلاحات کی طرح ان دونوں میں بھی مکمل تفریق بعض اوقات ناممکن ہوتی ہے مثلاً کاغذ اگر ایک طرف کتابوں کی تیاری میں کام آتا ہے تو دوسری طرف وہ خط لکھنے کی احتیاج کو براہِ راست پورا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں کاغذ کی طلب، طلبِ بالواسطہ کہلائے گی اور دوسری صورت میں طلب بلاواسطہ۔

بلاواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت تو اُنھی اصولوں کے مطابق طے پاتی ہے جنکا ہم سابقہ عنوان میں ذکر کرچکے ہیں لیکن بالواسطہ طلب والی اشیا کی قیمتوں میں چند اور امور کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری میں کئی بالواسطہ طلب والی چیزیں مل کر کام آتی ہیں مثلاً رہنے کے لیے مکان مطلوب ہے لہٰذا اس کی طلب بلاواسطہ ہے لیکن مکان کی تعمیر کے لیے اینٹ، پتھر، مٹی، چونا، لوہا، لکڑی، اور معماروں کی محنت، ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا

ان کی طلب بالواسطہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان اشیا میں سے جو مکان کی تعمیر کے لیے درکار ہیں، کسی ایک شے مثلاً پتھر کی رسد گھٹ جائے تو اُس کی قیمت کن کن صورتوں میں بڑھ سکتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ حالات مفروضہ کے اندر پتھر کی قیمت کا اضافہ مندرجۂ ذیل شرایط کے ساتھ وابستہ ہے :-

(۱) اول یہ کہ بہ مقابل دوسری تمام مطلوبہ چیزوں کے پتھر تعمیر مکان کے لیے بہت زیادہ ناگزیر ہو اور اس کا کوئی بدل مناسب قیمت پر دستیاب نہ ہو سکے۔

(۲) خود مکان کی طلب غیر تغیر پذیر ہو اور اُس کا بھی کوئی موزوں بدل نہ مل سکے۔ تاکہ مکانات گراں ہو جائیں تو اُن کی طلب میں تخفیف نہ ہونے پائے اور نہ ان کا کوئی بدل استعمال میں آسکے۔

(۳) پتھر کی قیمت جملہ اشیائے مطلوبہ کی مجموعی قیمت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہو تاکہ پتھر بہت زیادہ گراں ہونے پر بھی مجموعی مصارف میں بہت تھوڑا اضافہ واقع ہو۔

(۴) پتھر کے علاوہ دوسری چیزیں جو تعمیر مکان کے لیے درکار ہیں مثلاً اینٹ چونا وغیرہ، یہ بہت افراط سے موجود ہوں اور کسی دوسری چیز کی تیاری میں بہت کم کام آسکیں، تاکہ اگر مکانات کی طلب ذرا بھی گھٹے تو ان اشیا کی قیمتیں بہت گر جائیں اور پتھر کی

قیمت میں اضافے کی مزید گنجائش نکل آئے۔

مذکورہ بالا شرائط کو ذہن نشین کر لینے کے بعد بالواسطہ طلب والی اشیا کی قیمتوں کا قانون بہ آسانی سمجھ میں آجائے گا۔ اس قانون کا اصطلاحی نام **قانون طلب بالواسطہ** ہے اور وہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے :۔ "تیار شدہ چیز کی قیمت دوسری بالواسطہ طلب والی چیزوں کی مجموعی قیمت سے جسقدر بڑھ سکے گی اسی قدر شے معلومہ کی قیمت میں اضافہ ممکن ہوگا" مذکورہ بالا مثال میں پتھر کے سوا باقی تمام ضروری اشیا کی مجموعی لاگت سے مکانات کی قیمتیں جسقدر زیادہ بڑھ سکیں گی اسی قدر پتھر کی قیمت میں اضافہ ممکن ہوگا۔

ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ تقریباً ہر بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری میں کئی بالواسطہ طلب والی چیزیں ملکر کام آتی ہیں۔ ایک مثال تو مکان کی پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ بیسیوں اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً قلم، روشنائی اور کاغذ، جن کے بغیر کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔ لیمپ، چمنی، بتی، اور تیل، جن کے بغیر اس خاص قسم کی روشنی نہیں ہوسکتی۔ چکی، چولھا، توا اور ایندھن، جن کے بغیر روٹی نہیں پک سکتی وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں علیحدہ علیحدہ مطلوب نہیں ہوتیں بلکہ اس لیے طلب کی جاتی ہیں کہ وہ سب مل جلکر کسی ایک چیز کی تیاری میں کام آئیں۔ اصطلاح میں ایسی چیزوں کی مجموعی طلب کو **طلب مشترک** کہتے ہیں۔ گویا طلب مشترک مجموعہ ہے کئی بالواسطہ طلبوں کا چونکہ

طلب کے ساتھ
قیمتوں سے

ایسی حالت میں ہر ہر چیز کی طلب
وابستہ ہوتی ہے اس لیے اس کی قیمت بھی
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ہم قانون
سلسلے میں اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

یہ ایک بدیہی واقعہ ہے کہ ایک ایک چیز کئی کئی اشیاء
کام آتی ہے مثلاً لکڑی جس سے میز کرسی، دروازے اور ... پہیے، ریل کے
ڈبے، چھوٹی بڑی کشتیاں، ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ، سیکڑوں چیزیں
تیار کی جاتی ہیں۔ گویا ایک بالواسطہ طلب والی چیز کئی بلاواسطہ طلب
والی اشیا کی تیاری میں کام آتی ہے۔ یہی حال چمڑے کا ہے جس سے
طرح طرح کا چرمی سامان تیار ہوتا ہے۔ لوہے سے بے شمار آہنی
اشیا بنائی جاتی ہیں۔ ربڑ سے ہر روز نئی نئی چیزیں بن بن کر ہمارے
سامنے آتی ہیں۔ غرض ایک ایک چیز کئی کئی شعبوں میں استعمال کی
جاتی ہے اور ہر ہر شعبے سے اس کے لیے ایک جداگانہ طلب جاری
رہتی ہے۔ معاشیات میں ایسی کل طلبوں کے مجموعے کو طلب
مرکب کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کئی چھوٹی چھوٹی طلبوں سے ترکیب پاکر
نمودار ہوتی ہے۔

فرض کرو کہ ان چھوٹی چھوٹی طلبوں میں سے کوئی ایک طلب بہت
زیادہ بڑھ جاتی ہے مثلاً جنگ کے زمانے میں گھوڑوں کے ساز اور
سپاہیوں کے جوتوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور ان کی قیمتیں بہت

بڑھجا... پر انہی چیزوں میں کام آنے لگے گا۔ باقی
... ے سے وہاں بھی وہ بہ تدریج گراں ہو جائیگا
... کسی ایک شعبے میں طلب کم ہو کر قیمت گھٹ جائے تو
... جموں میں رسد زیادہ ہو جانے سے وہاں بھی بہ تدریج قیمتیں
... ت جاتی ہیں

جس طرح کئی چیزیں ملکر ایک چیز تیار کرتی ہیں، اسی طرح کئی چیزیں مل کر ایک ہی چیز سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً غلہ اور بھوسا، کپاس اور بنولہ، گوشت اور چمڑا، وغیرہ وغیرہ، ایسی چیزوں کی مجموعی رسد کو اصطلاح میں رسد مشترک کہتے ہیں کیونکہ کئی چیزیں ایک دوسری کے ساتھ شریک ہو کر اپنی رسد بہم پہنچاتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک یا چند کی رسد حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ بقیہ شرکاء کی رسد بھی حاصل نہ ہو۔
رسد مشترک والی چیزوں کی قیمت کا قانون یہ ہے کہ جب اُن میں سے کسی ایک یا بعض کی قیمتوں میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو باقی شرکا کی قیمتوں میں اس کے برعکس تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔ مثلاً ایک من کپاس سے جو روئی اور بنولے نکلے، ان کی مجموعی قیمت دونوں کے مشترکہ مصارف پیدائش کے لیئے کافی ہونی چاہیئے۔ اب اگر روئی کی طلب بڑھنے سے اس کی قیمت میں اضافہ اور رسد میں زیادتی ہو تو ساتھ ہی بنولے بھی زیادہ مقدار میں پیدا ہو جائیں گے اور یہ زیادہ مقدار فروخت کرنے کے لیئے لازماً بنولوں کی قیمت گھٹانا پڑیگا۔ اس کے برعکس اگر

روئی کی طلب گھٹنے سے اس کی قیمت میں تخفیف اور رسد میں کمی واقع ہو تو ساتھ ہی بنولے بھی کم مقدار میں پیدا ہونے لگیں گے اور رسد گھٹ جانے سے اُن کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔

جس طرح ایک ایک چیز کئی کئی اشیا کی تیاری میں کام آتی ہے اسی طرح کئی کئی اشیا ایک ہی چیز بنانے میں جدا جدا کام آسکتی ہیں مثلاً روٹی گیہوں کی بھی ہوتی ہے اور جوار اور باجرے کی بھی۔ کاغذ چیتھڑوں سے بھی بنتا ہے اور درخت کی چھالوں اور گھاسوں سے بھی۔ ایسی کل چیزوں کی رسد جو کسی چیز کی تیاری میں علحدہ علحدہ کام آسکتی ہیں اصطلاح میں رسد مرکب کہلاتی ہے۔

رسد مرکب والی اشیا میں سے اگر کوئی ایک گراں ہو جائے تو لوگ اُس کی جگہہ دوسری چیزیں استعمال کرنے لگیں گے اور اس طرح طلب گھٹ جانے سے اُس کی قیمت میں اضافہ نہ ہونے پائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی ایک چیز ارزاں ہو جائے تو لوگ اس کے ساتھ والی دوسری چیزوں کو چھوڑ کر اُن کی جگہہ بھی اُسی چیز کا استعمال شروع کردیں گے اور اس طرح طلب بڑھ جانے سے اس کی قیمت میں زیادہ تخفیف نہ ہونے پائے گی۔ رسد مرکب کے مختلف اجزا ایک دوسرے کے مقابلے میں بہ طور بدل کام آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں نہ بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ بہت زیادہ تخفیف قانون بدل کے اثر سے ہر ایک کے اضافے یا تخفیف کا اثر بتدریج سب میں پھیل جاتا ہے

مقابلہ و اجارہ

مقابلہ و اجارہ ۔ تعین شرح قیمت کے جو اصول اوپر بیان کیے گیے ہیں اُن میں ہمیشہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شئے متعلقہ کی پیدائش بہ حالت مقابلہ جاری ہے ۔ یعنی وہ کاروبار کسی خاص شخص کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اُس میں جو چاہے شریک ہو سکتا ہے اور اپنی جانفشانی دیانت داری اور حسن انتظام کی بدولت دوسروں سے بازی لیجا سکتا ہے لہذا ہر شخص جو اس کاروبار میں شریک ہے، یہ کوشش کرتا ہے کہ اسی کے کارخانے کا مال زیادہ فروخت ہو اور اس غرض سے جو جو تدبیریں ضروری اور ممکن ہوں انھیں وقتاً فوقتاً اختیار کرتا رہتا ہے ۔ لیکن ہمیں بہت سے کاروبار ایسے بھی نظر آتے ہیں جنکی یہ حالت نہیں ہے ۔ وہ کسی نہ کسی وجہ سے خاص خاص لوگوں کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگ اُن میں شریک نہیں ہو سکتے ۔ لہذا دریافت طلب امر ہے کہ آیا اس حالت میں بھی قیمت انھی اصول کے مطابق معین ہوتی ہے جنھیں ہم بیان کر چکے ہیں یا اس کے کچھ جداگانہ اصول ہیں ذیل میں ہمیں اسی سوال کا جواب دینا مقصود ہے لیکن قیمت اجارہ کا حال بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجارے کے متعلق کچھ ابتدائی باتیں اور بیان کر دی جائیں لہذا ہم پہلے انھی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

اجارے کی تعریف

اجارے کی تعریف ۔ اجارہ انگریزی لفظ MONOPOLY کا ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں "تنہا بیچنا" لہذا ہر ایسا شخص (یا کئی اشخاص کی متحدہ جماعت) جسے کسی چیز کی جملہ مقدار رسد پر پورا پورا قابو حاصل ہو MONOPOLIST یا اجارہ دار کہلاتا ہے ۔ اجارے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ شئے متعلقہ کی قیمت بر اہ راست اجارہ دار کے اختیار میں رہتی ہے ظاہر ہے کہ قیمت پر ایسا اختیار صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ مقدار رسد پر پورا پورا یا بڑی حد تک تسلط حاصل ہو اگر جملہ مقدار رسد پر قابو حاصل ہے تو وہ اجارۂ کلی کی مثال ہو گی اور اگر کل مقدار رسد پر تو نہیں البتہ اسقدر کثیر مقدار پر تصرف حاصل ہو کہ اُس سے قیمت پر اثر ڈالا

جا سکے تو وہ صورت اُجارۂ جزئی کی ہوگی۔

اجارہ بہتر یا مقابلہ

اجارہ بہتر ہے یا مقابلہ۔ معاشی نقطہ نظر سے اجارہ بہتر ہے یا مقابلہ' اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر طریقے میں کچھ خوبیاں بھی ہیں اور نقایص بھی لہذا کوئی فیصلہ کن جواب صرف اسی وقت دیا جا سکتا ہے جبکہ خود کاروبار کی نوعیت اور دوسرے گوناگون حالات پر پہلے غور کر لیا جائے۔ بلاشبہ مقابلے کے طریقے میں لوگوں کو ترقی کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ حریفوں کی موجودگی کا یہ اثر پڑتا ہے کہ کارخانہ داروں کو اپنے اپنے کاروبار کا بہتر سے بہتر انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ مصارف پیدائش کم رہنے سے وہ اپنی چیز ارزاں فروخت کر سکیں اور ارزانی کی بدولت ان کا مال زیادہ سے زیادہ فروخت ہو۔ جو لوگ در اصل کامیابی کے مستحق ہیں' وہی کامیاب ہوتے ہیں اور عوام کو بھی مطلوبہ چیزیں ارزاں قیمتوں پر ملتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقابلہ کی حالت میں بسا اوقات ضرورت سے زیادہ مال تیار ہو جاتا ہے۔ مختلف حریف ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کے مناسب اور نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں اور ان کے بلکہ گلو تراش کی وجہ سے بسا اوقات سخت تباہی پھیلتی ہے۔ مقابلے کے جوش میں کارخانہ دار صرف خود خسارے میں پڑتے ہیں بلکہ بعض اوقات خریداروں کے بھی نقصان کا باعث ہوتے ہیں مثلاً کبھی تو چیزوں کی

خوبی بچا کر کے ادنی قیمتوں کی کسر نکالی جاتی ہے اور کبھی پچھلے نقصان
کی تلافی کرنے کے لیے بعد ازاں قیمتیں بہت بڑھا دی جاتی ہیں۔

اجارے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انتظام واحد کی
وجہ سے مصارف پیدائش بہت گھٹ جاتے ہیں۔ پیدائش بر پیمانۂ کبیر
کے گوناگوں فواید سے استفادہ کرنے کی بہت زیادہ گنجایش ہوتی ہے
چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ پیدائش کے بعض شعبوں میں جسقدر ارزاں چیزیں اجارے
کی حالت میں ملتی ہیں مقابلے کی حالت میں نہیں ملتیں۔ مال صرف اُسی قدر
بنایا جاتا ہے جسقدر کہ بازار کو مطلوب ہو۔ مقدار طلب و مقدار رسد کی
عدم مطابقت کی وجہ سے کبھی سرد بازاری اور کبھی گرم بازاری کی جو حالت
اکثر پیدا ہوتی رہتی ہے وہ اجارے میں ممکن نہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ اندیشہ
بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں اجارہ دار اپنے بیشتر منافع کی خاطر
خریداروں کے مفاد کو نظر انداز نہ کردے۔ مزید براں مقابلے کی عدم موجودگی
کی وجہ سے اجارہ داروں کو کاروبار کا انتظام ٹھیک رکھنے کی چنداں
فکر نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصارف پیدائش بڑھ جاتے اور چیزیں
گراں ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہی کیا کم خرابی ہے کہ کسی کاروبار کا
فایدہ چند خاص افراد کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور عوام اس سے
محروم رہیں۔

اجارے کی قسمیں

اجارے کی قسمیں۔ اجارہ کئی طرح پر حاصل ہو سکتا ہے چنانچہ
اسی بنا پر اس کی مختلف قسمیں قرار دی گئی ہیں جنھیں ہم ذیل میں بیان

کرتے ہیں :-

(۱) قانونی اجارے : یہ وہ اجارے ہیں جو بادشاہ یا حکومت کی جانب سے خاص خاص اشخاص یا جماعتوں کو عطا کیے جاتے اور قانون کی حمایت سے قایم رہتے ہیں۔ مثلاً ملکہ الیزابتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو خاص طور پر یہ حق عطا کیا تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان اور بعض دوسرے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرے۔ اگر کوئی اور برطانوی باشندہ یا جماعت اس تجارت میں مداخلت کرتی تو وہ ازروے قانون بازپرس اور سزا کی مستوجب ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے میں حکومتیں جو کثرت سے حقوق تالیف وحقوق ایجاد عطا کرتی ہیں وہ بھی قانونی اجارے ہیں جنکا منشا یہ ہے کہ لوگوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں غور وفکر کر کے نئی نئی باتیں دریافت کرنے کی ترغیب ہو۔ جن لوگوں کی معاش کا ذریعہ ہی تصنیف وتالیف اور نئی نئی باتیں دریافت کرنا ہو وہ حق تالیف وحق ایجاد کے قوانین کے بغیر کیونکر اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرسکتے ہیں۔

(۲) قدرتی اجارے : بعض کاروبار اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ انھیں انتظام واحد کے تحت قایم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی میں انکے مصارف پیدائش کم سے کم ہوتے ہیں اور عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ کاروبار بالعموم ایسی خدمات سے متعلق ہوتے ہیں جنکی سربراہی کے لیے سرکاری سڑکیں کھودنی اور عوام سے جبری خرید کے

طریقے پر زمینیں حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ آبرسانی، برقی قوت کی سربراہی، ریلوے اور ٹریموے، اس قسم کے کاروبار کی مثالیں ہیں۔ ان خدمات کی سربراہی کے لیے مقابلے کا طریقہ تجربے سے نہایت تکلیف دہ اور گراں ثابت ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام ممالک میں ایسے کاروبار یا تو کسی اجارہ دار کمپنی کے سپرد کر دیے جاتے ہیں یا خود بلدیے اور حکومتیں انھیں اپنے طور پر چلاتی ہیں بعض اوقات سیاسی مصلحتوں کی بنا پر حکومتیں ایسے کاروبار کا خود ہی انتظام کرتی ہیں مثلاً ڈاکخانہ، تاربرقی، ٹیلیفون، اور سکہ سازی کی خدمتیں ہر جگہ حکومت ہی کے توسط سے حاصل ہوتی ہیں۔ ریلیں بھی اکثر ممالک میں حکومت ہی کے انتظام سے چلتی ہیں۔ اور جہاں وہ کمپنیوں کے سپرد کی بھی جاتی ہیں وہاں اُن کے کاروبار پر سخت نگرانی اور ان کے خاص خاص معاملات میں حکومت کا کافی اثر قایم رکھا جاتا ہے تاکہ اجارہ دار اپنے ذاتی منافع کی خاطر حکومت اور عوام کے مفاد کو نظر انداز نہ کر دے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا تمام اجارے بھی درحقیقت قانونی اجارے ہیں کیونکہ وہ قانون ہی کے ذریعہ سے وجود میں آتے اور اسی کی سرپرستی میں جاری رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ بہ لحاظ اپنی نوعیت کے اجارے کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں اس لیے انھیں قدرتی اجاروں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(۳) صنعتی اجارے: یہ وہ اجارے ہیں جو بغیر حکومت کی امداد کے دوران کاروبار میں خود بخود قایم ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو اُس صورت میں نمودار ہوتے ہیں جبکہ شے متعلقہ کی رسد اسقدر محدود ہو کہ کوئی ایک کارخانہ اُس پر بہ آسانی قابض ہو سکے (گو ایسی مثالیں بہت ہی کمیاب ہیں) یا اُس حالت میں جبکہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوایہ بہت زیادہ غالب ہوں۔ یہ آخری صورت خاصکر اس زمانے میں بہت عام ہے۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر کے گوناگوں فوایداور کفایتوں کی وجہ سے کمزور حریف آہستہ آہستہ میدان سے ہٹ جاتے ہیں اور سارا کاروبار چند زبردست کارخانوں کے قبضہ میں آجاتا ہے۔ کچھ مدت تک یہ کارخانے ایک دوسرے کے خلاف طاقت آزمائی جاری رکھتے ہیں لیکن جلد ہی یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ بجائے رقابت کے باہمی اتحاد ان سب کے حق میں زیادہ مفید ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ متعدد کارخانے ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بہت بڑا کارخانہ قایم ہو جاتا ہے جسے اُس شعبے کے اندر نہایت زبردست اجارہ حاصل رہتا ہے۔ جن اصولوں پر مختلف کارخانے اجارہ قایم کرنے کی غرض سے ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں، وہ بہت ہی گوناگوں اور پیچیدہ ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے وہ مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ چنانچہ جرمنی کے کارٹل اور امریکہ کے ٹرسٹ (Trusts) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ پول (Pools) کارپوریشن (corporations)، رِنگ (rings)،

کارٹلز ( ) چند اور نام ہیں جو اسی قسم کی متحدہ جماعتوں کے لیے تھوڑے تھوڑے فرق سے استعمال کیے جاتے ہیں تنقیص

(۴) مالی اجارے : یہ در حقیقت صنعتی اجارے ہیں جو حکومتیں خاصکر اس غرض سے قایم کرتی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے آمدنی پیدا کریں۔ یوں تو قدرتی اجاروں سے بھی بنا اذنات حکومتوں کو کافی آمدنی ملجاتی ہے۔ لیکن وہاں اصلی منشا حصول آمدنی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مالی اجارے کی غرض و نہایت بجز آمدنی بڑھانے کے اور کچھ نہیں گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ منجملہ دیگر محاصل کے مالی اجارے کی آمدنی بھی ایک قسم کا ٹکس یا محصول ہے۔ ہندوستان میں نمک اور افیون کے محکمے مالی اجارے کی موزوں مثالیں ہیں۔ اسی طرح جاپان میں کافور اور فرانس میں تمباکو کے مالی اجاروں سے حکومت آمدنی حاصل کرتی ہے

قیمت اجارہ

قیمتِ اجارہ۔ نظریۂ قیمت کی بحث میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ بہ حالت اجارہ قیمت رسد مصارف پیدایش کے مساوی نہیں بلکہ بالعموم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قیمت کی یہ زیادتی صرف اس وجہ سے ممکن ہے کہ اجارہ دار کو مقدار رسد پر کم و بیش مکمل قابو حاصل رہتا ہے۔ مقدار رسد میں حسب منشا کمی بیشی کرکے وہ قیمت کو بالکل اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ اب ہمیں دریافت کرنا ہے کہ اجارہ دار اپنا یہ غیر معمولی اختیار کس طریقے پر استعمال کرتا ہے بہ الفاظ دیگر وہ کس اصول کے مطابق اپنی پیداوار کی قیمت

معین کرتا ہے۔

ہر کاروباری شخص کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے اپنے کاروبار سے کثیر منافعہ حاصل ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو جو تدبیر اس سے ممکن ہو، وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ اجارہ دار بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ بلکہ اجارے کا تو خاص مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جو منافع بہ حالت مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں تھا، وہ اب باطمینان حاصل کیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اجارہ دار کی یہ خواہش پوری کیونکر ہوتی ہے۔ کیا مقدار رسد کو گھٹا گھٹا کر قیمت میں متواتر اضافہ کرنے سے کثیر ترین منافعہ حاصل ہونا یقینی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قابل برداشت اضافہ قیمت کی بھی ایک حد ہے۔ اگر اجارہ دار زیادہ منافع کی لالچ میں قیمت بہت بڑھا دے تو کیا عجب ہے کہ طلب میں بہت زیادہ تخفیف ہو جائے اور بہ حیثیت مجموعی اجارہ دار کا منافع بجائے بڑھنے کے اور گھٹ جائے۔ پس معلوم ہوا کہ منافع کا مدار محض اضافۂ قیمت پر نہیں ہے بلکہ وہ مقدار فروخت سے بھی بہت بڑی حد تک وابستہ ہے۔ اگر قیمت تو بہت زیادہ ہو لیکن مقدار فروخت کم تو بہ حیثیت مجموعی زیادہ منافع ملنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر کم قیمت پر بہت زیادہ مال فروخت ہو تو ایسی حالت میں بسا اوقات خوب منافع ملتا ہے۔ چنانچہ اجارہ دار بھی مختلف قیمتوں پر اپنا مال فروخت کرکے یہ تجربہ کر لیتا ہے کہ کس قیمت پر

اس کا مجموعی منافع کثیر ترین ہوگا اور بالآخر وہی قیمت مقرر کر دیتا ہے۔
فرض کرو کہ بلدہ حیدرآباد میں دیاسلائی کا ایک زبردست اجارہ قایم ہوتا ہے اور کثیر ترین منافع کی صورت کا پتا لگانے کے لیے اجارہ دار دیاسلائی کی قیمت میں کمی بیشی کرتا ہے اور اس طرح جو تجربہ اُسے حاصل ہوتا ہے، وہ حسب ذیل ہے :-

قیمت فی ڈبیہ	طلب	آمدنی خام	لاگت فی ڈبیہ	مجموعی لاگت	حاصل اجارہ
۲ پیسے	۱۰۰۰۰ ڈبی	۲۰۰۰۰ پیسے	۱ پیسہ	۱۰۰۰۰ پیسے	۱۰۰۰۰ پیسے
۳ "	۸۰۰۰ "	۲۴۰۰۰ "	۱ ۱/۴ "	۱۰۰۰۰ "	۱۴۰۰۰ "
۴ "	۶۲۰۰ "	۲۴۸۰۰ "	۱ ۱/۲ "	۹۳۰۰ "	۱۵۵۰۰ "
۵ "	۴۶۰۰ "	۲۳۰۰۰ "	۱ ۳/۴ "	۸۰۵۰ "	۱۴۹۵۰ "
۶ "	۳۵۰۰ "	۲۱۰۰۰ "	۲ "	۷۰۰۰ "	۱۴۰۰۰ "
۷ "	۲۰۰۰ "	۱۴۰۰۰ "	۲ ۱/۴ "	۴۵۰۰ "	۹۵۰۰ "
۸ "	۱۲۰۰ "	۹۶۰۰ "	۲ ۱/۲ "	۳۰۰۰ "	۶۶۰۰ "

مندرجہ بالا مثال کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دیاسلائی کی قیمت فی ڈبیہ ۸ پیسے مقرر کی جاے تو اُس صورت میں لاگت فی ڈبیہ صرف ۲ ۱/۲ پیسے ہوتی ہے اور اس طرح اجارہ دار کو دیاسلائی کی ایک ایک ڈبیہ پر ۵ ۱/۲ پیسے منافع ملتا ہے جو کسی اور قیمت پر

نہیں ملتا۔ لیکن اس قیمت پر مقدار فروخت صرف ۱۲۰۰ ڈبی رہجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مجموعی منافع ۶۶۰۰ پیسے تھا ہے حالانکہ باقی تمام صورتوں میں مجموعی منافع اس سے زیادہ ہے۔ اب اجارہ دار کو جس چیز سے سروکار ہے، وہ مقدار منافع فی ڈبیہ نہیں بلکہ مجموعی منافع ہے لھذا وہ کوئی ایسی قیمت مقرر کرے گا جس پر اُس کا مجموعی منافع بیشترین ہو۔ مندرجہ بالا مثال میں یہ قیمت ۴ پیسے فی ڈبیہ ہے۔ اگرچہ اس حالت میں منافع فی ڈبیہ صرف ڈھائی پیسے ہے لیکن چونکہ وہ چار پیسے کے حساب سے ۴۸۰۰ ڈبیاں فروخت کرتا ہے اس لیے بہ حیثیت مجموعی اسے ۱۵۵۰۰ پیسے منافع ملتا ہے جو کسی اور صورت میں نہیں مل سکتا۔

مختصر یہ کہ اجارے کی حالت میں قیمت طلب اور قیمت رسد برابر نہیں ہوتی بلکہ بالعموم قیمت طلب قیمت رسد سے بڑی رہتی ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہوتا ہے، اسے اصطلاح میں ماحصل اجارہ کہتے ہیں۔ اور اجارہ دار وہی قیمت مقرر کرتا ہے جس پر اسے بیشترین ماحصل اجارہ ملے۔

(نوٹ) غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ گو اجارہ دار کو مقدار رسد اور قیمت دونوں پر بہت کچھ اختیار حاصل ہوتا ہے تاہم یہ اختیار کسی طرح غیر محدود نہیں ہے۔ کیونکہ جونہی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، طلب میں تخفیف ہونے لگتی ہے اور اس کی وجہ سے مقدار فروخت گھٹ جاتی

ہے۔ اور مقدارِ فروخت کا مجموعی منافع پر جو اثر پڑتا ہے، وہ مذکورہ بالا امثال سے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسقدر کسی چیز کی طلب غیر تغیر پذیر ہوگی اسی قدر اجارہ دار کا قابو اور زیادہ مضبوط ہوگا کیونکہ جو چیز ناگزیر ہوتی ہے، لوگ اُس کی قیمت کا اضافہ مجبوراً بہت زیادہ برداشت کرتے ہیں۔

مصارف پیدائش

شئے متعلقہ کی تغیر پذیری کے علاوہ اجارہ دار کو ایک بات اور پیش نظر رکھنی پڑتی ہے۔ مقدار رسد پر قابو حاصل رہنے کی وجہ سے جب وہ اپنی پیداوار گھٹائیگا تو ظاہر ہے کہ اس کے مصارف پیدائش فی شئے اسی حالت پر نہیں رہیں گے بلکہ وہ بہ مقابل پیشتر کے کم یا زیادہ ہوجائینگے۔ اگر شئے متعلقہ کی پیدائش قانونِ تکثیر حاصل کے تابع ہو (یعنی جوں جوں مقدارِ پیداوار میں اضافہ ہو مصارف پیدائش فی شئے کم ہوتے جائیں) تو مقدار پیداوار گھٹانے سے مصارف پیدائش فی شئے بڑھ جائیں گے اور اجارہ دار کو اپنے اجارے کی بدولت جو حاصل زاید حاصل ہوتا، وہ کسیقدر گھٹ جائیگا۔ لیکن اگر کاروبار تقلیل حاصل کے تابع ہو تو مقدار پیداوار کم کرنے سے مصارفِ پیدائش فی شئے بہ مقابل پیشتر کے کم ہوجائیں گے اور اجارہ دار کا حاصل زاید اور بھی بڑھ جائیگا۔ پس اجارہ دار کے نقطۂ نظر سے بیشترین فایدے کی صورت یہ ہے کہ شئے متعلقہ کی طلب غیر تغیر پذیر ہو اور اس کی پیدائش قانون تقلیلِ حاصل کے تابع ہو۔ چنانچہ اشیائے خوراک

کی بالعموم یہی حالت ہے۔ مگر خریداروں کے نقطۂ نظر سے یہ صورت انتہا درجے مضر ہے یہی وجہ ہے کہ جب کبھی غلے کا کوئی اجارہ قایم ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ پس عوام کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے، صرف انہی اشیا کے اجارے جائز قرار دے جائیں جن کی طلب تغیر پذیر ہو اور جو قانون تکثیر حاصل کے تابع ہوں۔ کیونکہ تکثیر حاصل کی بدولت مقدار رسد زیادہ گھٹانے کی گنجایش نہ رہے گی اور تغیر پذیری طلب کی وجہ سے بجائے اضافۂ قیمت کے تخفیفِ قیمت کی طرف زیادہ ترغیب ہوگی یہی وجہ ہے کہ مصنوعات بہ مقابل زرعی پیداوار کے اجارے کے لئے زیادہ موزوں خیال کی جاتی ہیں۔

اشیاء
- کمی بیشی مقدار ناممکن (۱)
- کمی بیشی مقدار ممکن
  - بلحاظ مقابلہ
    - قلیل مدت کے اندر (۲)
    - طویل مدت کے اندر (۳)
  - بلحاظ اجارہ (۴)

چھٹا باب

مبادلۂ دولت کے انتظامات

(زر۔ اعتبار۔ بنک)

زر
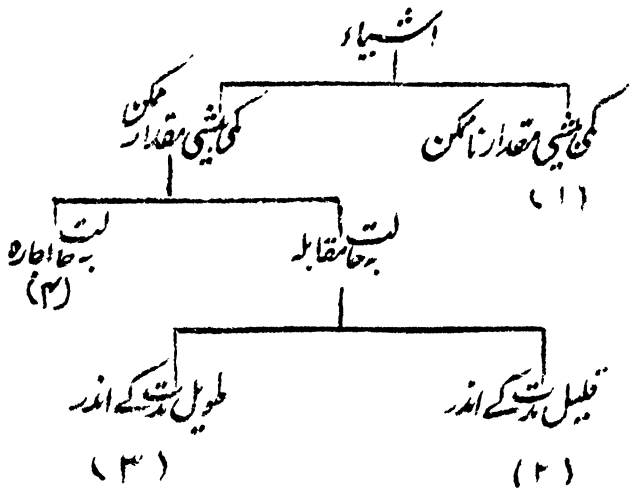
زر کا مفہوم

زر کا مفہوم۔۔ مبادلے کی ضرورت کے عنوان میں ہم تقسیم عمل اور مبادلۂ دولت کا قریبی تعلق واضح کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ انسانی معاشرت کے ابتدائی مدارج میں لوگ خرید وفروخت کے طریقے سے ناواقف تھے اور مبادلۂ دولت کا جو تھوڑا بہت کاروبار اس زمانے میں ہوتا تھا، وہ بہ طریق بارٹر انجام پاتا تھا یعنی ہر شخص اپنی کوئی چیز دیکر اُس کے عوض دوسرے سے اپنی مطلوبہ چیز حاصل کرتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں انسان کی ضروریات بہت محدود تھیں اور معاشی کاروبار بہت ہی ادنی حالت میں تھے لہذا بارٹر کے ذریعے سے کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا تھا لیکن ایک ایسی جماعت میں جو معاشی نقطۂ نظر سے ذرا بھی ترقی یافتہ حالت میں ہو، اس طریقے پر قطعاً عمل نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ تاریخ سے پتا

چلتا ہے کہ جوں جوں تقسیم عمل میں ترقی اور انسانی ضروریات میں توسیع ہونے لگی، بارٹر کی ناگزیر خرابیاں روز بروز نمایاں ہونے لگیں اور وہ بہ تدریج متروک ہو کر اُس کی جگہہ خرید و فروخت کا رواج خود بخود پھیلنے لگا۔

بارٹر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جب تک فریقین مبادلہ کی ضروریات ٹھیک ٹھیک ایک دوسرے کے مطابق نہ ہوں، اس کے ذریعے سے لین دین نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہارمونیم دیکر اُس کے عوض میں سنگر مشین لینا چاہے تو اُسے ایک ایسا شخص تلاش کرنا پڑیگا جس کے پاس اول تو سنگر مشین موجود ہو، دوسرے وہ اپنا مشین علحدہ کرنے پر آمادہ ہو، تیسرے اُسے ہارمونیم کی ضرورت بھی ہو۔ اس تلاش میں اپنے اپنا ہارمونیم نہ معلوم کہاں کہاں اور کب تک لیے لیے پھرنا پڑیگا ہر جا لگانہ لین دین کے لئے اس قسم کی تلاش کسقدر باعث طوالت اور دقت طلب ثابت ہوگی، وہ محتاج بیان نہیں۔ بارٹر کی دوسری بڑی خرابی اُن اشیا کے لین دین میں محسوس ہوتی ہے جن کے حصّے نہیں کیے جا سکتے۔ فرض کرو کہ ایک شخص گھوڑا دیکر معاوضے میں بکریاں لینا چاہتا ہے۔ اب ایک گھوڑے کے عوض میں جتنی بکریاں مل سکتی ہیں، در اصل اتنی بکریوں کی اُسے ضرورت نہیں ہے لیکن چونکہ گھوڑا کئی حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اُسے مجبوراً اپنی ضرورت سے زیادہ بکریاں لینی پڑیں گی۔ بارٹر کی تیسری خرابی یہ ہے کہ مختلف اشیا کے مبادلوں کے مابین اس کے ذریعے سے کوئی تعلق

قایم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اگر ایک سیر چاول پانچ سیر دودھ کے عوض اور دس سیر گیہوں ایک عمدہ کمبل کے عوض حاصل ہوں تو ان واقعات سے چاول اور گیہوں، کمبل اور دودھ، چاول اور کمبل، گیہوں اور دودھ، ان اشیا کی شرح مبادلہ کا قطعاً کوئی حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر ان تمام چیزوں کا صرف کسی ایک چیز سے مبادلہ ہو سکتا تو پھر یہ دقت پیش نہ آتی اور ہر ایک کی باہمی شرح مبادلہ کا بہ آسانی پتا لگا لیا جاتا۔

بارٹر کی انہی گوناگوں خرابیوں کی وجہ سے بہ تدریج زر کا رواج شروع ہوا۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ زمانہ قدیم کے باشندوں نے ان دقتوں سے بچنے کے لیے خاص سوچ بچار کرکے بارٹر کا طریقہ ترک اور زر کا استعمال شروع کیا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر مقام پر دو ایک چیزیں ایسی ہوتی تھیں جن کا ہر شخص خواہشمند ہوتا تھا اور انھیں دوسری تمام اشیا کے مبادلے میں قبول کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا تھا کیونکہ ہر شخص یہ جانتا تھا کہ یہ چیزیں اس کی جماعت میں اسقدر مقبول ہیں کہ اگر وہ کسی وقت اس کے پاس زاید از ضرورت مقدار میں جمع ہو جائیں تو وہ انھیں دوسری مطلوبہ چیزوں کے معاوضے میں آسانی علیحدہ کر سکے گا۔ اب جو چیز بھی کسی مقام کے باشندوں میں محض اپنی وجہ سے نہیں بلکہ مبادلے کے اغراض کے لیے اس طرح عام طور پر مقبول ہو جاسے، وہی "زر" ہے تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سیپیاں، کھالیں، چوپایے، تمباکو اور مختلف

قسم کی دھاتیں یہ سب چیزیں مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بطور زر کے استعمال ہو چکی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ زر کے فرایض انجام دینے کے لیے موزوں نہیں تھیں اس لیے جوں جوں زیادہ موزوں اشیاء دستیاب ہونے لگیں اُن کا استعمال بہ طور زر کے متروک ہوتا گیا لہذا ہم اولاً یہ معلوم کریں گے کہ آجکل زر سے کیا کیا کام لیے جاتے ہیں اور بعد ازاں یہ دریافت کریں گے کہ ان کاموں کو بہ خوبی انجام دینے کے لیے کسی چیز میں کیا کیا صفات موجود ہونی چاہئیں۔

زر کے کام

زر کے کام۔ سابقہ عنوان میں ہم بارٹر کی گوناگوں دقتوں کا حال بیان کر چکے ہیں۔ انہی دقتوں کو رفع کرنا زر کا سب سے بڑا کام ہے زر چونکہ بطور آلۂ مبادلہ کے استعمال ہوتا ہے اس لیے اب فریقین مبادلہ کی ضروریات میں مطابقت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنا مال زر کے عوض میں فروخت کرتا ہے کیونکہ اُسے یقین ہے کہ اسی زر سے وہ اپنی مطلوبہ اشیا جس وقت چاہے گا خرید سکے گا۔ جب کسی جماعت میں اس طرح کا اعتماد قایم ہو جاتا ہے اور مبادلات میں کوئی ایک چیز عام طور پر مقبول ہو جاتی ہے تو پھر تقسیم عمل کے گوناگوں فواید سے مستفید ہونے کی خوب گنجایش نکل آتی ہے۔ مزید براں ناقابل تقسیم اشیا کے مبادلے میں بھی کوئی دقت باقی نہیں رہتی

زر کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ پیمانۂ قدر کا فرض انجام دے تاکہ بارٹر کی تیسری خرابی بھی رفع ہو جائے۔ چونکہ ہر چیز کی قدر کا تخمینہ زر کی

شکل میں کیا جاتا ہے اس لیے مختلف اشیا کی باہمی قدر کا بہ آسانی موازنہ
کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر چائے کی قیمت ۲ روپے فی پونڈ کافی کی ڈیڑھ
روپیہ فی پونڈ اور شکر کی ۴ آنے فی پونڈ ہو تو ہم بڑی سہولت کے ساتھ
یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۴ پونڈ کافی ۳ پونڈ چائے کے برابر ہے۔ ایک پونڈ
چائے ۸ پونڈ شکر کے، اور ایک پونڈ کافی ۶ پونڈ شکر کے مساوی ہے۔

زر کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ ذخیرۂ قدر بھی ہو یعنی ہم اس کے ذریعے
سے اپنی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک وقت سے دوسرے
وقت میں منتقل کر سکیں۔ اگر زر کا رواج نہ ہو تو ہر مسافر کو نہ معلوم کیا کیا چیزیں
کس کس مقدار میں اپنے ساتھ رکھنی پڑیں گی تاکہ وہ دورانِ سفر میں انھیں
دیگر معاوضے میں حسبِ ضرورت غذا وغیرہ حاصل کر سکے۔ بہ حالاتِ موجودہ
اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ روانہ ہونے سے قبل اپنا مال فروخت
کر کے اس کے معاوضے میں زر حاصل کر سکتا ہے اور اس ذخیرۂ قدر کو
لیکر دنیا کے جس حصّے کا چاہے، سفر کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنی
کمائی ہوی دولت فوراً خرچ کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کا کچھ حصّہ آیندہ
ضروریات کے خیال سے پس انداز کرنا چاہتے ہیں وہ اسے زر کے
عوض فروخت کر کے جتنی مدت کے لیے چاہیں اس کا ذخیرہ
کر لیتے ہیں۔ کیونکہ زر کو رکھنے کے لیے نہ تو زیادہ جگہ درکار ہوتی ہے
نہ اس کی حفاظت زیادہ اہتمام طلب ہوتی ہے اور نہ اس کے سڑنے
گلنے، زنگ آلود ہونے یا قدر کھو بیٹھنے کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔

زر کی خصوصیات

زر کی خصوصیات۔۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بارٹر کا طریقہ متروک ہونے کے بعد سے اب تک متعدد چیزیں بہ حیثیت زر کے استعمال ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کھالیں، سیپیاں، غلہ، لوہا، غلام، ہاتھی دانت، روغن زیتون اور طرح طرح کی دوسری چیزیں مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں آلہ مبادلہ اور پیمانہ قدر کا کام دے چکی ہیں۔ لیکن آج کل دنیا کے اکثر و بیشتر حصے میں صرف دو دھاتیں یعنی سونا اور چاندی اس مقصد کے لئے بہت زیادہ مستعمل ہیں۔ البتہ بعض کم قدر دھاتیں مثلاً نکل، کانسہ وغیرہ چھوٹی چھوٹی مالیت کے سکے بنانے میں کام آتی ہیں۔ ذیل میں ہم یکے بعد دیگرے اُن تمام خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جن کی موجودگی ہر ایسی چیز میں لازمی ہے جسے بہ حیثیت زر کے استعمال کرنا مقصود ہو۔ ان خصوصیات کا علم ہونے کے بعد ہم خود بہ خود محسوس کریں گے کہ کیوں دنیا کے تمام مہذب ممالک نے آج کل باہمی رضامندی سے سونے اور چاندی کو زر کے مذکورہ بالا فرائض انجام دینے کے لیے خاص طور پر منتخب کر لیا ہے:۔

(ا) جس چیز سے زر کا کام لینا مقصود ہو، اس میں سب سے پہلے کچھ نہ کچھ ذاتی قدر بھی موجود ہونی چاہیئے یعنی علاوہ زر کا کام کرنے کے وہ کوئی اور احتیاج بھی پوری کر سکے مثلاً سونے اور چاندی کے نہ صرف سکے تیار کیے جاتے ہیں بلکہ اُن سے طرح طرح کے زیورات اور برتن بھی بنائے جاتے ہیں۔ جس چیز کی اپنی کوئی ذاتی قدر نہ ہوگی، وہ نہ لوگوں میں عام طور پر مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اس سے آلہ مبادلہ کا کام لیا جا سکتا ہے

۱۔ قدر ذاتی
۲۔ ہمہ پذیری
۳۔ آسانی نقل
۴۔ ... پذیری
۵۔ یکرنگی
۶۔ ... پذیری
۷۔ ثبات قدر
۸۔ شناخت پذیری

(ب) زر کی دوسری ضروری صفت یہ ہے کہ وہ دیرپا ہو۔ میوے پھول یا ترکاریاں کبھی بہ حیثیت زر کے استعمال نہیں کی جاسکتیں کیونکہ سریع الزوال ہونے کی وجہ سے نہ انھیں پس انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ ذخیرۂ قدر کا کام انجام دے سکتی ہیں۔

(ج) زر ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل ہوسکے۔ یہ صفت صرف انہی چیزوں میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے جن کی قدر ان کے وزن اور جسامت کا لحاظ کرتے ہوئے کافی بلند ہو۔ مثلاً اینٹ، پتھر یا کوئلے سے زر کا کام نہیں لیا جاسکتا کیونکہ ان چیزوں کی بڑی بڑی مقداریں بہت تھوڑی قدر کے قائم مقام ہوتی ہیں اور اس وجہ سے اُن کا دست بدست گھومنا نہایت دقت طلب ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی چیز کی بہت ہی تھوڑی مقدار میں بہت زیادہ قدر جمع ہوجائے مثلاً ہیرے، جواہرات وغیرہ تو وہ بھی زر کے اغراض کے لیے موزوں نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسی چیز دست بدست گھومنے میں بہ آسانی گم ہوسکتی ہے۔

(د) یک جنسی بھی زر کے لیے بہت ضروری ہے۔ جو چیزیں بہ لحاظ اپنی خوبی کے یکساں نہیں ہوتیں، وہ زر کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ مثلاً گیہوں کئی قسم کا ہوتا ہے اور اس کی مختلف قسموں میں فوراً تمیز کرلینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ مزید برآں اگر اعلیٰ اور ادنیٰ قسم کے گیہوں ملادیے جائیں تو آسانی سے اس کا پتا نہیں لگ سکتا۔ سونے اور چاندی کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ دھاتیں خواہ دنیا کی کسی کان سے نکلیں اُن کی خوبی

ہیں قریب قریب مکمل یکسانیت پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے اگر ان میں ذرا بھی آمیزش کردی جائے تو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اُسے بغیر کسی خاص دشواری کے پہچان لیتا ہے۔

(۵) سہم پذیری بھی زر کی ایک ناگزیر خصوصیت ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جو چیز بطور زر کے استعمال کی جائے وہ کئی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو سکے۔ اور اس تقسیم کا اس کی مالیت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے جو پایے اسی صفت کی عدم موجودگی کی وجہ سے زر کے اغراض کے لیے ازحد غیر موزوں ہیں۔

(۶) ثبات قدر کی صفت زر کے لیے نہایت اہم اور لازمی ہے کیونکہ جو چیز اس صفت سے محروم ہوگی، وہ پیمانۂ قدر کا کام نہیں دے سکتی ہم جانتے ہیں کہ جس طرح گز طول کا اور سیر وزن کا پیمانہ ہے اسی طرح زر بھی قدر کا پیمانہ ہے اور ہر پیمانے کے لیے معین ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ایک غیر معین پیمانے کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔ اگر گز کبھی بڑھکر ۴۰ انچ کا ہو جائے اور کبھی گھٹ کر صرف ۳۰ انچ کا رہجائے تو لوگ ایسے گز پر بھروسہ کرکے کوئی کاروبار نہیں کرسکتے بلکہ ہر جداگانہ معاملے کے وقت اُنھیں قبل از قبل گز کا طول دریافت کرلینا ضروری ہوگا۔ اسی طرح اگر روپیہ کی قدر معین نہ ہو یعنی اس کے عوض میں دوسری اشیا کبھی زیادہ مقدار ملے اور کبھی کم تو لوگ ایسے روپے سے اطمینان کے ساتھ لین دین نہیں کرسکتے۔ زر کی یہ قابلیت کہ

اس سے دوسری اشیا خریدی جا سکتی ہیں اصطلاح میں اس کی قوت خرید کہلاتی ہے اور قوتِ خرید کا مدار بہت بڑی حد تک زر کی مقدار پر ہوتا ہے۔ چونکہ زر کی قوتِ خرید کا کم و بیش معین رہنا ضروری ہے، لہذا اس کے لیے صرف وہی چیزیں موزوں ہو سکتی ہیں جن کی رسد میں جلد جلد بڑے بڑے تغیرات واقع نہ ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی سونا اور چاندی ہی زر کے لیے بہت زیادہ موزوں ہیں۔ کیونکہ ان کی رسد میں جلد جلد بڑے بڑے تغیرات واقع نہیں ہوتے۔ خاصکر سونے کی جو مقدار سال بہ سال مختلف کانوں سے نکلتی رہتی ہے، وہ سالہا سال کی جمع شدہ مقدار موجودہ کے مقابلے میں اسقدر قلیل ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے سونے کی مجموعی رسد پر کوئی قابلِ لحاظ اثر نہیں پڑتا اور نہ سونے کے بنے ہوئے زر کی قوت خرید میں کوئی نمایاں فرق پیدا ہوتا ہے لیکن اگر کوئی طویل مدت پیش نظر رکھی جائے تو سونے چاندی کے سکے بھی بہ مقابل پیشتر کے کچھ نہ کچھ کم مقدار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی قوت خرید بھی بمقابل پیشتر کے گھٹ جاتی ہے۔

(ز ا) شناخت پذیری۔ زر کے لیے صرف وہی چیزیں موزوں ہو سکتی ہیں جن کی خوبی بدیہی طور پر نمایاں ہو اور معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی بغیر کسی دشواری کے اس کو پہچان سکے۔ اگر یہ صفت موجود نہ ہو گی تو بد دیانت اشخاص کوئی اور کم قدر چیز جو زر سے مشابہت رکھتی ہو پیش کر کے خوب فایدہ کمائیں گے۔ اور لوگ ہمیشہ زر کی خوبی پر کھنے پر

پر کھنے

مجبور رہوں گے۔ سکہ سازی کا رواج دراصل اسی ضرورت سے شروع ہوا کیونکہ سکے کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہے کہ حکومت اُس کی خوبی اور اس کے مقررہ وزن کی ضامن ہوتی ہے۔

سکوں کا

سکوں کا استعمال۔ - اگرچہ سکہ سازی کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے تاہم اس فن نے جو ترقی موجودہ زمانے میں کی ہے اور اس کا جو عظیم الشان اور باقاعدہ اہتمام آجکل نظر آتا ہے، وہ اس سے پہلے کہیں موجود نہ تھا۔ جب سونا اور چاندی بہ طور زر کے استعمال ہونے لگے تو اولاً ان کے چھوٹے بڑے ٹکڑے کاٹ لیے جاتے تھے جو بہ لحاظ اپنے وزن کے مستعمل ہوتے تھے۔ چنانچہ انگریزی پونڈ کا نام دراصل اسی قدیم رواج کی یادگار ہے کیونکہ ابتداً اس سے ایک پونڈ یعنی آدھ سیر کے ہم وزن چاندی مراد لی جاتی تھی۔ آجکل یہ طریقہ صرف بعض پسماندہ ممالک میں نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ دھات کے ان ٹکڑوں کو ہر مبادلے کے وقت تولنا اور جانچنا پڑتا تھا۔ اس طرح بار بار تولنے اور جانچنے میں جو وقت ضایع ہوتا تھا وہ آجکل کے ترقی یافتہ زمانے میں ناقابل برداشت ہے۔ چنانچہ اسی دقت کو رفع کرنے کے لیے سکہ سازی کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ یعنی ایک خاص خوبی کی دھات لیکر اس سے کثیر تعداد میں ہموزن اور ہم شکل ٹکڑے تیار کیے جانے لگے جو اصطلاح میں سکے کہلاتے ہیں اور بجاے اس کے کہ دھات کے مختلف چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو بار بار تولا اور جانچا جائے، ان سکوں کا محض شمار کر لینا کافی

ہونے لگا۔ ابتداً سکہ سازی میں بھی طرح طرح کے نقایص موجود تھے بد دیانت لوگ بڑی آسانی سے سکوں کے کنارے کتر لیتے تھے اور جب تک کہ انھیں پھر تولا نہ جائے، اس قسم کے فریب کا بہ مشکل پتا لگ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ جعلی سکے بنانا بھی اس زمانے میں چنداں مشکل کام نہ تھا چنانچہ انہی دقتوں کو رفع کرنے کے لیے مہذب اقوام نے سکہ سازی میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کی ہیں اور اس فن کو ترقی کے درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اب اگر کسی سکے میں ذرا بھی کوئی ناجایز تعرف کیا جائے تو فوراً اس کا پتا لگ جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں یہ کوئی ضروری بات نہ تھی کہ سکہ سازی کا کام حکومت ہی انجام دے۔ قرون وسطیٰ میں خانگی اشخاص بھی بسا اوقات اس کاروبار میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن تجارت وصنعت اور ہر قسم کے کاروبار کی ترقی کے لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جو چیز بہ طور آلۂ مبادلہ اور پیمانۂ قدر کے مستعمل ہو، وہ ہر قسم کے شک وشبہہ سے بالکل پاک ہو۔ عوام اپنے ملک کے سکون پر کامل اعتماد ہو اور آمیزش وغیرہ کا قطعاً کوئی شائبہ نہ ہو۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر آجکل سکہ سازی کا کام ہر ملک کی حکومت کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا حکومت کے متعدد دوسرے فرائض کے منجملہ اب سکہ سازی بھی ایک فرض ہے۔

چند اصطلاحات

چند اصطلاحات:۔ آزاد اور محدود سکہ سازی: جن ممالک میں آزاد سکہ سازی کا طریقہ رائج ہوتا ہے، وہاں ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے

جس وقت چاہے، مقررہ وزن اور خوبی کی دھات سرکاری دارالضرب میں پیش کرکے اس کے سکے ڈھلوائے۔ اس کے برعکس جہاں سکہ سازی محدود ہوتی ہے، وہاں عوام اپنی ضرورت کے مطابق سکے نہیں ڈھلوا سکتے بلکہ ملک کی تجارت اور عام کاروبار کو پیش نظر رکھتے ہوئے جسقدر زر درکار ہوتا ہے، حکومت اس کا اندازہ کرکے خود اپنے طور پر سکے ڈھالتی ہے۔ عوام کو یہ حق نہیں کہ جب چاہیں سونا یا چاندی پیش کرکے اس کو سکوں کی شکل میں تبدیل کروالیں۔

بلامعاوضہ اور بالمعاوضہ سکہ سازی
بالمعاوضہ سکہ سازی

بلامعاوضہ اور بالمعاوضہ سکہ سازی: آزاد سکہ سازی کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ سرکار بغیر کسی معاوضے کے ہر شخص کو جو حسب قاعدہ سونا یا چاندی دارالضرب میں پیش کرے، سکے ڈھال کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سرکار سکہ سازی کا کچھ معاوضہ بھی وصول کرے۔ پہلی حالت میں سکہ سازی مفت یا بلامعاوضہ کہلائے گی اور دوسری حالت میں بالمعاوضہ۔ واضح رہے کہ سکہ سازی کا معاوضہ عام طور پر بشکل نقد نہیں وصول کیا جاتا بلکہ جو سونا یا چاندی دارالضرب میں پیش کی جاتی ہے، اس کا ایک جزو اس غرض سے نکال لیا جاتا ہے اور اس کے بجائے کھوٹ شریک کردیا جاتا ہے۔ بعض اوقات حکومتیں سکہ سازی کا معاوضہ اس کے حقیقی مصارف سے زیادہ وصول کرتی ہیں۔ اس طور پر حکومتوں کو جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، اسے اصطلاح میں **منافع سکہ سازی** کہتے ہیں۔

زر مستند اور زر وضعی

زر مستند اور زر وضعی۔ ہم اس سے پہلے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ جو چیز بہ طور زر کے استعمال کی جاتی ہے، اس کی کچھ ذاتی قدر بھی ہوتی ہے۔ زر کا کام دینے کے علاوہ وہ ہماری کوئی نہ کوئی دوسری احتیاج بھی رفع کر سکتی ہے جس کی وجہ سے بازار میں اس کی کچھ نہ کچھ قدر یا قیمت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً ہند کا روپیہ علاوہ اس خدمت کے جو وہ بہ حیثیت ایک آلۂ مبادلہ کے انجام دیتا ہے، اس وجہ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس میں چاندی کی ایک خاص مقدار موجود ہے جس سے برتن یا زیور یا کوئی اور کار آمد چیز تیار کی جا سکتی ہے۔ لہذا روپیہ کی قدر، بہ لحاظ چاندی کی اس مقدار کے جو اس کے اندر موجود ہے، **قدر ذاتی یا قدر فلزی** کہلاتی ہے۔ چونکہ روپیہ میں دس آنے کے بقدر چاندی ہوتی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روپیہ کی قدر ذاتی دس آنے کے برابر ہے۔ لیکن سرکار نے از روئے قانون روپیہ کو سولہ آنے کے مساوی قرار دیا ہے۔ اس لیے سولہ آنے روپیہ کی **قدر قانونی** ہوئی۔ قدر ذاتی یا فلزی اور قدر قانونی کا مفہوم معلوم کرنے کے بعد ہم زر مستند اور زر وضعی کا فرق آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

جس زر کی قدر قانونی اس کی قدر ذاتی کے برابر ہو، اُسے **زر مستند** کہتے ہیں۔ مثلاً انگلستان کا ساورن۔ بہ حیثیت آلۂ مبادلہ کے ایک ساورن کی قدر وہی ہے جو اس کے سونے کی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے روپیہ کی قدرِ قانونی تو سولہ آنے ہے لیکن اس کی قدرِ ذاتی (یعنی

ایک روپیہ کی چاندی کی قدر) صرف دس آنے ہے ۔ پس ایسا زر
جس کی قدر ذاتی اس کی قدر قانونی سے کم ہو اصطلاح میں زر وضعی کہلاتا ہے
وضعی سکے اپنی اصلی مالیت سے زیادہ قیمت پر اس وجہ سے چلتے
ہیں کہ سرکار ان کی مقدار کو سختی کے ساتھ محدود کر دیتی ہے ۔
یعنی ایسے سکے صرف اتنی مقدار میں ڈھالے جاتے ہیں جس کی
ملک کو تجارتی اغراض کے لیے سخت ضرورت ہوتی ہے ۔ اب
رہی تیسری صورت یعنی قدر ذاتی زیادہ ہو اور قدر قانونی کم ۔ یہ عملاً ممکن
نہیں ۔ کیونکہ ایسا زر بہ طور آلۂ مبادلہ کے نہیں چلسکتا بلکہ لوگ اس کو
گلا گلا کر بہ حیثیت سونے یا چاندی کے استعمال کریں گے ۔

زر قانونی اور محدود زر قانونی

زر قانونی اور محدود زر قانونی : ایک اور نقطۂ نظر سے
بھی زر کی دو قسمیں کی جاتی ہیں : ایک زر قانونی، دوسرے محدود
زر قانونی ۔ فرض کرو کہ زید چار سو روپیہ بکر سے قرض لیتا ہے ۔
جب قرضہ واپس کرنیکا وقت آتا ہے تو وہ بجائے چار سو روپیہ
ادا کرنے کے ایک ہزار چھ سو چوانیاں یا تین ہزار دو سو دوانیاں
یا چھ ہزار چار سو اکنیاں بکر کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ بکر کو اختیار
ہے کہ اس طور پر اپنی رقم واپس لینے سے انکار کر دے ۔ اس کے
برعکس اگر زید چار سو روپیے یا آٹھ سو اٹھنیاں پیش کرے تو بکر
اس رقم کو قبول کرنے پر قانوناً مجبور ہوگا ۔ پس روپیہ اور اٹھنی تو
زر قانونی کہلائیں گے کیونکہ ان کے ذریعے سے بڑی سے بڑی

رقم ادا ہو سکتی ہے۔ اور چوانی، دوانی، اکنی محدود زر قانونی کہلائیں گے۔ کیونکہ ان کے ذریعے سے صرف دو روپیوں کی حد تک کوئی رقم ادا کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

قانون گریشم

قانون گریشم۔ زمانہ قدیم میں جبکہ سکہ سازی کے لیے آجکل کی طرح مستقل دارالضرب موجود نہ تھے، ہر چالیس یا پچاس سال کے بعد کثیر مقدار میں سکے ڈھلا لیے جاتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ سکے اکثر و بیشتر بہت ہی گھسے ہوئے اور فرسودہ حالت میں رہتے تھے۔ اور سکوں کو ناجائز طور پر تراش لینے کی جو عام عادت اس زمانے میں رائج تھی، اس کی وجہ سے ان کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے کاروبار میں سکوں کو بجائے شمار کرنے کے تولا جاتا تھا یعنی سکے اپنی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ وزن کے حساب سے چلتے تھے۔ جو تاجر غیر ملکی اشخاص کے ساتھ بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے، وہ پورے وزن کے اچھے سکے تو باہر والوں کو دینے کے لیے محفوظ رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے کاروبار میں جہاں سکے بہ لحاظ تعداد کے چلتے تھے، کم وزن کے گھسے ہوئے سکے استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سناروں کو اپنے کاروبار کے لئے سونے اور چاندی کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ پورے وزن کے عمدہ سکوں کو گلا کر نہایت آسانی کے ساتھ اپنا کام نکال لیتے تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ عمدہ سکے جاری ہوتے ہی فوراً غائب ہو جاتے تھے اور

خراب سکے استعمال میں رہجاتے تھے۔ اس رجحان کی تشریح ملکہ الزابتھ کے دورِ حکومت میں لندن کے ایک تاجر ٹامس گرشیم کی۔ چنانچہ اس کا یہ قول کہ "ناقص زر اچھے زر کو استعمال سے خارج کر دیتا ہے" اصطلاح میں قانون گرشیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قانون زیادہ صحت کے ساتھ حسب ذیل طریقے پر بیان کیا جاسکتا ہے :۔ "اگر ایسے سکے جن کی قدر مرقومہ تو برابر ہو لیکن قدر فلزی غیر مساوی، ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آزادی کے ساتھ چلائے جائیں تو جن سکوں کی قدر فلزی زیادہ ہوگی، وہ استعمال سے خارج ہو جائیں گے"۔

زر کاغذی

زر کاغذی۔ غور کیا جائے تو زر کاغذی اور زر وضعی میں بہت تھوڑا فرق نظر آئیگا۔ زر وضعی سے مراد ایسا زر ہے جس کی قدر ذاتی، قدر قانونی سے کم ہو۔ اس لحاظ سے زر کاغذی گویا انتہا درجے کا زر وضعی ہے یعنی اس کی ذاتی قدر تو قریب قریب کچھ نہیں ہوتی اور قدر قانونی جسقدر حکومت چاہے، مقرر کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ زر بالعموم محض مبادلے کے اغراض کے لیے مطلوب ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی اشیا یا خدمات کے معاوضے میں ایسی چیز قبول کرنے سے انکار نہ کرے گا جس کے متعلق اُسے یہ اطمینان ہو کہ دوسروں کے پاس بھی مقبول ہوگی۔ اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس چیز کی فی نفسہ کچھ قیمت ہے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ زر کے۔ دائرۂ کار میں ...

اعتماد پر ہے۔ اگر کسی وقت یہ اعتماد جاتا رہے تو زر کا خاتمہ یقینی ہے ان ترقی یافتہ ممالک میں کاغذ کے ذرا ذرا سے پرزوں سے روزانہ جو لاکھوں روپیوں کا لین دین ہوتا ہے، اس کا راز در اصل اسی اعتماد میں مضمر ہے۔

یوں تو زر کاغذی کی مختلف قسمیں بیان کی جاتی ہیں لیکن اس کی دو قسمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک نقد پذیر اور دوسرے غیر نقد پذیر زر کاغذی۔

نقد پذیر زر کاغذی۔

نقد پذیر زر کاغذی کی خصوصیت، جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نقد کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جس شخص کے پاس ایسا زر کاغذی موجود ہو، وہ اُسے اپنی مرضی کے مطابق جس وقت چاہے، دوسروں کے حوالے کرکے اس کے بدلے میں سونے یا چاندی کے سکے حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ جو بنک یا حکومت ایسا زر کاغذی جاری کرتی ہے، وہ اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ جب کبھی اس کے جاری کردہ نوٹ اس کے پاس پیش کیے جائیں گے تو وہ پیش کرنے والے کو رقم مندرجہ سکوں کی شکل میں ادا کر دے گی۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نوٹ جاری کرنے والا ادارہ، خواہ وہ حکومت ہو یا بنک، سونے یا چاندی کی ایک بڑی مقدار اپنے یہاں محفوظ رکھے تاکہ جو نوٹ اس کے پاس بہ غرضِ ادائیگی پیش کیے جائیں، وہ ان کو ہر حالت میں سکوں سے بدل سکے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ جاری کردہ نوٹوں کی پوری پوری مالیت کے مساوی سونا یا چاندی محفوظ

رکھی جائے۔ کیونکہ یہ بات شاذ و نادر ہی واقع ہوتی ہے کہ تمام جاری کردہ
نوٹ بہ یک وقت پیش کیے جائیں اور ان کے بدلے میں سکوں کا مطالبہ کیا
جائے۔ عوام کو نوٹ جاری کرنے والے ادارے پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔ اسی
لیے وہ نوٹ بھنانے کی چنداں فکر نہیں کرتے۔ نوٹ دست بدست گھومتے رہتے
ہیں اور مدتوں انھیں نقد کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ بلکہ جو لوگ پس انداز کرنا چاہتے
ہیں وہ بھی سونے یا چاندی کے سکوں کے مقابلے میں نوٹوں ہی کو بوجہ ان کی گوناگوں
سہولتوں کے ترجیح دیتے ہیں۔

غیر نقد پذیر زر کاغذی

غیر نقد پذیر زر کاغذی سے مراد ایسا زر ہے جس کے عوض میں عند الطلب سونا یا
چاندی ادا کرنے کی ذمہ داری نہیں لی جاتی۔ بنک ایسا زر جاری نہیں کرتے بلکہ وہ حکومت
کی جانب سے نافذ کیا جاتا ہے اس کی مقدار بھی حکومت ہی کی صوابدید پر چھوڑ دی
جاتی ہے اور اس کے لیے سونا یا چاندی محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا زر جاری
کرنے میں کوئی خرچ لاحق نہیں ہوتا اس لیے اکثر نادار حکومتیں اپنے عہدہ داروں کے
مشاہرے اور اپنی فوجوں کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے یہ آسان طریقہ اختیار کرلیتی ہیں
یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے زر کی کوئی قدر نہیں ہوتی لیکن اس بنا پر یہ خیال
کرلینا کہ جو لوگ اپنی اشیا یا خدمات کے معاوضے میں ایسا زر پاتے ہیں
وہ گویا درحقیقت کوئی معاوضہ نہیں پاتے، غلطی ہے حکومت اُسے زر قانونی
قرار دیتی ہے اس لیے اس کی عملداری کے اندر کوئی شخص اُسے قبول کرنے
سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس طور پر زر کا خاص کام یعنی بہ طور آلۂ مبادلہ کے
کام آنا، اس سے بخوبی پورا ہوجاتا ہے۔ البتہ اس کے اندر دو بڑے نقص موجود

ہیں جو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے :- ایک تو یہ کہ ایسا زر بسا اوقات زاید از ضرورت مقدار میں نافذ کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قیمتیں بہت چڑھ جاتی ہیں اور جوں جوں اس کی جدید مقداریں نافذکی جاتی ہیں قیمتوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس ملک میں ایسا زر جاری کیا جاتا ہے، اس کے باہر اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ لہذا تجارت بین الاقوام میں وہ قطعاً کام نہیں آسکتا۔ دوسرے ممالک کے تاجر کیوں ایسا زر قبول کریں گے جسے وہ نہ تو استعمال کر سکیں اور نہ سونے یا چاندی سے بدل سکیں۔

اس قسم کا زر کاغذی بالعموم چھوٹے نادار ممالک میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات سخت مالی مشکلات کے زمانے میں انگلستان فرانس، اور ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے عظیم الشان ممالک کو بھی یہ تدبیر اختیار کرنی پڑی۔ مثلاً ۱۷۹۷ء اور ۱۸۲۱ء کے درمیان فرانسیسی لڑائیوں کے بے انتہا گراں مصارف کی وجہ سے انگلستان بنک کے نوٹ غیر نقد پذیر ہو گئے تھے۔ ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۶ء تک فرانسیسی انقلابی حکومت نے، اور ۱۸۶۱ء میں اپنی مشہور خانہ جنگی کے آغاز پر ریاستہائے متحدہ امریکہ نے ایسا ہی کاغذی زر جاری کر دیا تھا جسے فرانس میں اسیناٹ اور امریکہ میں گرین بیک کہتے تھے۔ اور دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں نے ہندستان میں اسٹرلنگ کے نوٹ جاری کئے

اعتبار

اعتبار کی تشریح۔ بسا اوقات لوگ اپنی مطلوبہ اشیاء خرید لیتے ہیں اور ان کے عوض میں فروشندہ کو کسی قسم کا زر نہیں ادا کرتے بلکہ صرف ایک چک یا ہنڈی اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لیکن چک یا ہنڈی زر کی طرح بجائے خود ان اشیاء کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کے ذریعے اشیاء کی قیمت ادا نہیں ہو جاتی بلکہ قیمت ادا کرنے کا صرف وعدہ کیا جاتا ہے لیکن کاروباری اشخاص بجائے حقیقی ادائگی کے ان وعدوں کو قبول کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے کیونکہ (۱) جس شخص نے انہیں چک یا ہنڈی دی ہے، اس پر وہ بھروسہ کرتے اور یہ جانتے ہیں کہ جس وقت وہ مطالبہ کریں گے، انہیں موعودہ زر مل جائیگا۔ مزید براں (۲) جو وعدے ان کے ساتھ کیے گئے ہیں، اُن کی بناء پر وہ دوسروں کے ساتھ خود اسی قسم کے وعدے کر سکتے ہیں۔ اس طریقے کی بدولت مبادلے میں جو غیر معمولی سہولت پیدا ہو گئی، وہ ظاہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کا انحصار سراسر اس بھروسے یا اعتماد پر ہے جو وعدہ کرنے والے شخص کی دیانت اور استطاعت کے متعلق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس طریقے کو اعتبار کہتے ہیں۔ ذیل میں ہم دو قسم کے اعتباری دستاویزات کی تشریح کریں گے: ایک ہنڈی، دوسرے چک۔

ہنڈیاں

ہنڈیاں:- ہنڈی دراصل ایک کھلی چٹھی ہوتی ہے۔ جس میں لیندار اپنے دیندار سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ واجب الادا رقم ایک تیسرے شخص کو عندالطلب یا کسی مدت معینہ کے اندر ادا کر دے۔ اسی بنا پر ہنڈیوں کی دو قسمیں کی جاتی ہیں: ایک عندالطلب یا درشنی ہنڈیاں۔ جو فوراً واجب الادا ہوتی ہیں، دوسرے میعادی ہنڈیاں جو تاریخ تحریر یا تاریخ ملاحظہ سے ایک خاص مدت کے بعد قابل ادائی ہوتی ہیں۔ لیندار کو، جس کی جانب سے یہ چٹھی روانہ کی جاتی ہے، اصطلاح میں "ہنڈی لکھنے والا" اور دیندار کو، جس کے نام چٹھی روانہ کی جاتی ہے، "ہنڈی لینے والا" کہتے ہیں۔ جب لینے والے کے پاس ہنڈی پیش کی جائے اور وہ اس کے مضمون سے اتفاق کر کے اس پر اپنی دستخط کر دے تو اُس کے اس فعل کو سکار کہتے ہیں اگر کسی ہنڈی کا لکھنے والا اور لینے والا، دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے ہوں تو ایسی ہنڈی کو اصطلاح میں "اندرونی ہنڈی" کہتے ہیں اور اگر یہ دونوں دو مختلف ملکوں کے رہنے والے ہوں تو ایسی ہنڈی کو "خارجی ہنڈی" کہتے ہیں۔ جب کسی ہنڈی کی میعاد ختم اور اس کی مندرجہ رقم واجب الادا ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ ہنڈی "پختہ" ہو گئی ہے۔ عام رواج کے مطابق ہنڈی پختہ ہونے کے بعد بھی لینے والے کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اور ان دنوں کو اصطلاح میں "رعایتی دن" کہتے ہیں۔ درشنی یا عندالطلب ہنڈیوں پر

رعایتی دن نہیں ملتے۔

فرض کرو کہ بمبئی کا ایک تاجر لندن کے کسی گاہک کے ہاتھ اپنی روئی فروخت کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس روئی کی قیمت کس طرح وصول کرے۔ یہ ممکن ہے کہ روئی کا خریدار انگریزی زر کی شکل میں اس کی قیمت بمبئی روانہ کردے لیکن مشکل یہ ہے کہ (i) بمبئی کا تاجر اپنے ملک میں یہ زر نہیں استعمال کرسکتا۔ مزید براں (ii) زر روانہ کرنے کے مصارف کی وجہ سے روئی کی قیمت بہت گراں ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ انہی دقتوں کو رفع کرنے کے لیے ہنڈی استعمال کی جاتی ہے۔ ہنڈی کے ذریعے سے کیونکر یہ دقتیں حل ہوجاتی ہیں اس کی تشریح کرنے کے لیے ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ اسی اثنا میں لندن کا ایک تاجر بمبئی کے کسی گاہک کے ہاتھ اپنا کپڑا فروخت کرتا ہے۔ گویا

زید (بمبئی کا تاجر) اپنی روئی فروخت کرتا ہے عمر (لندن کے گاہک) کے ہاتھ

اور بکر (لندن کا تاجر) اپنا کپڑا فروخت کرتا ہے۔ خالد (بمبئی کے گاہک) کے ہاتھ

سہولت کے خیال سے ہم یہ بھی فرض کرلیتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں مالِ تجارت کی قیمت ایک ایک ہزار پونڈ ہے۔ اب زید ایک ہزار پونڈ کی ایک ہنڈی عمر کے نام لکھتا ہے جو تین ماہ کے بعد قابلِ ادائی ہوتی ہے جب ہنڈی عمر کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اس پر اپنا نام لکھ کر اسے "سکارتا" ہے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ تاریخ معینہ پر

رقم مندرجہ زید کے نامزد کردہ شخص کو ادا کر دے گا۔ عمر کو جو تین ماہ کی مدت ملجاتی ہے، اس میں نہ صرف وہ اپنا مال وصول کر لیتا ہے بلکہ اُسے فروخت کرکے وقت مقررہ پر قیمت ادا کرنے کے قابل بن جاتا ہے اور اِس طور پر کاروبار کرنے سے اُسے سرمایے کی بہت بڑی بچت ہوتی ہے۔

لیکن اسی اثنا میں جو دوسرا معاملہ ہو چکا ہے، اس کی بنا پر ایک ہزار پونڈ خالد کی جانب سے بکر کو ادا ہونے ہیں۔ لیکن خالد سونا بھیجنے کا خرچ نہیں برداشت کرنا چاہتا اور نہ بکر ہندوستان کا زر لینا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ ان دونو کا مطلب پورا ہو سکے۔ واضح رہے کہ پہلے معاملے میں زید نے جو ہنڈی لکھی تھی، وہ اب بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس کی بدولت زید یا اس کے نامزد کردہ شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لندن میں ایک ہزار پونڈ وصول کرے۔ خالد کو کپڑے کی قیمت ادا کرنے کے لیے ٹھیک ایسے ہی حق کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ زید کی ہنڈی خرید کر اسے اپنے لیندار یعنی بکر کے پاس روانہ کر دیتا ہے اور جب وہ پختہ ہو جاتی ہے تو بکر اپنی رقم عمر سے وصول کر لیتا ہے۔ اس طور پر زید کو اپنی روئی کی قیمت خالد سے ہندوستانی زر میں وصول ہو جاتی ہے اور بکر کو اپنے کپڑے کی قیمت انگریزی زر میں عمر سے وصول ہو جاتی ہے۔ گویا ایک ملک سے دوسرے ملک کو کسی قسم کا زر روانہ کیے بغیر

صرف ایک ہنڈی کے توسط سے دونوں معاملات کی رقم بیباق ہو جاتی ہے۔
ہنڈیوں کے متعلق مندرجہ ذیل امور اچھے طور پر ذہن نشین کرلینا ضروری ہے
(۱) ہنڈی کے مالک کو اپنی ہنڈی کی بدولت کسی خاص مقام پر ایک معینہ مقدار زر وصول کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور یہ حق خرید ا اور بیچا جا سکتا ہے۔
(۲) ہنڈیاں غیر ممالک میں قرضے ادا کرنے کا ارزاں اور آسان ذریعہ ہیں
(۳) بیرون ملک مال روانہ کرنے والے تاجروں کو ہنڈیوں کی بدولت اپنے مال کی قیمت اپنے ہی ملک کے زر میں وصول ہو جاتی ہے۔
تجارت خارجہ میں ہنڈیوں کا استعمال ذیل کی شکل سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستان

زید ... عمر کے نام کی ہنڈی فروخت کرتا ہے ...... خالد کو

(لینِ دار) (دیندار)

ہندوستانی زر

ہنڈی

انگریزی زر

عمر کے نام ...... جو زید کی ہنڈی سکارتا اور رقم ادا کرتا ہے ...... بکر کو

(دیندار) (لیندار)
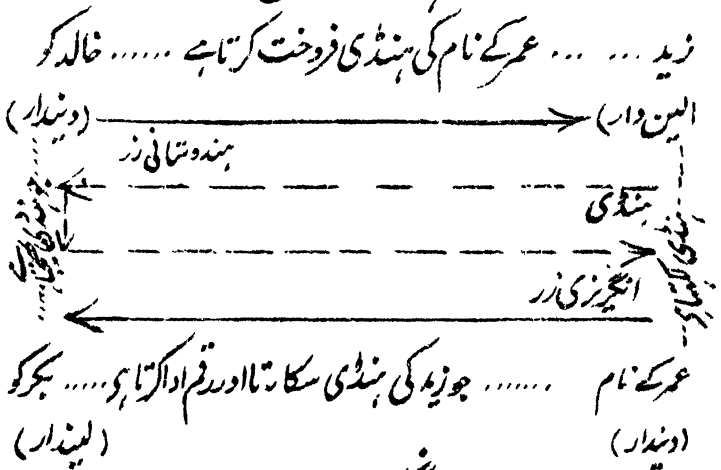
انگلستان

چیک ۔ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چیک کوئی اعتباری دستاویز نہیں بلکہ زر ہی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص چیز خرید کر معاوضے میں چیک دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے قیمت نقد ادا کر دی کیونکہ تجارت پیشہ اشخاص اس کو نقد معاملہ تصور کرتے ہیں۔ چیک درحقیقت ایک حکم نامہ ہے جس میں چیک لکھنے والا اپنے بنک دار کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ رقم معینہ عند الطلب ادا کر دے۔ ہنڈی کی طرح آیندہ ادائی کی اس میں کوئی شرط نہیں ہوتی بلکہ جونہی چیک دیا گیا کاروبار مکمل ہو گیا۔ لہذا زر اور چیک میں بہ ظاہر کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دوسرے اعتباری دستاویزات کی طرح چیک بھی قیمت ادا کرنے کا محض ایک وعدہ ہے۔ البتہ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے فوراً بنکدار کے پاس پیش کرکے وعدۂ مندرجہ کے ایفا کا فوری مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم چیک حاصل کرنے اور اسے بنکدار کے پاس پیش کرکے نقد وصول کرنے کے درمیان تھوڑا سا دقفہ گذرنا لازمی ہے۔ لیکن یہ قلیل دقفہ چنداں قابل لحاظ نہیں خیال کیا جاتا بلکہ جو بات درحقیقت قابل توجہ سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر چیک لینے والا اسے متعلقہ بنک میں پیش کرکے زر نقد وصول کرلے یا اسے بہ حساب امانت خود اپنے بنکدار کے حوالے کر دے تاکہ رقم مندرجہ فوراً اس کے کھاتے میں شامل کرلی جائے تو ایسی صورت میں جہاں تک چیک لینے والے کا تعلق ہے، معاملہ بالکل مکمل ہو جاتا ہے اور اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چیک بھی زر ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن باوجود

اس کے چیک درحقیقت زر نہیں ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے سے بہ آسانی اس کا ثبوت ملجاتا ہے:۔

(۱) چیک زر قانونی نہیں ہے۔ اس لیے کوئی لیندار اسے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) چیک کے ذریعے سے کوئی رقم ایک مرتبہ سے زاید نہیں ادا کی جا سکتی کیونکہ وہ زر کے مانند دست بدست نہیں گھومتا اور نہ اسے عام مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) چیک بہ معاوضۂ قیمت صرف اسی حالت میں قبول کیا جاتا ہے جبکہ اس کے لکھنے والے پر کافی اعتماد ہو۔ اس کے برعکس زر ہمیشہ بلاچون و چرا قبول کیا جاتا ہے۔

(۴) معاملہ جو مکمل ہوتا ہے وہ محض قیمت ادا کرنے والے اور اسے حاصل کرنے والے کی حد تک۔ بنکدار کا کام ہنوز باقی رہتا ہے۔

مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ چیک میں زر کی خصوصیت نہیں پائی جاتی لہذا اسے زر نہیں کہا جا سکتا البتہ وہ اعتبار کی ایک شکل ضرور ہے کیونکہ اس کا استعمال سراسر بھروسے پر مبنی ہے۔

مغربی ممالک اور خاصکر انگلستان میں چیک کے ذریعہ سے قیمت ادا کرنیکا رواج بہت عام ہے۔ اس کا باعث وہ گوناگوں فواید ہیں جو چیک کے استعمال کے ساتھ وابستہ ہیں: اول تو یہ کہ اس کا استعمال انتہا درجے

باعث سہولت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے بڑی بڑی رقمیں بشکلِ نقد اپنے نزدیک رکھنے کی ضرورت نہیں باقی رہتی۔ تیسرے یہ کہ کتابچۂ چک کے ساتھ اس کا جو ثنیٰ منسلک رہتا ہے، اس کی بدولت ادا کی ہوئی رقوم کی ایک مکمل فہرست ہر وقت پاس رہتی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ بجائے زر کے استعمال ہوتا ہے اور اس لیے ملک کا تجارتی کاروبار چلانے کے لیے مقابلتاً بہت تھوڑا سونا کافی ہو جاتا ہے۔ پانچویں یہ کہ وہ قیمت وصول کرنے والے کے حق میں بھی بڑی سہولت کا باعث ہے۔ جس بنک کے نام چک لکھا جائے وہ خواہ کتنی ہی دور واقع ہو، چک لینے والے کو کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی کیونکہ جس بنک میں خود اس کا کھاتہ ہوتا ہے وہ چک اس کے حوالے کر دیتا ہے اور خود اسے لیجا کر نقد کرانے کی تمام تکلیف سے بچ جاتا ہے۔

بنک

بنک کی تعریف

بنک کی تعریف ... معاشیات کی درسی کتابوں میں "بنک" کی متعدد تعریفیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن جو تعریف زیادہ عام طور پر مروج ہے، اس کے مطابق "بنک وہ ادارے ہیں جہاں زر اور اعتبار کا لین دین ہوتا ہے"۔ لیکن یہ تعریف بھی درحقیقت بہت محدود ہے اور موجودہ زمانے میں قسم قسم کے بنک جو گوناگوں فرائض انجام دیتے ہیں، ان کا پورا پورا اندازہ اس سے نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ بنک کی کوئی ایسی جامع

تعریف کرنا جو ہر قسم کے بنک پر ٹھیک ٹھیک صادق آسکے، بہت مشکل ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ مذکورۂ بالا تعریف ہی پر اکتفا کرکے بنکوں کے آغاز اور ان کے کاموں کی طرف توجہ کی جائے۔

بنکوں کا آغاز

بنکوں کا آغاز۔۔ واضح رہے کہ آئندہ احتیاجات کے خیال سے موجودہ آمدنی کا کوئی جزو پس انداز کرنا کچھ زمانہ حال کی خصوصیت نہیں ہے دور اندیش لوگ ہر زمانے میں اپنی آمدنی کا تھوڑا بہت حصہ بچا رکھتے تھے تاکہ وہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ البتہ شغل اصل کے متعدد طریقے جو آجکل رائج ہیں زمانہ قدیم میں موجود نہ تھے۔ اس لیے لوگ اپنی اپنی انداز کی ہوئی دولت بالعموم دفینے کی شکل میں رکھ چھوڑتے اور جب کبھی غیر معمولی ضروریات پیش آئیں اُسے خرچ کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں اندرونی امن وامان کی حالت آجکل کی طرح قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کا ہر وقت خوف لگا رہتا تھا اور لوگوں کو اپنے اندوختوں کی حفاظت میں بڑی دقتیں پیش آتی تھیں بلکہ بعض اوقات غیر معمولی مصارف بھی لاحق ہوتے تھے۔

فرض کرو کہ ان حالات میں کوئی شخص نہایت مستحکم اور محفوظ گودام تعمیر کرکے خاص اہتمام کے ساتھ لوگوں کے اندوختے امانت رکھنے اور ان کی حفاظت کرنے کا ذمہ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو اس شخص پر اعتبار ہوگا، وہ خوشی خوشی اپنے اندوختے اس کے حوالے کرکے اس مضمون کی ایک رسید حاصل کرلیں گے کہ حامل ہذا کو عند الطلب رقم مندرجہ ادا کردی

جائے گی - اس طور پر لوگ نہ صرف اپنے اندوختوں کی حفاظت کے تردد سے بچ جائیں گے بلکہ وہ آپس کے لین دین میں زر استعمال کرنے کے بجائے ان رسیدوں سے کام چلائیں گے - اگر زید کو بکر سے سو روپے وصول ہونے ہیں تو وہ سو روپے لینے کے بجائے اس قسم کی ایک رسید جس میں اسی قدر رقم عند الطلب ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہو، قبول کریگا اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ رسید زر کے مانند دست بدست گھومنے لگیں گے - بالفاظ دیگر نوٹوں کا استعمال شروع ہوجائیگا۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شخص مذکور اپنے ہر ہر امانت دار کا ایک علیحدہ حساب رکھے اور جب امانت دار اپنی دستخط سے اس مضمون کی کوئی تحریر روانہ کرے کہ فلاں شخص کو اسقدر رقم ادا کردی جائے تو اس کے مطابق عمل کرکے امانت دار کے حساب میں حسبہ رد و بدل کردے - یہی گویا چک کے استعمال کی ابتدا ہوگی -

فرض کرو کہ تھوڑے سے تجربے کے بعد اس شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام امانت دار بہ یک وقت اپنی رقمیں واپس نہیں طلب کرتے بلکہ اگر ایک طرف کچھ رقم اس کے مستحکم گودام سے خارج ہوتی رہتی ہے تو دوسری طرف کچھ رقم اس میں داخل بھی ہوتی رہتی ہے اور ان دونوں کا اوسط قریب قریب برابر رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کثیر رقم ہمیشہ اس کے گودام میں پڑی رہتی ہے - ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ اتنی بڑی رقم کو یونہی بیکار ڈال رکھنا حماقت ہے - خاصکر

ایسی حالت میں جبکہ بہت سے لوگ اسے قرض لینے اور اس کے استعمال کا کچھ معاوضہ بھی دینے کو آمادہ ہیں۔ یہ سوچکر وہ اپنی مجتمعہ رقوم سے ضرورتمند اشخاص کو قرضہ دینا شروع کر دیتا ہے اور ان سے کچھ معاوضہ بھی وصول کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کاروبار اُسے اسقدر نفع بخش معلوم ہوتا ہے کہ وہ امانت داروں سے ان کی رقوم کی حفاظت کا کوئی معاوضہ طلب کرنے کے بجائے خود اپنی طرف سے انھیں استعمال رقم کا کچھ معاوضہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تاکہ لوگ اپنا پس انداز گھروں پر دفینے کی شکل میں ڈال رکھنے کے بجائے اس کے مستحکم گودام میں داخل کرنے پر آمادہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ قرض لینے والوں سے جو معاوضہ وصول کریگا، اس کا صرف ایک جزو امانت داروں کو ادا کریگا اور بقیہ حصے کو اپنے کاروبار کے مصارف اور منافع میں محسوب کریگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس فرضی شخص کی مثال سے ہم نے آغاز کیا تھا، وہ اب ایک اچھا خاصا بنکدار بن گیا ہے۔ نوٹ وہ جاری کرتا ہے، چک وہ قبول کرتا ہے، امانتوں پر سود وہ ادا کرتا ہے، اور تاجروں اور صناعوں کو ان کے کاروبار کی ترقی کے لیے رقم وہ قرض دیتا ہے۔

بنک کاری کے کاروبار کا آغاز کیونکر ہوا، اس سیدھی سادی مثال سے اس کا ایک سرسری خاکہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ لیکن موجودہ

زمانے میں یہ کاروبار کچھ اسقدر پیچیدہ ہوگیا ہے کہ اچھے اچھے تعلیم یافتہ اشخاص بھی بغیر خاص کوشش کے اس کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتے چنانچہ اسی بنا پر آجکل بنکوں کے کاروبار پر طرح طرح کی قانونی پابندیاں عاید کی جاتی ہیں تاکہ عوام کا روپیہ جو محض کاروباری ساکھ کی بنا پر بنکوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ضائع نہ ہونے پائے۔

بنک کے کام

بنک کے کام۔ ۔غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بنک درحقیقت وہی کام انجام دیتے ہیں جو عام طور پر تاجروں سے متعلق سمجھے جاتے ہیں تاجر کا یہ کام ہے کہ قسم قسم کی اشیا کارخانوں سے، جہاں وہ تیار کی جاتی ہیں، خریدے اور استعمال کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کرے اگر دنیا میں تاجر نہ ہوں تو مال تیار کرنے والوں کو خریداروں کی تلاش میں اور خریداروں کو مال تیار کرنے والوں کی تلاش میں معلوم کس قدر حیران ہونا اور اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا پڑے۔ تاجروں کا وجود دونوں طبقوں کے لیے انتہا درجے سہولت اور کفایت کا باعث ہے۔ کارخانہ دار یہ جانتے ہیں کہ جونہی مال تیار ہو جائیگا، فلاں فلاں تاجر اسے خرید لیں گے اسی طرح اس مال کو استعمال کرنے والے اشخاص واقف ہوتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ اشیا جس وقت چاہیں گے، فلاں فلاں تاجروں سے خرید سکیں گے۔ بنک جو خدمت انجام دیتے ہیں، اس کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے۔ ہر مقام پر ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو آیندہ احتیاجات کے خیال سے اپنی موجودہ آمدنی کا کوئی جزو پس انداز کرتے ہیں۔ چونکہ وہ خود کوئی کاروبار نہیں کرسکتے

اس لیے لازم ہے کہ آیندہ احتیاجات کے پیش آنے تک وہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کریں۔ اسی کے ساتھ ہر مقام پر ایسے بھی لوگ موجود ہوتے ہیں جنھیں اپنی موجودہ احتیاجات رفع کرنے اور اپنے قسم قسم کے کاروبار چلانے کے لیے فی الوقت رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنک کا اصلی کام یہی ہے کہ ان دونوں طبقوں کے درمیان واسطہ بنے۔ جن لوگوں کے پاس موجودہ ضروریات سے زاید رقم موجود ہو، ان سے وہ رقم حاصل کرے اور جن لوگوں کو اپنے کاروبار کے لیے فی الوقت رقم مطلوب ہو ان کے لیے حسب ضرورت رقم مہیا کر دے۔ اگر بنک موجود نہ ہوں تو لوگوں کو اپنی رقوم پر معاوضہ ملنا تو درکنار، خود ہی ان کی حفاظت کا خرچ برداشت کرنا پڑیگا اور دوسری طرف کاروباری اور ضرورتمند اشخاص کو ایسے لوگوں کی تلاش میں، جو رقم مستعار دے سکیں، حیران و سرگردان ہونا پڑیگا۔ بنک کا وجود ان دونوں طبقوں کے لیے غیر معمولی سہولت کا باعث ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اگر وہ اپنی آمدنی کا کوئی جزو پس انداز کرنا چاہے تو ایک ادارہ ایسا موجود ہے جو نہ صرف اس کے پس انداز کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے بلکہ اس کا کچھ معاوضہ بھی دینے کو تیار ہے۔ دوسری طرف اس کو یہ بھی علم ہے کہ اگر اسے اپنے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت لاحق ہو تو یہی ادارہ کچھ معاوضہ لیکر حسب ضرورت رقم مستعار بھی دے سکتا ہے۔

بنک کے بنیادی فرائض تو وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے لیکن

موجودہ زمانے میں ان فرائض کو انجام دینے کے طریقے کچھ اسقدر گوناگوں اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کو واضح کرنے کے لیے بنکوں کے کام مختلف عنوانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ یہاں ہم ان تمام عنوانوں کی تشریح نہیں کر سکتے لہذا بنکوں کے صرف مندرجۂ ذیل چار اہم کام بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں: ایک نوٹ جاری کرنا، دوسرے امانتیں حاصل کرنا، تیسرے ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹوں پر بٹہ کاٹنا، چوتھے قرضے دینا۔

(۱) نوٹ جاری کرنا۔ جب کوئی بنک اپنے نوٹ جاری کرتا ہے تو ہر ایسے نوٹ کی بدولت جو جاری کیا جائے، عندالطلب رقم ادا کرنے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ نوٹ جاری کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ سونا یا چاندی لیکر اس کے ہمقدر نوٹ دیدیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ وہ قرضے کی شکل میں کسی قرض گیرندہ کو عطا کیے جائیں۔ پہلی صورت میں بنک گویا سونا یا چاندی خریدتا ہے اور بعوض میں فروشندہ کو یہ حق عطا کرتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے، بنک سے وہی سونا یا چاندی تو نہیں البتہ اس کے مساوی المقدار سونا یا چاندی طلب کرے۔ دوسری صورت میں عندالطلب سونا یا چاندی حاصل کرنے کے حقوق کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے۔ ایک طرف بنک کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ قرض گیرندہ سے اپنی مستعار دی ہوئی رقم واپس طلب کرے۔ دوسری طرف قرض گیرندہ کو یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے، نوٹ پیش

کرکے بنک سے سونا یا چاندی وصول کرے۔ فرق یہ ہے کہ قرض گیرندہ اپنے خرید کردہ حقوق کی مقدار پر سود ادا کرنا پڑتا ہے اور بنک کو اپنے جاری کردہ نوٹوں پر کوئی سود نہیں ادا کرنا پڑتا۔

(۲) امانتیں حاصل کرنا:۔ امانتیں دو قسم کی ہوتی ہیں میعادی اور غیر میعادی۔ اصطلاح میں غیر میعادی امانت کو "رواں کھاتہ" اور میعادی امانت کو "امانتی کھاتہ" کہا جاتا ہے۔ رواں کھاتوں کی شکل میں امانتیں حاصل کرنا اور نوٹ جاری کرنا، بنک کے حق میں ان دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں بنک پر ایک ہی قسم کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے (یعنی عند الطلب سونا یا چاندی ادا کرنا) اور اس کے گاہکوں کو ایک ہی قسم کا حق حاصل ہوتا ہے (یعنی عند الطلب سونا یا چاندی حاصل کرنا) فرق ہے تو صرف اسقدر کہ ایک صورت میں سونا یا چاندی طلب کرنے کا حق منتقل کرنے کے لیے محض نوٹ دوسرے کے حوالے کر دینا کافی ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں اس حق کی منتقلی بنک اور اس کے گاہکوں کے مابین ایک قسم کے معاہدے پر مبنی ہوتی ہے جس کی رو سے گاہک ایک تحریر کے ذریعے جسے اصطلاح میں "چک" کہا جاتا ہے، اپنا حق منتقل کر سکتے ہیں۔

لیکن "امانتی کھاتوں" کی صورت میں بنک کی ذمہ داری کی نوعیت کسی قدر بدل جاتی ہے۔ امانتی کھاتہ داروں کو ان کی رقموں پر بنک کی جانب سے سود ادا کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے چک لکھکر عند الطلب

سونا یا چاندی وصول کرنے کا انھیں کوئی حق نہیں دیا جاتا۔ بلکہ جب تک ایک خاص میعاد، جو پہلے سے طے کرلی جاتی ہے، گذر نہ لے، امانتی کھاتوں کی رقم واپس نہیں ہو سکتی۔

(۳) ہنڈیوں پر بٹہ کاٹنا:۔ جب کوئی بنک ہنڈیوں یا پرامیسری نوٹوں پر بٹہ کاٹتا ہے تو وہ سونا یا چاندی طلب کرنے کا ایک حق، جو آیندہ کسی میعاد معینہ کے بعد واجب الادا ہونے والا ہے خریدتا ہے اور اس کے معاوضے میں اپنے گاہک کو فوراً رقم طلب کرنے کا حق عطا کرتا ہے۔ اس بنا پر بنک جو سود وصول کرتا ہے، اُسے اصطلاح میں "بٹہ" کہتے ہیں۔ گاہک اس وجہ سے بٹہ ادا کرتے ہیں کہ اس کی بدولت انھیں فوری استعمال کے لیے رقم مل جاتی ہے۔

فرض کرو کہ زید کے پاس سو روپیوں کی ایک ہنڈی موجود ہے جسے بکر سکار چکا ہے لیکن وہ تین ماہ کے بعد واجب الادا ہونے والی ہے۔ زید چاہتا ہے کہ اُسے ہنڈی کی رقم فوراً مل جائے۔ اس غرض سے وہ اپنے بنکدار کے پاس یہ ہنڈی پیش کرتا ہے اور بنکدار ایک روپیہ کاٹ کر ۹۹ روپے زید کے حساب میں لکھ لیتا ہے۔ اب زید کو تو یہ حق حاصل ہے کہ بنک سے فوراً اپنی رقم وصول کرے لیکن بنک کو یہ حق نہیں ہے کہ تین ماہ گذرنے سے پہلے بکر سے ہنڈی کی رقم کا مطالبہ کرے۔ گویا اس صورت میں بھی بنک عندالطلب سونا یا چاندی ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا ہے۔

(۴) قرضے دینا :- قرضے عطا کرنے کا کام ہنڈیون پر بٹہ کاٹنے ہی کے مشابہہ ہے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں بنک آیندہ ملنے والے حقوق کے معاوضے میں اپنے گاہکوں کو فوری حقوق عطا کرتا ہے۔

فرض کرو کہ زید اپنے بنک میں ایک ہزار روپیوں کے قرضے کی درخواست پیش کرتا ہے - اگر یہ درخواست منظور ہو جائے تو بنک میں زید کے نام ایک "قرضے کا کھاتہ" کھول دیا جائیگا اور اس میں ایکہزار روپے بمد رقم واجب الادا درج کردیے جائیں گے اور دوسری طرف یہی ایک ہزار روپے زید کے "رواں کھاتے" میں جمع کرلیے جائیں گے زید کو تو اپنے بنک سے ایک ہزار روپیوں کی حد تک فوراً رقم طلب کرنے کا حق مل جائیگا لیکن بنک کو اپنی مستعار دی ہوئی رقم واپس طلب کرنے کا حق آیندہ کسی وقت حاصل ہوگا۔ اس کے لیے یا تو پہلے سے کوئی میعاد مقرر کردی جائے گی یا جیسا کہ عام رواج ہے، بنک کو یہ اختیار دیا جائیگا کہ وہ زید کو واجبی اطلاع اور مہلت دیکر اپنی سہولت کے لحاظ سے رقم واپس طلب کرلے -

ساتواں باب

سرکاری مالیات

معاشیات کے جس شعبے میں حکومت کی آمدنی اور اس کے خرچ سے بحث کی جاتی ہے، اسی کو اصطلاح میں سرکاری مالیات یا بعض اوقات صرف مالیات کہتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کو آمدنی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ کون سی احتیاجات ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے حکومت بھی افراد کی طرح آمدنی کی خواہاں ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حکومت کے فرائض کی طرف متوجہ ہوں۔ حکومت کے فرائض کا ایک سرسری مطالعہ ہمیں یہ بتا دیگا کہ ہر حکومت کے ساتھ متعدد قسم کے مصارف لگے ہوئے ہیں جن کی تکمیل کے لیے وہ کچھ نہ کچھ ذرایع آمدنی تلاش کرنے پر مجبور ہے۔

حکومت کے فرائض

حکومت کے فرائض۔۔ دنیا میں حکومت کا کیونکر آغاز ہوا، یعنی انسانی جماعتوں نے باقاعدہ حکومتوں کے تحت رہکر زندگی بسر کرنا کب اور کس طور پر شروع کیا، مختلف فلاسفہ نے مختلف زمانوں میں

مملکت کے کون کون سے نظریے پیش کیے اور یہ نظریے کس حد تک صحیح یا غلط ثابت ہوسے، خود فرائض حکومت کے متعلق مختلف زمانوں میں علمائے معیشت کے درمیان کیا کیا اختلافات رہے اور اب بھی ہیں یہاں ہم ان تمام امور کو نظر انداز کرتے ہیں اور صرف ان خدمات کی تشریح اکتفا کرتے ہیں جن کا بجالانا آجکل متفقہ طور پر ہر مہذب حکومت کا لازمی فرض تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خدمات بھی بجائے خود بقدر کثیر اور بہ لحاظ اپنی نوعیت کے کچھ اسقدر پیچیدہ ہوگئی ہیں کہ یہاں ان سب کا یکے بعد دیگرے شمار کرنا غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا لہٰذا ہم بہ غرض سہولت حکومت کے فرائض کو حسب ذیل تین اہم شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں :-

(۱) ہر حکومت کا سب سے پہلا اور اہم فرض یہ ہے کہ جسقدر باشندے اس کی عملداری میں رہتے بستے ہوں، ان کے جان و مال کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھے۔ یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ انسان اپنی تہذیبی و اخلاقی ترقی کے بڑے بڑے دعووں کے باوجود ابھی اس حالت پر نہیں پہنچا ہے کہ دنیا سے جنگ و جدال کو بالکل ناپید کرسکے۔ قرون اولی اور قرون وسطی کے نیم مہذب انسانوں کی طرح دور جدید کے مدعیان تہذیب بھی ہمیشہ اس بات پر آمادہ رہتے ہیں کہ جب کبھی موقع ملے، کمزور اقوام پر اپنا سیاسی یا معاشی اقتدار قایم کریں، بہ ظاہر اشاعت تہذیب کی خاطر لیکن درحقیقت ذاتی اغراض

ومفاد کے لیے کمزور ممالک کے باشندوں کو اُن کے واجبی حقوق سے محروم کر دیں اور خود ان کے قدرتی وسائل سے مستفید ہوں۔ بہر حال یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرونِ ماضیہ کی طرح موجودہ زمانے میں بھی ہر طاقتور ملک دوسرے کمزور ممالک کو اپنے زیر اثر لانے کی فکر میں لگا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ان طاقتور ممالک کے درمیان آئے دن جھگڑے فساد اور جنگ و جدال برپا ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کیا کوئی حکومت اپنی رعایا کے جان و مال کی کما حقہ حفاظت کر سکتی ہے جب تک کہ وہ دشمنوں کے خلاف اپنے ملک کی مدافعت کا پورا پورا اہتمام نہ کر لے۔ اگر وہ اپنے اس اہم فرض سے غفلت کرے گی تو نہ صرف رعایا کی تباہی کا باعث بنے گی بلکہ خود بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے گی۔ اپنے اسی اہم فرض کو پورا کرنے کے لیے حکومتیں اپنی اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق مستقل فوجیں نوکر رکھتی ہیں، ان کو طرح طرح کے اسلحہ اور ساز و سامان سے آراستہ کرتی ہیں اور بڑے بڑے ایروپلین اور جنگی موٹروں پر سال بہ سال لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہیں۔

(۲) حکومت کا دوسرا اہم فرض یہ ہے کہ اپنی عملداری کے تمام علاقوں میں مکمل امن و امان قایم رکھے۔ ہر انسانی آبادی میں چند شریر افراد ضرور موجود ہوتے ہیں جو اگر موقع ملے تو دوسرے افراد کے حقوق چھین لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔ لازم ہے کہ حکومت جس طرح بیرونی دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتی ہے، اسی طرح

وہ ملک کے اندر شریر عناصر کی زیادتیوں سے امن پسند باشندوں کی زندگی محفوظ و مامون رکھنے کا بھی انتظام کرے۔ ورنہ طاقتور، کمزوروں کو دولتمند، مفلسوں کو اور بدطینت، نیک نفسوں کو اپنا غلام بنالینے میں پس و پیش نہ کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت قسم قسم کے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ کرتی ہے، پولیس کے ذریعہ سے اشرار النفس افراد کی نگرانی کرتی ہے، عدالتوں کے ذریعہ سے مظلوموں کی داد رسی کا اہتمام کرتی ہے اور شریروں کو سزا دینے کے لیے محابس قایم کرتی ہے۔

(۳) مذکورۂ بالا فرائض پر عمل کرنے سے حکومت اپنے باشندوں کے لیے بلاشبہ ایک پُرامن زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کردیتی ہے، لیکن محض اس قسم کے مواقع مہیا کردینا کسی حکومت کے وجود کا نصب العین نہیں ہوسکتا۔ حکومت کے وجود کا حقیقی منشا، یہ ہے کہ وہ ملک کے اندر ایسے حالات پیدا کرے جن کی بدولت باشندوں کی مرفہ الحالی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے، علوم و فنون کی روزافزوں ترقی ہو اور اخلاقی و روحانی ترقیات کا میدان کھلا رہے۔ ملک کو اندرونی و بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھکر مکمل امن و امان قایم کرنا، اس حقیقی نصب العین تک پہنچنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ وہ بجائے خود کوئی نصب العین نہیں ہے۔ لھذا جو حکومتیں امن و امان قایم کرکے یہ خیال کرلیتی ہیں کہ انہوں نے اپنے اہم فرایض سے سبکدوشی حاصل کرلی، وہ غلطی پر ہیں۔ وہ اپنے وجود کا اصلی منشا یا تو جانتی ہی نہیں یا اگر جانتی ہیں تو اس سے

قصداً گریز کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانے میں کوئی حکومت بہت دیر تک ایسی جہالت میں مبتلا نہیں رہ سکتی اور نہ وہ اپنے اعلیٰ فرائض سے زیادہ مدت تک قصداً گریز کر سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض کو پورے پورے طور پر انجام دے ورنہ اُسے بہت جلد ایک بہتر حکومت کے لیے جگہ خالی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ یہی وہ احساس ہے جو ہر حکومت کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اپنی اپنی رعایا کی جسمانی صحت کا معیار بلند کرنے کی تدبیریں اختیار کرے۔ ایسے انتظامات کرے جن کی بدولت باشندوں کو کھانے کے لیے کافی مقدار میں اچھی اور صحت بخش غذا، پہننے کے لیے حسب ضرورت کپڑا اور رہنے کے لیے صاف ستھرے اور ہوادار مکان میسر ہوں۔ حفظانِ صحت کا مکمل اہتمام ہو تاکہ ملک وباؤں اور بیماریوں سے محفوظ رہے اور طبی امداد اسقدر وسیع اور موثر ہو کہ جو کچھ امراض پیدا بھی ہوں، وہ باشندوں کے حق میں مہلک نہ ثابت ہوں۔ جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ دماغی ترقیوں کے لیے بھی موافق حالات پیدا کرنا حکومت کا اہم فرض ہے۔ مثلاً تعلیم اسقدر عام ہو کہ ملک کا کوئی باشندہ ایسا نہ رہ جائے جسے لکھنا پڑھنا اور معمولی حساب نہ آتا ہو۔ صنعتی اور حرفتی تعلیم ایسی وسیع ہو کہ ملک میں اعلیٰ درجے کے صناعوں اور با مہارت پیشہ وروں کی کوئی قلت نہ محسوس ہو۔ اور نہ ایسے اشخاص نایاب ہوں جو زراعت، صنعت، تجارت، نقل و حمل

اور پیدائش دولت کے دوسرے تمام شعبوں میں جدید طریقوں سے کام لیکر ملک کی مرفہ الحالی میں خوب اضافہ کرسکیں۔ مزید براں یہ بھی حکومت ہی کا کام ہے کہ پیدائش دولت کے مختلف شعبوں کی ترقی کے لیے جو جو تدبیریں ضروری معلوم ہوں، انھیں اختیار کرے اور رعایا ان کے اختیار کرنے پر آمادہ کرے۔ تاکہ ملک کے قدرتی وسائل سے کماحقہ استفادہ کیا جا سکے اور اس طور پر عام خوشحالی میں اور بھی اضافہ ہو، باشندوں کا معیار زندگی روز بروز بلند ہوتا جائے اور وہ ادنی معاش کی فکروں سے بلند ہو کر نئی نئی علمی تحقیقات اور روحانی ترقیات کی طرف مائل ہوں۔

حکومت کے فرائض کا جو سرسری خاکہ اوپر پیش کیا گیا، اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کو آمدنی کی کس لیے ضرورت ہے اور وہ کون سی احتیاجات ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے حکومت آمدنی کی خواہاں ہوتی ہے۔ ملک کو بیرونی دشمنوں سے بچانے کے لیے فوجی قوت برقرار رکھنا، اندرونی امن و امان حاصل کرنے کے لیے پولیس عدالتیں اور مجالس قایم رکھنا اور عام معاشی اور علمی ترقیات کے لیے تمام ضروری تدبیریں اختیار کرنا، یہ فرائض بغیر کثیر آمدنی کے انجام نہیں پا سکتے۔ چنانچہ اسی بنا پر حکومتیں ہمیشہ نئے نئے ذرایع آمدنی مہیا کرنے کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔ آیندہ عنوان میں ہم انھی ذرایع کی مختصر کیفیت بیان کریں گے۔

حکومت کے ذرائع آمدنی

حکومت کے ذرائع آمدنی۔ حکومت کے ذرائع آمدنی کی ہم بہ غرض سہولت حسب ذیل تقسیم کرسکتے ہیں:۔

سرکاری آمدنی

- بذریعہ ٹکس یا محصول
- بذریعہ قرضہ
- دیگر ذرائع سے
  - سرکاری جائداد
  - سرکار کے تجارتی کاروبار
  - سررشتہ جات نظم و نسق کی اتفاقی آمدنیاں

(۱) سرکاری جائداد۔ قرون ماضیہ میں حکومت کی آمدنی کا اکثر و بیشتر حصہ سرکاری زمینوں سے حاصل ہوتا تھا امراء، عہدہ دار اور شاہی خاندان کے اراکین کو شاہ وقت کی جانب سے بڑی بڑی زمینیں عطا کی جاتی تھیں اور یہ لوگ بجائے اس کے کہ زر کی شکل میں بادشاہ کے لیے آمدنی مہیا کریں، وقت ضرورت بڑی بڑی فوجوں سے اس کی مدد کرتے تھے، گویا بہ شکل نقد ٹکس ادا کرنے کے بجائے وہ فوجی خدمات کی شکل میں حکومت کا ہاتھ بٹاتے تھے اور اسطرح حکومت کی اہم ترین ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی تھی۔ لیکن جوں جوں زر کا استعمال بڑھتا گیا، خدمات کی شکل میں آمدنی حاصل کرنے کا طریقہ متروک ہوتا گیا اور موجودہ زمانے میں تم شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے۔ البتہ بعض ایسے ممالک جہاں جنگلات اور معدنیات کثرت سے پائے جاتے ہیں اس ذریعے سے آجکل بھی قابل لحاظ آمدنی حاصل کرتے ہیں۔

(۲) تجارتی کاروبار۔ بعض تجارتی کاروبار اس نوعیت کے ہیں کہ اگر انھیں خانگی افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے تو وہ

عوام کے حق میں بجائے نفع بخش ہونے کے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے اجاروں کی یہی حالت ہے۔ ایسے کاروبار یا تو حکومت خود اپنے طور پر چلاتی ہے یا اگر خانگی افراد کے ہاتوں میں چھوڑتی بھی ہے تو ان پر اپنی جانب سے سخت نگرانی قائم رکھتی ہے تاکہ وہ ذاتی منافع کے لالچ میں مفاد عام کے خلاف کوئی طرز عمل نہ اختیار کرسکیں۔ اس کے علاوہ بعض کاروبار سیاسی مصلحتوں کی بنا پر خانگی افراد کے سپرد نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے ان کی سربراہی حکومت ہی کے ذمے رہتی ہے۔ چنانچہ سکہ سازی اور خبر رسانی کے کام بالعموم حکومتیں خود ہی انجام دیتی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں پانی، روشنی اور ذرائع آمد و رفت کی بہم رسانی بالعموم خود بلدیات کی جانب سے کی جاتی ہے۔ اکثر ممالک میں ریلوں کا کاروبار بھی حکومت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا حکومت کے ذرائع آمدنی میں سرکار کے تجارتی کاروبار کی آمدنی بھی ایک اہم ذریعہ ہے

(۳) اتفاقی آمدنیاں:۔ ہر حکومت نظم و نسق کے اغراض کے لیے بہت سے محکمے قائم کرتی ہے۔ اگرچہ ان محکموں کا اصلی منشا حصول آمدنی نہیں ہے تاہم اتفاقی طور پر ان سے کچھ نہ کچھ آمدنی ملجاتی ہے۔ عدالت، تعلیمات اور پولیس کے محکموں کی آمدنی اس کی موزوں مثالیں ہیں۔ باجگزار ریاستوں کا خراج، ضبطیوں اور جرمانوں کی آمدنی، دفینہ یم پوشیدہ خزانوں کا دستیاب ہونا، یہ سب انھی عنوانات میں شامل ہیں۔

(۴) ٹکس یا محصول:۔ مذکورۂ بالا تینوں ذرائع۔ مجموعی

مجموعی طور پر جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، وہ زمانہ موجودہ کی اکثر و بیشتر حکومتوں
کی مجموعی آمدنی کا ایک نسبتاً قلیل جزو ہوتی ہے۔ آجکل جس ذریعہ
آمدنی پر تمام مہذب حکومتوں کا زیادہ تر مدار ہے، وہ ٹکس یا محصول ہے۔
مسٹر بیسٹیبل نے اپنی کتاب "سرکاری مالیات" میں جو اس فن کی ایک نہایت
مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے، ٹکس کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:
"ٹکس کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بالحاظ اس کی رضامندی
یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لیے حاصل کیا جاتا ہے" آیندہ عنوان
میں ہم ٹکس کے اصول اور اس کے اقسام نہایت اختصار کے ساتھ
بیان کریں گے۔

(۵۱) سرکاری قرضہ۔ بسا اوقات حکومتوں کو ایسے غیر معمولی
اور ناگزیر اخراجات لاحق ہو جاتے ہیں کہ مذکورۂ بالا تمام ذرایع آمدنی
ان کے لیے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہر حکومت لازمی طور پر
قرض لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں تمام ترقی یافتہ
ممالک کی حکومتیں بڑے بڑے قرضوں میں مبتلا ہیں اور ہر سال لاکھوں
بلکہ کروڑوں روپیہ محض سود کی مد میں ادا کرتی ہیں۔ اس مبحث کے
متعلقہ مسائل کی مختصر کیفیت آیندہ سرکاری قرضے کے عنوان میں
ملے گی۔

ٹکس کے اصول

ٹکس کے اصول۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ٹکس
کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بالحاظ اس کی

رضامندی یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لیے حاصل کیا جاتا ہے
ادا کرنے والے کو خاص طور پر کسی شے یا خدمت کی شکل میں اس کا
کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ مثلاً ڈاک خانے کے ٹکٹ کی جو قیمت ادا
کی جاتی ہے، اسے ہم ٹکس نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ اس خدمت کا معاوضہ ہے
جو ہم اس کے ذریعے سے خریدتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بلدیہ اپنے
شہر کی آبرسانی کا انتظام کر کے باشندوں سے محصول آبرسانی
وصول کرے، تو یہ محصول بھی درحقیقت کوئی ٹکس نہ ہوگا بلکہ وہ
بھی ٹکٹ کی قیمت کی طرح ایک خاص خدمت کا معاوضہ ہوگا۔ بہرحال
اگر حکومت براہ راست کسی شخص کی کوئی خدمت انجام دیکر اس کا
کوئی معاوضہ وصول کرے تو اُسے ہم ٹکس نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی
نوعیت درحقیقت معاوضہ خدمت کی سی ہے۔

لیکن اس سے کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ سرکار رعایا سے جو قسم
قسم کے ٹکس وصول کرتی ہے، اس کا انھیں کوئی معاوضہ نہیں دیتی۔
حقیقت یہ ہے کہ سرکاری محاصل کی جملہ آمدنی رعایا ہی کے عام اغراض و
مفاد پر خرچ کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک ٹکس کا تعلق ہے، اس میں
یہ تخمینہ نہیں کیا جاتا کہ کسی خاص شخص نے حکومت کو کتنا ٹکس ادا کیا اور
اس کے معاوضے میں حکومت نے اس کی کیا خدمت انجام دی اور اُسے
خاص طور پر کسقدر فایدہ پہنچایا۔ فوج، پولیس اور عدالتوں کے قیام
سے ہر شخص ضرور کچھ نہ کچھ فایدہ حاصل کرتا ہے۔ باوجود اس کے جو ٹکس

وہ ادا کرتا ہے، اُسے ہم اِن خدمات کی قیمت نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ٹیکس ادا کرنا یا نہ کرنا اس کا اختیاری امر نہیں ہے۔ اگر وہ اپنی دانست میں یہ خیال کرلے کہ اُسے حکومت سے کوئی فایدہ نہیں پہنچ رہا ہے، تب بھی وہ اتنا ہی ٹیکس ادا کرنے پر مجبور ہے۔

ٹیکس یا محصول کی بالعموم دو قسمیں کی جاتی ہیں: ایک بلا واسطہ دوسرے بالواسطہ محصول بلاواسطہ سے مراد وہ ٹیکس ہے جس کا بار ادا کرنے والے پر ہی قایم رہے، کسی دوسرے شخص پر منتقل نہ ہوسکے مثلاً انکم ٹیکس، محصول وراثت، لیسنس فیس، محصول مکان وغیرہ اس کے برعکس اگر ٹیکس کا بار ادا کرنے والے پر قایم نہ رہے بلکہ کسی اور شخص پر منتقل کیا جاسکے تو اسے محصول بالواسطہ کہتے ہیں۔ کیونکہ ٹیکس کا بار اٹھانے والا خود براہ راست حکومت کو کوئی رقم نہیں دیتا بلکہ ایک تیسرے شخص کے توسط سے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ کروڑگیری (محصول درآمد و برآمد) اور چنگی (محصول پیداوار ملکی) اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ درآمد و برآمد اشیا پر جو محصول لیا جاتا ہے وہ بظاہر تو ان اشیا کی تجارت کرنے والوں سے وصول کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت گراں قیمتوں کی شکل میں اس کا بار ان اشیا کے خریداروں پر پڑتا ہے۔ اسی طرح ملکی پیداوار کا محصول بظاہر کارخانہ دار ادا کرتے ہیں لیکن دراصل وہ بھی خریداروں ہی کی جیبوں سے نکلتا ہے۔

یوں تو کروڑگیری کے تحت درآمد و برآمد، دونوں قسم کے محصول

شامل ہیں لیکن زمانہ موجودہ میں لوگ محاصل برآمد کو بالعموم نہیں پسند کرتے۔ چنانچہ اکثر ممالک میں وہ قریب قریب پورے طور پر منسوخ ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل کروڑگیری سے مراد بالعموم وہ آمدنی ہے جو محاصل درآمد کے ذریعہ سے جمع ہوی ہو۔ اب ان محاصل کی خود دو قسمیں کی جاتی ہیں: ایک بہ حساب پیمانہ، دوسرے بہ حساب قیمت مثلاً اگر چائے پر (خواہ اس کی قیمت کچھ ہی ہو) فی پونڈ ایک آنہ محصول لگایا جائے تو یہ محصول درآمد بہ حساب پیمانہ کی مثال ہوگی۔ اس کے برعکس اگر چائے کی قیمت پر فی روپیہ ایک آنہ محصول لیا جائے تو یہ محصول درآمد بہ حساب قیمت کی مثال ہوگی۔ پہلے طریقے میں یہ خرابی ہے کہ ارزان چائے پر بہ مقابل گران چائے کے ٹکس کا زیادہ بار پڑتا ہے گویا دولتمندوں سے کم اور غریبوں سے زیادہ محصول لیا جاتا ہے۔ مگر دوسرے طریقے میں یہ نقص ہے کہ لوگوں کو اپنے مال کی قیمتیں ظاہر کرنے میں دروغ بیانی سے کام لینے کی ترغیب ہوتی ہے جس کو روکنے کے لیے بڑی تعداد میں ماہر اشخاص نوکر رکھنے پڑتے ہیں اور ٹکس جمع کرنے کا خرچ بہت بڑھجاتا ہے۔

ملک ہی میں تیار ہونے والی اشیا پر جو محصول لیا جاتا ہے اسے چنگی یا محصول پیداوار ملکی کہتے ہیں مثلاً چند سال پیشتر تک ہندستانی کارخانوں میں جو کپڑا تیار ہوتا تھا، اسپر حکومت ہند محصول عاید کرتی تھی ریاست حیدرآباد میں ابکاری کی آمدنی اس محصول کی ایک مثال ہے۔

آدم اسمتھ نے اپنی مشہور کتاب "دولت اقوام" میں ٹکس کے حسب ذیل قوانین بیان کیے ہیں:-

(۱) ہر مملکت کی رعایا کو چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے، یعنی اُس آمدنی کے تناسب سے جو انھیں مملکت کے زیر حفاظت اپنے اپنے طور پر حاصل ہوتی ہے، حکومت کے اخراجات میں شریک ہوں...... (۲) جس ٹکس کا ادا کرنا ہر فرد پر لازمی ہو، وہ بالکل باقاعدہ اور یقینی ہونا چاہیئے۔ وقت ادائیگی، طریقۂ ادائیگی، مقدار ٹکس، یہ تمام امور نہ صرف ادا کرنے والے پر بلکہ دوسرے تمام اشخاص پر بھی واضح ہونے چاہئیں...... (۳) ٹکس ایسے وقت پر اور اس طریقے سے عاید کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق میں زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو...... (۴) ہر ٹکس اس طور پر تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جسقدر رقم سرکاری خزانے میں داخل ہوتی ہے، اس کے علاوہ حتی الوسع کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبوں سے خارج ہو"

اصطلاح میں ان اصولوں کو علی الترتیب قانون معدلت قانون تیقن، قانون سہولت اور قانون کفایت کہتے ہیں۔ جہاں تک آخری تین قوانین کا تعلق ہے وہ اسقدر بدیہی اور قرین مصلحت ہیں کہ ان کی صحت پر کسی کو نہ کوئی اعتراض ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ لیکن قانون معدلت کے متعلق معاشین میں ہمیشہ زبردست اختلافات موجود رہے اور کبھی اس بات کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ "اپنی اپنی قابلیت کے

تناسب" کے کیا معنی ہیں۔ اول اول لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر تمام آمدنیوں خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، ایک ہی شرح سے محصول لگایا جائے یا بالفاظ دیگر **محصول متناسب** کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے قانون معدلت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر محصول متناسب کی شرح ۲ فیصدی مقرر کی جائے تو سو روپے آمدنی والے کو دو روپے، پانسو روپے آمدنی والے کو دس روپے، ہزار روپیہ آمدنی والے کو بیس روپے اور لاکھ روپے آمدنی والے کو دو ہزار روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ ہر شخص کی استطاعت ٹھیک اس کی آمدنی کے مطابق ہوتی ہے تو پھر اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی طریقے پر یعنی آمدنی کے تناسب سے ٹکس ادا کرے۔ لیکن آجکل یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جیسے جیسے کسی شخص کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، اس کی استطاعت میں اسی نسبت سے نہیں بلکہ اس سے زیادہ سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لہذا اگر استطاعت کے مطابق ٹکس وصول کرنا مقصود ہے تو ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی آمدنی یا جائداد پر محصول متزائد کے طریقے پر ٹکس ادا کرے یعنی جیسے جیسے آمدنی یا جائداد کی مقدار بڑھتی جائے، شرح محصول میں بھی اضافہ ہوتا جائے مثلاً دو ہزار سے پانچ ہزار تک کی آمدنیوں پر ۲ فیصدی، پانچ ہزار سے دس ہزار تک کی آمدنیوں پر تین فیصدی اور دس ہزار سے پچیس ہزار تک کی آمدنیوں پر پانچ فیصدی وعلیٰ ہذا۔ عام علماء آمد کے مطابق جب تک

کسی شخص کی آمدنی ایک خاص مقدار مثلاً دو ہزار روپیوں تک نہ پہنچ جائے، اس سے ٹیکس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ جس شخص کی آمدنی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی پرورش ہی کے لیے بمشکل کفایت کرے، اس کے متعلق یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی آمدنیاں ایک مقدار معینہ سے کم ہوں انھیں ادائی ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی آمدنی اس حد سے بڑھ جائے یعنی اس کے پاس پرورش خاندان کے مصارف کے بعد کچھ بچ رہے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس شخص میں ٹیکس ادا کرنے کی کچھ نہ کچھ قابلیت موجود ہے۔ اس اصول کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ٹیکس لگانے میں طریق تدریج سے ضرور کم و بیش کام لیا جائے چنانچہ آجکل ہر جگہ محصول تناسب کا طریقہ قریب قریب متروک ہو چکا ہے اور اس کے عوض محصول متزاید یا محصول تدریجی کا طریقہ رائج ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس تدریج کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر اضافۂ آمدنی کے ساتھ ساتھ شرح محصول میں متواتر اضافہ کرنا کس حد تک قرین مصلحت ہوگا۔ واضح رہے کہ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا آسان نہیں ہے۔ البتہ مشہور مثل کے مطابق یہ بدیہی ہے کہ طلائی انڈے دینے والی کو مرغی کو ذبح کر ڈالنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں ہے۔ لوگ اپنی غیر معمولی قابلیتوں سے کام لیکر سالہاسال کی ان تھک کوششوں سے ملک میں بڑے بڑے

کاروبار جاری کرتے ہیں ۔ اگر ٹکس بڑھتے بڑھتے ان لوگوں کے حق میں بہت زیادہ گراں بار بن جائیں گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کی ہمتیں پست نہ ہو جائیں اور اجتماع دولت، عالی حوصلگی، اور کفایت شعاری کے راستے میں نامناسب مزاحمتیں پیدا نہ ہو جائیں اور اس طرح بالآخر خود حکومت کو کوئی ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ جائے ۔ اس بنا پر بعض معاشین کی یہ تجویز ہے کہ آدم اسمتھ کے چار قوانین کے ساتھ ٹکس کا یہ پانچواں قانون اور شامل کیا جائے کہ ہر ٹکس جہاں تک ممکن ہو سکے، کم سے کم ضرر رساں ہو ۔

سرکاری قرضہ

سرکاری قرضہ ۔ جب کوئی غیر معمولی ضروریات درپیش ہوں اور ان کے لیے موجودہ آمدنی ناکافی ہو تو باشندوں سے قرض لے لیکر ان ضروریات کی تکمیل کر لینا، یہ بادشاہوں اور حکومتوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے ۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں بادشاہ بالعموم غیر ملکی تاجروں سے جو اُن کے ممالک میں بہ غرض تجارت آیا کرتے تھے، قرض لیتے تھے ۔ بادشاہ کی نظر عنایت کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ تاجر صحیح سالم رہکر اپنا کاروبار جاری رکھ سکیں ۔ لھذا ان کی یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ بادشاہ کو قرضہ دینے سے انکار کر دیں ۔ لیکن موجودہ زمانے میں اس قسم کی مجبوری کی نہ کوئی گنجایش ہے اور نہ ضرورت ۔ حکومتیں خود ان رقوم کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہیں اور ان پر اچھا خاصا سود بھی ادا کرتی ہیں ۔ نتیجہ یہ کہ باشندے اپنا اپنا اندوختہ خوشی خوشی نہایت

بشوق کے ساتھ حکومت کے حوالے کردیتے ہیں۔

حکومت کو قرضہ دینے میں باشندوں کی اصلی غرض تو یہی ہوتی ہے کہ اپنے اندوختے سے کچھ مزید آمدنی پیدا کریں۔ لیکن بعض اوقات حب وطن اور قومی جوش جیسے جذبات بھی لوگوں کو اپنا سرمایہ حکومت کے حوالے کرنے پر آمادہ کردیتے ہیں۔ چنانچہ ممالک یورپ کے موجودہ عظیم الشان قومی قرضے کم و بیش پورے طور پر جنگ آزمائیوں کا ہی نتیجہ ہیں۔ صرف ان ممالک میں جو نئے آباد ہوے ہیں، یا ان قدیم ممالک میں جہاں نئی ترقیات کا ابھی آغاز ہوا ہے، کچھ قومی قرضے ایسے نظر آتے ہیں جو ریلوں کی تعمیر یا وسائل آبپاشی کی توسیع یا بندرگاہوں کی تعمیر یا اسی قسم کے دوسرے پیداآور کاموں کا نتیجہ ہیں۔ ہندوستان کے قومی قرضے کا بڑا حصہ ایسے ہی کاموں میں صرف ہونے کی وجہ سے پیداآور اور ملک کے لیے مفید خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ گذشتہ جنگ کی بدولت، یہاں کے قومی قرضے کا غیر پیداآور جزو بہ نسبت سابق بہت بڑھ گیا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں حکومت کے غیر معمولی مصارف اسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ محض باشندوں پر ٹکس لگا کر کل مطلوبہ رقم مہیا کرنا قطعاً ناممکن ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ ذرائع آمدنی میں، جہاں تک ممکن ہوسکے، توسیع کی جاتی ہے، شرح ٹکس میں جہاں تک ممکن ہوسکے، اضافہ کیا جاتا ہے، اور حتی الوسع نئے

نئے ٹکس بھی عاید کیے جاتے ہیں۔ لیکن جنگ جاری رکھنے کے
مصارف اسقدر عظیم الشان ہوتے ہیں کہ محض اِن ترکیبوں سے
کام نہیں چلسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتیں جنگ کے زمانے میں بالعموم
قرضہ لینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ باشندوں پر جبر کرکے اُن کے گاڑھے
پسینے کی کمائی بلا معاوضہ چھین لینا، نہ ممکن اور نہ ایسے نازک وقت
میں مناسب۔ لہٰذا ایک قابل عمل تدبیر یہی ہے کہ انھیں مزید معاوضے
کا لالچ دیکر اور ساتھ ہی حب وطن اور جوشِ قومی کے جذبات کو
ابھار کر حسب ضرورت رقم بہ طور قرض حاصل کرلی جائے۔ تجربہ
شاہد ہے کہ لوگ اِن حالات میں بسا اوقات دل کھول کر اپنی
قومی حکومت کی مدد کرتے ہیں۔ حتی کہ بعض اوقات یہ اندیشہ پیدا
ہوجاتا ہے کہ کہیں اسقدر آسانی کے ساتھ رقم ملتی دیکھ کر حکومت
زاید از ضرورت سرمایہ قرض نہ لے لے اور ملک کو خواہ مخواہ قرضے
کی مصیبتوں میں نہ پھنسائے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ
آج جسقدر زیادہ رقم قرض لی جائے گی، کل اُسی قدر ملک پر زیادہ
بار پڑیگا۔ ادائی سود اور واپسیِ اصل، دونوں کے لیے باشندوں پر
اسے بھی زیادہ ٹکس لگانے پڑیں گے۔

مصارفِ جنگ کے لیے قرضے لیکر سرمایہ مہیا کرنے کے طریقے کو
بسا اوقات اس بنا پر ناپسند کیا جاتا ہے کہ اس کی بدولت آیندہ
نسل پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال ہے

بنے کہ آیندہ نسلوں کو اس بار میں شریک کرنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ جنگ کی بدولت جو فواید حاصل ہوتے ہیں، ان سے وہی مستفید ہوتی ہیں۔ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو اس بار کو درحقیقت کوئی بار ہی نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جو رقمیں بہ شکل ٹکس باشندوں کی جیبوں سے نکلتی ہیں، وہ انہی میں سے بعض کو بہ شکل سود واپس ہو جاتی ہیں۔ ان مختلف خیالات کی تحقیق اور ان کے موافق و مخالف دلایل پر غور کرنے کی یہاں گنجایش نہیں ہے۔ البتہ ان قرضوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے جو ترکیبیں وقتاً فوقتاً پیش کی جاتیں اور بعض اوقات عمل میں بھی لائی جاتی ہیں، ان کا مختصر سا حال ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

قومی قرضہ ادا کرنے کی ایک مشہور تدبیر "سنکنگ فنڈ" یا "ذخیرہ ادائی" کا طریقہ ہے۔ اس طریقے کے مطابق حکومت ایک فنڈ یا ذخیرہ قایم کرتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ وہ ہر سال اس ذخیرے میں ایک معینہ رقم داخل کرے گی۔ تاکہ اس طور پر جو سرمایہ جمع ہو جائے، اس سے قومی قرضہ ادا کیا جا سکے۔ لیکن چونکہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ خواہ اپنا وعدہ پورا کرے یا نہ کرے، اس لیے بسا اوقات تنگی کے زمانے میں حکومت ایفائے وعدہ سے گریز کرتی ہے اور ذخیرۂ ادائی میں پابندی کے ساتھ رقم نہیں جمع ہونے پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ قومی قرضہ ادا کرنے کے

اس طریقے کو اب تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قومی قرضے کا بار ہلکا کرنے کی ایک تدبیر بھی ہے کہ آئندہ شرحِ سود میں تخفیف کردی جائے۔ جنگ کے زمانے میں جبکہ قومی قرضے خاص طور پر مطلوب ہوتے ہیں، شرح سود بالعموم بہت اعلیٰ ہوتی ہے۔ اور اختتام جنگ کے بعد جب امن قائم ہوجاتا ہے تو وہ گھٹتے گھٹتے پھر معمولی سطح پر آجاتی ہے لیکن حکومت نے جس اعلیٰ شرح پر قرضہ حاصل کیا تھا اسی کے مطابق وہ اب بھی سود ادا کرنے پر مجبور ہے اور یہ درحقیقت ایک ناواجبی بار ہے۔ فرض کرو کہ حکومت نے یہ دورانِ جنگ ۵ فیصدی سود پر قرضہ حاصل کیا تھا۔ لیکن بعدازاں بازار میں شرح سود گھٹ جاتی ہے اور اب حکومت کو ۳ فیصدی سود پر قرضہ ملسکتا ہے۔ ایسی حالت میں حکومت اپنے قرضخواہوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ انھیں آئندہ سے بجائے ۵ فیصدی کے صرف ۳ فیصدی سود ادا کیا جائیگا اگر وہ اس پر راضی ہوجائیں فبہا، ورنہ حکومت ۳ فیصدی سود پر حسب ضرورت رقم ازسرنو قرض لیکر قدیم قرضخواہوں کو واپس کرسکتی ہے۔ قرضخواہ بھی بازار کی حالت سے باخبر رہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ایسی عمدہ ضمانت پر اس سے زیادہ سود انھیں کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس لیے وہ بجائے اپنی رقم واپس لینے کے تخفیف شرح سود پر راضی ہوجاتے ہیں۔ قومی قرضے کا بار ہلکا کرنے کی

اس تدبیر کو اصطلاح میں طریق تبدیل کہتے ہیں۔ برطانوی حکومت کو نپولین اعظم کے ساتھ سالہا سال تک جو لڑائیاں لڑنی پڑیں، انکی وجہ سے اُس پر قومی قرضے بہت گرانبار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اسی بار کو ہلکا کرنے کی غرض سے حکومت مذکور نے انیسویں صدی میں متعدد مرتبہ یہ تدبیر اختیار کی۔ لیکن چونکہ یہ قرضے دواماً ایک معینہ شرح سود پر حاصل کیے گئے تھے اور بعد کو خلاف معاہدہ ان میں یہ تبدیلی پیدا کی گئی تھی، اس لیے حکومت پر وعدہ خلافی کا الزام لگایا گیا۔ چنانچہ انہی واقعات سے سبق لیکر گزشتہ جنگ عظیم میں جسقدر قرضے حاصل کیے گئے، وہ سب آیندہ معینہ تاریخوں پر بصراحت کے ساتھ قابل واپسی قرار دیے گئے ہیں تاکہ جب ان کی واپسی کی تاریخ آپہنچے اور اس وقت شرح سود گھٹی ہوی رہے تو وہی رقم دوبارہ ادنی شرح سود پر حاصل کی جاسکے۔

کثیر المقدار قومی قرضے کی وجہ سے حکومت کو جو مالی مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں حتی الوسع تخفیف کرنے کے لیے ایک تدبیر یہ پیش کی جاتی ہے کہ ملک کے تمام سرمایہ داروں اور مالکان جائداد کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے سرمایے یا اپنی جائداد کی نقد مالیت کا کوئی خاص جزو سرکار کو ادا کریں۔ واضح رہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں گوناگوں مشکلات پیش آنے کا قرینہ ہے۔ مثلاً بہت سی جائدادیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان کی ٹھیک

ٹھیک مالیت کا تعین کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کسی چالو کاروبار کی مالیت کا تخمینہ صرف ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں اور ماہرین کے درمیان بعض اوقات اختلاف رائے پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ کس کی رائے قبول کی جائے اور کس کی مسترد۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہم کسی طرح اس مشکل پر غالب آجائیں گے، تب بھی ایک اور اس سے زیادہ سخت مشکل پیش آنا یقینی ہے۔ وہ یہ کہ جب تمام مالکان جائداد سے یہ مطالبہ کیا جائیگا کہ وہ اپنی جائداد کی مالیت کا ایک جزو سرکار کو ادا کریں تو ظاہر ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر اپنی کچھ نہ کچھ جائداد فروخت کرنا چاہیں گے تاکہ اس کی قیمت سے سرکاری مطالبہ ادا کریں۔ لیکن قرینہ یہ ہے کہ ان حالات میں اُن کی جائداد کا شاید ہی کوئی خریدار ملے۔ کیونکہ ہر ایسا شخص جو جائداد خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ ہمارے مفروضے کے مطابق خود سرکاری مطالبہ ادا کرنے پر مجبور ہوگا اور شاید دوسروں کی جائداد خریدنے کے بجائے خود اپنی کچھ جائداد فروخت کرنے کا خواہشمند ہوگا۔ البتہ جو مالکان جائداد خود سرکار کے لیندار ہوں، ان کی حد تک یہ دقت رفع ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو اپنی جائداد کی قابلیت کے مطابق سرکار کو پانچ ہزار روپے ادا کرنے ہوں اور اس شخص کے پاس اسی کے ہمقدر سرکاری قرضے کے تمسکات موجود

ہوں تو وہ سرکار کو یہ تمسکات واپس کرکے اپنے حصے سے سبکدوشی حاصل کر سکتا ہے اور دوسری طرف سرکاری قرضے میں یا بچہزار کی تخفیف ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے حصے کی ادائیگی میں کسی ریلوے کمپنی کے حصص سرکار کے نام منتقل کر دے اور جب تک یہ حصص فروخت نہ ہوں، سرکار ان کی آمدنی سے اپنے قرضے کا سود ادا کرتی رہے اور جب وہ فروخت ہو جائیں تو ان کی قیمت سے اپنے قرضے کا ایک جزو بے باق کر دے۔ لیکن درحقیقت ایسے کاروبار بہت ہی کم ہوتے ہیں جن کے حصص لینے پر حکومت آمادہ ہو سکتی ہے۔ خاصکر مشتبہ کمپنیوں اور خانگی کاروبار کے حصص تو ہرگز حکومت کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ لھذا اصلی دقت بدستور قایم رہتی ہے۔ واضح رہے کہ ان دقتوں کو حل کرنے اور ان پر غالب آنے کے لیے قسم قسم کی تجویزیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن آیا وہ قابل عمل ہیں یا نہیں، اس بارے میں ماہرین مالیات قطعاً متفق الرائے نہیں ہیں۔ یہاں اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ ان تمام تجویزوں کی نوعیت اور ان کی عملی اہمیت پر کوئی مفصل بحث کی جائے۔ البتہ اسقدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ آجکل ممالک یورپ اپنے قومی قرضوں کے بوجھ سے کچھ اسقدر دبے ہوئے ہیں کہ ان کے بہترین دماغ اور بڑے بڑے مدبر شب و روز اس کو ہلکا کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

(تمام شد)

ضمیمہ

فہرست اصطلاحات مع ترجمہ انگریزی

آجر	Employer
آزاد ٹکسال	Free Coinage
آلہ مبادلہ	Medium of Exchange
آمدنی	Income
اجارہ	Monopoly
اجتماع اصل	Accumulation of Capital
اجرت	Wages
اجرت صحیحہ و متعارفہ	Real and Nominal Wages
اجرت وقت و اجرت عمل	Time and Piece Wages
اجرت کارکردگی	Efficiency Wages

احتیاجات	**Wants**
انتقام کاشت	**Margin of Cultivation**
استبدال	**Exchangibility**
اصل	Capital
اصل دایر	Circulating Capital
اصل قایم	Fixed Capital
اضافۂ رسد	Increase of Supply
اضافۂ طلب	Increase of Demand
اعتبار	Credit
افادہ	Utility
افادۂ کلی	Total Utility
افادۂ مختتم	Marginal Utility
امانت	Deposit

ب

بارٹر	Barter
بازار	Market
بازاری قیمت	Market Price
بامہارت محنت	Skilled Labour
بندش رسد	Contraction of Supply

Contraction of Demand	بست طلب
Bank	بنک
Banking	بنک کاری
Ejectment	بے دخلی
No-Rent Land	بے لگان زمین
Unskilled Labour	بے مہارت محنت
International Wealth	بین الاقوامی دولت

پ

Savings	پس انداز
Productive	پیدا آور
Productivity	پیدا آوری
Marginal Product	پیداوار مختتم
Small Scale Production	پیدایش بر پیمانہ صغیر
Large Scale Production	پیدایش بر پیمانہ کبیر
Production of Wealth	پیدایش دولت

ت

Localisation of Industries	تحصیر صنائع
Decrease of Supply	تخفیف رسد
Decrease of Demand	تخفیف طلب

Coinage	تسکینک
Elasticity of Demand	تغیر پذیری طلب
Distribution of Wealth	تقسیم دولت
Division of Labour	تقسیم عمل
Organization	تنظیم
Equlibrium of Demand and Supply	توازن طلب رسد
Migration	توطن
Immigration	توطن داخلی
Emigration	توطن خارجی
Consumer's Surplus	توفیر مصرف

ث

Stability of Value	ثبات قدر

(ٹ)

Tax	ٹیکس
Canons of Taxation	ٹیکس کے قوانین

ج

Dose	جرعہ
Marginal Dose	جرعۂ مختتم

—— – – – • ————

خ

خرچ	Expenditure

د

درشنی ہنڈی	Bill at Sight
دولت	Wealth

ذ

ذاتی دولت	Personal Wealth
ذخیرۂ ادائی	Sinking Fund
ذخیرۂ قدر	Store of Value
ذرائع آمدنی	Sources of Income

ر

رسد	Supply
رسد مرکب	Composite Supply
رسد مشترک	Joint Supply
رعایتی دن	Days of Grace
رواں کھاتہ	Current Account

ز

زر	Money or Currency
زرخیز	Fertility

Metallic Money	زرفلزی
Legal Tender	زرقانونی
Paper Money	زرکاغذی
Standard Money	زرمستند
Token Money	زروضعی
Land	زمین
Zamindrai Rent	زمینداری لگان

س

Credit	ساکھ
State Monopoly	سرکاری اجارہ
Public Debt	سرکاری قرضہ
Divisibility	سہم پذیری
Coin	سکہ
Interest	سود
Net Interest	سود خالص
Gross Interest	سود خام

ش

Rate of Interest	شرح سود
Individual Wealth	شخصی دولت

Cognisibility	شناخت پذیری
Investment of Capital	شغل اصل

ص

Consumption of Wealth	صرف دولت
Industrial Monopoly	صنعتی اجارہ

ط

Conversion	طریق تبدیل
Demand	طلب
Indirect Demand	طلب بالواسطہ
Direct Demand	طلب بلاواسطہ
Composite Demand	طلب مرکب
Joint Demand	طلب مشترک

ع

Factors of Production	عاملین پیدائش
Social Sciences	علوم عمرانی
Sociology	عمرانیات
Demand Bill	عند الطلب ہنڈی

غ

Inelastic Demand	غیر تغیر پذیر طلب

غیر نقد پذیر زر کاغذی	Inconvertible Paper Money

ف

فواید خالص	Net Advantages

ق

قانون استقرار حاصل	Law of Constant Returns
قانون بدل	Law of Substitution
قانون تقلیل افادہ	Law of Diminishing Utility
قانون تقلیل حاصل	Law of Diminishing Returns
قانون تکثیر حاصل	Law of Increasing Returns
قانون طلب بالواسطہ	Law of Derived Demands
قانون گریشیم	Gresham's Law
قانون مساوات افادہ مختتم	Law of Equi-Marginal Utility
قدر	Value
قدرتی اجارہ	Natural Monopoly
قدر ذاتی	Intrinsic Value
قدر فلزی	Metallic Value
قدر قانونی	Legal Value
قوت خرید	Purchasing Power
قومی دولت	National Wealth

Price	قیمت
Monopoly Price	قیمت اجارہ
Supply Price	قیمت رسد
Demand Price	قیمت طلب
Equilibrium Price	قیمت متوازنہ

ک

Efficiency	کارکردگی
Intensive Cultivation	کاشت عمیق
Extensive Cultivation	کاشت وسیع
Customs	کروڑگیری (محصول درآمد برآمد)
Expansion of Demand	کشایش طلب

ل

Rent	لگان
Monopoly Rent	لگان اجارہ
Scarcity Rent	لگان قلت
Conditions of Efficiency	لوازم کارکردگی

م

Monopoly Revenue	ماحصل اجارہ
Land Revenue	مالگزاری

مالیات	Public Finance
مبادلۂ دولت	Exchange of Wealth
شبہ لگان	Quasi-Rent
محنت	Labour
محدود زر قانون	Limited Legal Tender
محدود تسلیک	Restricted Coinage
محصول بحساب پیمانہ	Specific Duty
محصول بہ حساب قیمت	Ad-Valorem Duty
محصول بالواسطہ	Indirect Tax
محصول بلاواسطہ	Direct Tax
محصول تدریجی	Graduated Tax
محصول متزاید	Progressive Tax
محصول متناسب	Proportional Tax
مزدور	Labourer
مزدور مختتم	Marginal Labourer
مصارف پیدائش	Cost of Production
مصارف تضمینی	Supplementary Costs
مصارف مقدم	Prime Costs
مطالبات تنظیم	Management Charges

Risk Charges	طالبات خطر
Depreciation Charges	طالبات فرسودگی
Economies	شیات
Economic Rent	حاشی لگان
Normal Price	ولی قیمت
Standard of Value	یارِ قدر
Competition	مابلہ
Profits	مافع
Net Profits	منافعہ خالص
Gross Profits	منافعہ خام
Occupancy Tenant	شتکار
Long Bill	ہنڈی
Fixed Deposit	دی امانت

ن

Theory of Price	قیمت
Convertible Paper Money	پذیر زر کاغذی
Mobility of Labour	پذیری محنت
Bill of Exchange	ا
To accept a Bill	ی سکارنا

Drawer of a Bill	ہنڈی لکھنے والا
Drawee of a Bill	ہنڈی لینے والا

ی

Homogeneity	یک جنسی